کہے فقیر ... سلسلہ

فقیر نگری

دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو



سرفراز اے شاہ

FREE DVD INSIDE

کہے فقیر ... سلسلہ

فقیر نگری

دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو

سرفراز اے شاہ

www.jbdpress.com

ناشر: نواز نیاز

قانونی مشیر: چودھری غلام سرور چٹھہ، چوہدری ریاض اختر

ایڈیشن: اوّل

قیمت: -/625 روپے DVD کے ساتھ

For suggestions and complaints please contact
info@jbdpress.com
www.qalander.org

جہانگیر بکس

121-ڈی بلاک گلبرگ II، لاہور۔ فون: 042-35760323

پرنٹرز: ابو بکر رؤف پریس مولا بخش چوک لاہور

ڈسٹری بیوشن

لاہور: اردو بازار، فون: 042-37220879

لاہور: جہانگیر سنز، جوہر ٹاؤن، فون: 042-35290892-3

لاہور: جہانگیر سنز، گلبرگ، فون: 042-35771000

راولپنڈی: کتاب گھر، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، فون: 051-5539609

فیصل آباد: کوتوالی روڈ، امین پور بازار، فون: 041-2627568

ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ، فون: 061-4781781

کراچی: اردو بازار، فون: 021-32765086

حیدر آباد: مکان نمبر 8/194 نزد ریلوے سٹیشن، سٹیشن روڈ، فون: 022-2780128

صادق ملک: 212- جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ فون: 0321-4443533

اِنتساب

اپنی بیٹیوں روبینہ، ارم اور سمیعہ کے نام

کہ بیٹیاں واقعی اللہ کی رحمت ہیں۔

پیش لفظ

خواتین و حضرات! کہے فقیر سلسلہ کی تیسری کتاب ''فقیر نگری'' پیش خدمت ہے۔ یہ کتاب بھی پہلی دو کتب ''کہے فقیر'' اور ''فقیر رنگ'' کی طرح ان نشستوں میں ہونے والی گفتگو کی تحریری شکل ہے جو ہر اتوار 212۔ جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن میں ہوتی ہیں۔

یقین، توکل، عشق الٰہی اور عشق خدا سے پیار فقیر کا اصل اثاثہ ہیں..... فقیر ان کو کیسے حاصل کرتا ہے..... یہ کتاب کچھ ایسی ہی گفتگو پر مبنی ہے۔ رب تعالیٰ ہم سب کو یہ دولت عطا فرما دے۔ (آمین)

آخر میں جناب اعزاز احمد آذر صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے اس کتاب کا نام تجویز کیا۔

سرفراز اے شاہ

فہرست

نشست نمبر 1

رہنا ہے ہر حال میں راضی

نشست نمبر 2

مقامِ بندگی و شکرگزاری

نشست نمبر 3

نماز اور میڈیکل سائنس

نشست نمبر 4

معرفتِ حقیقت

نشست نمبر 5

فقر کے آداب اور اسم اعظم

نشست نمبر 6

تصوف کے بنیادی پروٹوکولز

نشست نمبر 7

راہِ سلوک میں گائیڈ کی اہمیت

نشست نمبر 8

باادب ــــ بانصیب

نشست نمبر 9

تسمیہ

نشست نمبر 12

راہِ عمل اور سودی معاملات

نشست نمبر 13

ولی اللہ کون!

نشست نمبر 14

دنیا اور روحانیت

نشست نمبر 15

وظیفہ تسمیہ کی مزید وضاحت

نشست نمبر 16

عالم روح

نشست نمبر 17

راہِ فقیر

نشست نمبر 18

تقویٰ کی پانچ گھاٹیاں

نشست نمبر 19

رُوحانیت میں مشاہدہ

نشست نمبر 20

بھید بھری باتیں

(کشف القبور، کشف شخصی اور اس راہ کی مشقتیں)

نشست نمبر 21

وظائف کی بنیادی شرائط

نشست نمبر 22

اللہ کا پسندیدہ معیار

نشست نمبر 23

نکتہ ہائے...

نشست نمبر 24

انعام یافتہ بندے

نشست نمبر 25

رُوحانیت میں گواہی کی اہمیت

نشست نمبر 26

احسان اور شکر

نشست نمبر 27

علم لدنی

نشست نمبر 28

باتیں علم کی!

نشست نمبر 29

صراطِ مستقیم

نشست نمبر 30

رُوحانیت اور علم الاعداد

نشست نمبر 31

جدوجہد سے ڈھاتک

نشست نمبر 32

رویوں کی اہمیت

نشست نمبر 33

اسلامی احکامات کا حسن

نشست نمبر 34

رحمتوں اور نعمتوں سے مستفیض ہونے کا فارمولا

نشست نمبر 35

سچی خوشی کا راز

نشست نمبر 36

یہ تیرے پُراسرار بندے

نشست نمبر 37

موہے اپنے رنگ میں رنگ ڈالا

نشست نمبر 1

رہنا ہے ہر حال میں راضی

سوال: عیدالاضحیٰ کے موقع پر کتنے جانوروں کی قربانی کرنا سنت ہے؟ کیا دوسروں کی طرف سے قربانی کی جا سکتی ہے؟

جواب: حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو مینڈھے کی قربانی فرماتے تھے اور میں بھی دو مینڈھے کی قربانی کرتا ہوں۔ (صحیح بخاری، حدیث 5233، باب فی اضحیۃ النبی ﷺ)

دوسروں کے لیے قربانی کرنے کے حوالے سے ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسے دنبے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جس کے پاؤں، پیٹ اور آنکھوں کے آس پاس کا حصہ سیاہ تھا۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اے عائشہؓ! چھری لے کر آؤ۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اسے پتھر کے ذریعے تیز کرو۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے وہ چھری لی، وہ دنبہ لیا، اُسے لٹایا اور ذبح کر دیا۔ آپ ﷺ نے یہ کہا:

"اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتے ہوئے (میں ذبح کرتا ہوں)۔ اے اللہ! تو محمد ﷺ، آل محمد ﷺ اور امت محمد ﷺ کی طرف سے اسے قبول کرلے۔" پھر نبی اکرم ﷺ نے اس کی قربانی کی۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر 1967، باب استحباب الضحیۃ و ذبحھا مباشرۃ)

ہم میں سے وہ لوگ جو صاحب استطاعت ہیں اگر وہ پسند کریں تو اس سنت پر عمل کرلیں۔ اگر سنت سمجھ کر یہ کام کیا تو اس کا دوہرا ثواب ملے گا۔ قربانی کا ثواب تو ہے ہی ۔۔۔۔ ساتھ سنت کی ادائیگی کا ثواب بھی شامل ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں ہمارے ایسے بہن بھائی جو دنیا میں موجود نہیں یا پھر موجود ہوتے ہوئے بھی اپنی تہی دامنی کے باعث قربانی کرنے کی Position میں نہیں۔ جب ہم ان کی جانب سے اللہ کی راہ میں قربانی کریں گے تو اللہ کو ہمارا یہ عمل بہت پسند آئے گا۔

سوال: کیا عید میلاد النبی ﷺ منانا بدعت ہے؟

جواب: یہی سوال لندن کی ایک جامع مسجد میں مجھ سے کیا گیا تھا۔ وہاں بھی میں نے یہی گزارش کی تھی کہ ہم

لوگ اپنے والدین، اپنے بچوں یا اپنے بہن بھائیوں کی پیدائش کی خوشی میں سالگرہ مناتے ہیں البتہ سالگرہ منانے کا طریقہ سب کا مختلف ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ اظہار تشکر کے طور پر غربا میں کھانا تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ یتیموں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ کچھ لوگ گھر پر معروف طریقے سے سالگرہ مناتے ہیں، کیک کاٹتے اور تحفے تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص آپ ﷺ سے عقیدت رکھتا ہے یا آپ ﷺ سے محبت کرتا ہے اور آپ ﷺ کی پیدائش کی خوشی منانا چاہتا ہے تو میرے علم کی حد تک یہ خوشی منانے میں کوئی حرج نہیں البتہ یہ خوشی مناتے ہوئے یہ احتیاط ضرور کر لی جائے کہ کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اسلام یا مسلمانوں کا وقار مجروح ہوتا ہو کیوں کہ آپ ﷺ کو یہ بات قطعی ناپسند تھی کہ انسان بے وقار ہو جائے۔ رب تعالیٰ بھی اسے ناپسند کرتا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ بھی حکم ہے کہ راستے میں نہ رکو تا کہ دوسروں کا راستہ نہ رکے..... لہٰذا جشن ولادت اس انداز میں منایئے کہ دوسروں کا راستہ نہ رکنے پائے۔ چونکہ آپ ﷺ نے دھوم دھڑکا پسند نہیں فرمایا اس لیے اس موقع پر ڈھول بجانے اور گانے باجے وغیرہ جیسی چیزوں سے بھی اجتناب کیا جائے۔

اگر آپ ﷺ کی تشریف آوری کی خوشی میں مساکین اور یتامیٰ کو کھانا کھلا دیا جائے، غربا، یتیموں اور مستحق لوگوں میں کپڑے تقسیم کر دیے جائیں تو میرے خیال میں یہ ایک پسندیدہ عمل ہوگا ـــــ لیکن اگر کوئی شخص یہ دن نہیں منانا چاہتا تو یہ اس کی اپنی عقیدت اور محبت کا معاملہ ہے۔

سوال: آپ ﷺ نے تاکید فرمائی تھی کہ میری قبر پر میلہ نہ لگانا۔ اس Reference کی روشنی میں کیا عرس منانا جائز ہے؟

جواب: اصل میں میلے سے مراد یہ تھی کہ میری قبر پر ہر وقت اجتماع نہ رہے اور بلاوجہ کی تفریحات اور Celebrations نہ ہونے پائیں۔ ایسی لغو باتوں سے منع فرمایا گیا ہے اور قبور کو سجدہ گاہ بنانے سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ عرس منانے کے پیچھے اصل روح کچھ اور ہے۔ عرس منانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایک بزرگ، عالم یا ولی اللہ جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ان کی تعلیمات اور درس و تدریس کا جو سلسلہ ان کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے ساتھ ہی منقطع ہو گیا وہ کسی طور بحال رہے۔ چونکہ پرانے زمانے میں کتابیں لکھنا محال تھا، CDs، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کے ذریعے ان کی تعلیمات پھیلانا بھی دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کا آسان طریقہ یہ نکالا کہ رخصت ہو جانے والے ولی اللہ کے شاگرد اور عقیدت مند ہر سال ان کے مزار پر اکٹھے ہو جاتے جس کے دو فائدے ہوتے:

- سب لوگ مل کر قرآن خوانی کرتے اور اس کا ثواب ان بزرگ یا ولی اللہ کی روح کو پہنچا دیتے۔
- لوگ آپس کی گفتگو میں ان بزرگ یا ولی اللہ کی باتیں، تعلیمات، اقوال اور یادیں دہرانے لگتے۔ ان بزرگ کے حوالے سے اپنے مشاہدے اور تجربات بیان کرتے۔ یوں ان کی تعلیمات پھیلنے کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک جاری رہتا۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں اور طور طریقے بدلتے رہتے

ہیں۔ عرس کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ وہ عرس جو کسی بزرگ کی تعلیمات کو دہرانے اور پھیلانے کے لیے منایا جاتا تھا رفتہ رفتہ میلوں ٹھیلوں اور تفریحات تک محدود ہو گیا۔

اگر تو عرس منانے کا مقصد کسی بزرگ یا ولی اللہ کی روح کو قرآن خوانی کے ذریعے ایصال ثواب کرنا اور ان کی تعلیمات کو تازہ کرنا ہے تو پھر عرس منانا درست ہے لیکن عرس کو تفریح یا میلہ کی شکل دے دینا قابل ستائش نہیں بلکہ بدعت کی ایک شکل ہے۔

سوال: نفلی عبادات باجماعت ادا کی جائیں یا تنہائی میں؟

جواب: نفلی عبادات حتی المقدور چھپا کر کی جانی چاہئیں۔ بہتر ہے کہ لوگوں پر ان کا اظہار نہ ہونے پائے اور یہ تنہائی میں کی جائیں۔ البتہ فرض نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے۔

نفلی نماز یا عبادت کو اس قدر پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جائے کہ کسی کے علم میں بھی نہ آنے پائے کہ آپ نے کبھی نماز بھی پڑھی ہو گی۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ریاکاری سے بچ جاتا ہے۔

اکثر لوگ اس سوال کے جواب کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ذکر سری ہونا چاہیے یا جہری؟ اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ذکر ہمیشہ انسان کو تنہائی میں بیٹھ کر کرنا چاہیے۔ تنہائی میں بیٹھ کر خواہ آپ سری ذکر کریں یا جہری۔ آہستہ آواز میں کریں یا بلند آواز میں۔ اکیلے کمرہ میں مدھم یا بلند آواز سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ جس رب کی آپ عبادت کر رہے ہیں اور جس رب کا ذکر ہو رہا ہے، وہ رب آپ کی آہستہ آواز کو بھی سنے گا اور بلند آواز کو بھی ...... میرے خیال میں اگر اتنی آواز میں ذکر کر لیا جائے کہ آواز کمرے سے باہر نہ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ذکر خفی (سری) ہو یا جہری ...... رب تعالیٰ یقیناً آپ کی آواز کو سنے گا اور آپ کی عبادات، دعاؤں اور ذکر اذکار کو قبول فرمائے گا۔

نفلی عبادات، ذکر اذکار اور وظائف سب تنہائی میں کرنے کی کوشش کیا کیجئے حتیٰ کہ آپ کے اہل خانہ کی نظر سے بھی آپ کی عبادات مخفی رہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ آپ اپنی عبادات کو جس قدر چھپائے رکھنے میں کامیاب ہوں گے اسی قدر روحانی ترقی تیز ہو گی اور جتنی آپ کی عبادت لوگوں کی نظر میں آئے گی اتنی ہی روحانی ترقی رکتی چلی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لوگوں کی نظر لگ جائے گی کیوں کہ میں ان چیزوں پر کچھ زیادہ یقین نہیں رکھتا ...... میرے نزدیک تو بس رب ہی رب ہے۔ وہ مالک ہے۔ سب سے بڑھ کر طاقت ور ہے۔ تو اتنے طاقت ور رب کا بندہ اتنا کمزور کیسے ہو سکتا ہے کہ جادو، تعویذ اور نظر جیسی چیزیں اس کا کچھ بگاڑ سکیں۔ میں تو ان سب چیزوں کو ماننے والا نہیں کیوں کہ مجھے تو اپنے رب پر بے پناہ ناز ہے۔ وہ سب سے زیادہ طاقت و قوت والا ہے۔ قادر مطلق ہے۔ اس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا تو پھر ایسے قادر مطلق رب کے بندے کو کسی چیز کی کیا فکر ......؟

اس لیے نفل میں عبادت میں نظر کی فکر نہیں ہے۔ فکر یہ ہے کہ آپ کی عبادات کو دیکھ کر لوگ آپ کو عبادت گزار سمجھ کر سلام کریں گے۔ رفتہ رفتہ آپ کو پیر بنا لیں گے۔ آپ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ اس سے نفس

پھلنے پھولنے لگتا ہے۔ انسان کے اندر تکبر اور غرور کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ آپ اپنی عبادات کو مخفی رکھیں۔

جب آپ حج کرتے ہیں تو اپنے نام کے ساتھ حاجی کیوں لگاتے ہیں "حاجی لگانا ضروری ہے کیا؟" آپ نے حج کر کے ایک فرض عبادت سرانجام دی ہے اور حاجی کہلانے لگے۔ آپ نے زکوٰۃ ادا کر دی تو پھر اپنے نام کے ساتھ زکوتی لکھیں اور اسی طرح آپ نماز پڑھتے ہیں تو اپنے نام کے ساتھ نمازی بھی لگا لیجئے۔ اگر رب تعالیٰ نے روزہ رکھنے کی توفیق آپ کو دی ہے تو "روزہ دار" بھی Permanently اپنے نام کا حصہ بنا لیجئے۔

یہ سب بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک فرض عبادت حج ادا کرنے کے بعد اس کا ڈھنڈورا اپنے نام کے ساتھ حاجی لگا کر کیوں پیٹتے ہیں۔ فرض عبادت کو پورا کر لینا تو کوئی کمال ہے ہی نہیں...... ایک فرض ہی تو پورا کیا ہے، کون سا کوئی کمال کیا ہے "ذمہ داری سے سرخرو ہونے کو باعث فخر نہیں بنانا چاہیے۔

اگر آپ اپنی عبادات کو ظاہر کرنے لگ گئے تو لوگ آپ کو اچھا کہہ کر یہ بات سوچنے پر مجبور کر دیں گے کہ میں ایک نیک انسان ہوں۔ جہاں یہ خیال دل میں آیا وہی انسان تباہی کی طرف چلا گیا۔

جناب قبلہ مرشد صاحب ایک بار میرے ساتھ پشاور گئے۔ رات ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ اگلی صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں مرشد صاحب کے کمرے میں گیا یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کی رات Comfortable گزری یا نہیں...... دوران گفتگو وہ بتانے لگے کہ میں پشاور ایک طویل عرصے کے بعد آیا ہوں اس لیے رات ملاقاتیں بہت آ گئیں۔ پھر انھوں نے ایک دم سے بات کا رُخ موڑ دیا اور فرمانے لگے...... "میں تمھیں یہ کہنا چاہوں گا کہ زندگی بھر اپنا ظاہر اس طرح کا بنائے رکھنا کہ کسی کو تمہارے باطن کی خبر نہ ملے۔"

ان کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ میں اس طرح کا دنیادار نظر آؤں کہ کسی کو شبہ تک نہ ہونے پائے کہ میں عبادت بھی کرتا ہوں۔ آج میری آپ سے بھی یہی گزارش ہے کہ کوشش کریں کہ آپ کی عبادت، پارسائی اور نیکی کا ہلکا سا اشارہ (Clue) بھی آپ کے ظاہر سے نہ ملنے پائے۔

سوال: جب ہم کسی کے ساتھ نیکی کرتے ہیں یا کسی کی مالی مدد کرتے ہیں تو وہ حسن ظن اور شکریہ کے طور پر ہمارے اچھے عمل کی تشہیر کرتا ہے۔ ہم اسے کیسے کنٹرول کر سکتے ہیں؟

جواب: دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب Balance قائم کیا ہے۔ ایک طرف تو حکم یہ ہے کہ اگر آپ کسی کے ساتھ کوئی نیکی یا احسان کا سلوک کرتے ہیں تو اس کو اس طرح چھپا کر کیجئے کہ وہ کسی اور کے علم میں نہ آنے پائے۔ دوسری طرف اس نے یہ حکم دیا کہ جس کے ساتھ نیکی یا احسان کا سلوک کیا جائے اسے چاہیے کہ وہ اس کے رویے اور احسان کی تعریف کرے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے طور پر دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک اس انداز میں کریں کہ خود آپ کی ذات کو بھی پتا نہ چلے کہ آپ نے کسی کے ساتھ نیکی کی ہے۔ آپ کو خود بھی آپ کی نیکی کا ادراک نہ ہو کیونکہ اگر دل میں بار بار اس نیکی کا خیال آتا رہا تو

یہ خوشی آپ کو تکبر تک لے جائے گی ـــــ اس لیے میں گزارش کیا کرتا ہوں کہ اپنی عبادات اور نیکی خود سے بھی چھپا کر کیجیے۔

باقی یہ رب تعالیٰ پر ہے کہ اگر وہ آپ کے احسان اور نیک کام کو دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہے اور اس نیکی کی خوشبو لوگوں تک پھیلانا چاہتا ہے تو کسی نہ کسی سبب ایسا ہو جائے گا۔ یہ سراسر رب تعالیٰ کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ بس آپ اپنے طور پر حتی الوسع کوشش کیجیے کہ جب بھی کسی کے ساتھ احسان یا بھلائی کا سلوک کریں تو لازم ہے کہ اسے آپ خود سے بھی پوشیدہ رکھیں ـــــ دوسرا کیا کر رہا ہے۔ ہماری نیکی کو چھپا یا بتا رہا ہے ـــــ یہ اس کا اپنا Problem ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔

سوال: ذکر سری اور جہری سے کیا مراد ہے؟

جواب: جو ذکر آپ خاموشی سے دل میں کرتے ہیں وہ ذکر سری کہلاتا ہے اور جو ذکر بلند آواز میں کیا جائے کہ دوسروں کو آواز سنائی دے وہ ذکر جہری ہے۔ جیسے تین نمازوں فجر، مغرب اور عشاء میں تلاوت جہری ہے۔ ظہر اور عصر میں تلاوت سری ہے۔ تین نمازوں میں امام صاحب آواز بلند تلاوت کرتے ہیں جب کہ ظہر اور عصر میں دل میں تلاوت کرتے ہیں۔

سوال: آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ آپ چاہے جتنی بھی عبادت کر لیں اگر زندگی کو خاص ڈھب پر نہیں گزاریں گے تو رب کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ رب کا قرب حاصل کرنے کے لیے مخصوص طرزِ زندگی اپنانا اور مرشد کی ہدایات کے مطابق ذکر اور عبادات کرنا ضروری ہے؟

جواب: ایک خاص ڈھب سے زندگی گزارنے سے میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ آپ سبز چوغہ پہن لیں۔ گلے میں مالا ڈال لیں اور ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں ڈنڈا پکڑ لیں۔

خاص ڈھب کی زندگی سے میری مراد یہ تھی کہ آپ دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلیں۔ دنیاوی فرائض لازمی پورے کریں کیوں کہ ان فرائض کے حوالے سے کل آپ رب تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ ان کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔ ان فرائض میں آپ کی فیملی کی ذمہ داری بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کفالت آپ کے ذمہ لگائی ہے۔ آپ اپنے وسائل میں رہتے ہوئے حتی الوسع بہترین زندگی ان کو مہیا کیجیے۔ یہ ان کا حق ہے اور آپ کی ذمہ داری ـــــ اسی طرح آپ کے والدین آپ کی ذمہ داری ہیں۔ ان کی دیکھ بھال، دل جوئی اور خدمت کرنا آپ کا فرض ہے۔ آپ کے عزیز رشتہ دار، بیوی بچے سب کا آپ پر حق ہے۔

یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم روحانیت حاصل کرتے کرتے خود پر عائد فرائض نہ بھولنے لگیں۔ کہیں ہم سے ان کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے ـــــ یا دین کی خدمت کرتے کرتے ہم اپنے فرائض سے غافل ہی نہ ہو جائیں۔ یاد رکھیے! ہمیں اپنے فرائض ہر صورت ادا کرتے ہیں کیوں کہ ہمیں ان کے حوالے سے اللہ کے

سامنے جواب دو ہوتا ہے اس لیے پہلے فرض عبادات پوری کر لیجیے پھر نفلی عبادات کی طرف راغب ہوں۔

فرض اور نفلی عبادات کے بعد ہماری Social life کی Stage ہے یعنی ہماری نجی زندگی کے بعد ہماری معاشرتی زندگی کے معاملات ہیں جن کے سلسلے میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کسی کا حق نہ ماریں۔ ہمارے ہاتھوں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ ہم یہ Ensure کر لیں کہ ہم اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ جب ہم یہ کر چکیں تو اس سے اگلی Stage یہ آتی ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ ایثار کا سلوک شروع کر دیں۔ اپنی ضروریات کو روک کر دوسروں کی ضروریات پوری کریں۔ ..... اپنی ضروریات سے مراد یہ نہیں کہ ہم اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کو روک دیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے آرام کو ختم کر لیں، اپنی ضروریات، اپنی تفریح اور دوسروں پر اپنے حقوق ختم کر دیں۔ اگر ہم عادتاً ایسا کرنے لگیں گے تو رفتہ رفتہ یہ رویہ ہماری فطرت ثانیہ بن جائے گا۔ پھر ہم احسان کے درجے پر چلے جائیں گے۔ ہم لوگوں کے ساتھ احسان کرنے لگیں گے۔

آپ اپنی ڈکشنری سے بدلہ اور انتقام جیسے الفاظ نکال دیجیے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ کتنا ہی برا سلوک کیوں نہ کر رہا ہو ... اسے دل سے، بغیر اس کے کہے، معاف کر دیجیے۔ اللہ کے بہت قریب ہو جائیں گے۔ آپ گلے شکوے سے زبان بند کر لیجیے۔ زبان سے کہنا تو کجا، کسی شخص کے بارے میں دل میں بھی کوئی گلہ شکوہ نہ آنے پائے۔ دل کو ہمیشہ آئینے کی طرح صاف رکھیے۔ اس میں کوئی میل نہ رہے۔ یقین کیجیے اس طرح آپ اللہ کے بہت قریب ہو جائیں گے۔ آپ جب بھی زبان سے کسی کے لیے بات نکالیں، ہمیشہ اچھی بات ہی نکالیں، وہ تعریف ہی ہو۔ اس کی برائیاں بیان نہ کریں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر اگر اس طرح عمل کر لیں کہ وہ آپ کی فطرت ثانیہ بن جائے تو پھر یہ دنیا بھی آپ کی اور آخرت بھی آپ کی ہے۔

انشاءاللہ آپ کی زندگی میں کبھی کوئی Failure نہیں آئے گا۔ یہ کوئی زیادہ دشوار کام بھی نہیں ہے۔ آپ اس پر بڑی آسانی سے عمل پیرا ہو کر رب کی قربت حاصل کر سکتے ہیں۔

سوال: اگر کوئی شخص مجھے گالی دیتا ہے تو میں نفس کے ضبط تو کر لیتا ہوں لیکن دل سے میل نہیں جاتا۔ اسی طرح معاف کرنے کے باوجود دوسروں کے برے سلوک کا احساس اور دکھ دل سے نہیں جاتا۔ ایسے میں کیا کیا جائے؟

جواب: چونکہ یہ انسانی فطرت ہے اس لیے دل میں تو یقیناً وہ بات رہے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر عمل کرتے رہنے سے دکھ کا یہ احساس بھی دل سے ختم ہو جاتا ہے ... جونہی دل میں یہ خیال آیا کہ ٹھیک ہے میں نے اسے معاف کر دیا لیکن اس نے آخر مجھے گالی کیوں دی تھی۔ دوسرے ہی پل وہ شخص اپنے آپ کو سمجھاتا ہے کہ جب میں اسے معاف کر ہی چکا ہوں تو اس کے برے سلوک یا رویے کو یاد رکھنا مناسب نہیں۔

یاد رکھیے! جب تک دوسروں کا تلخ رویہ یا برا سلوک آپ فراموش نہیں کریں گے کافی کوشش کر کے برداشت کرنے یا دوسروں کے برے رویے اور سلوک کو معاف کرنے کی جو نیکی آپ نے کمائی تھی، وہ ضائع ہو جائے گی۔

جب بھی دل میں میل یا دکھ کا احساس ٹھہرنے لگے اپنے آپ کو بار بار سمجھائیں اور یاد دلائیں کہ جب میں نے اُسے معاف کر دیا ہے تو اُس کا برا سلوک مجھے یاد نہیں رکھنا چاہیے۔ اس Practice کے بعد ایک وقت آتا ہے جب دل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔

سوال: بعض اوقات ہماری کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ ہماری خواہش اور محنت کے برعکس نکلتا ہے۔ تب سمجھ آتی ہے کہ اس راہ میں آنے والی مشکلات دراصل ہمیں Indicate کر رہی تھیں کہ یہ کام ہمارے لیے درست نہیں...... ہم اپنی زندگی کے سفر میں ان Signals اور Indications کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟

جواب: کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ہم اُن لوگوں سے مشورہ کر لیں جو ہم سے زیادہ تجربہ کار اور ہم سے زیادہ باشعور اور اہلِ علم ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو عقل اور ذہنی قوتیں عطا فرمائی ہیں، ان کو بروئے کار لاتے ہوئے ہم معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیں اور اس کے بعد کوئی ایک فیصلہ کر لیں۔ فیصلہ کرنے کے بعد اُس پر جم جائیں اور اللہ کی عطا کردہ ذہنی و جسمانی قوتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کر کے ہم اس معاملے کو نمٹانے کی پوری کوشش کریں۔ محنت اور کوشش کے بعد نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ پروردگار ہماری جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں ہمیں کیا عطا کرتا ہے ــــ یہ اُس کا فیصلہ ہے۔ ہمیں اُس کے ہر فیصلے کو بخوشی قبول کر لینا چاہیے۔ جہاں تک رکاوٹوں کی بات ہے تو وہ ہر معاملے میں کوشش کرتے ہوئے آئیں گی۔ آدمی کوشش کرتا ہی وہاں ہے جہاں رکاوٹیں ہوں۔ ان کو Indications کے طور پر لینا اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جانا میرے خیال میں مناسب نہیں کیوں کہ مشکلات میں سے گزرے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا نہ ہی کوئی ایسا معاملہ ہوتا ہے جس میں آفات یا رکاوٹیں نہ ہوں۔ اگر ہم نے رکاوٹوں کو As a test لے لیا اور کوئی بھی رکاوٹ آ جانے پر کوشش کو ترک کر دیا تو ہم بے عملی کی طرف راغب ہو جائیں گے۔ یہ رویہ درست نہیں۔ کوشش ہم پر فرض ہے۔ Physical effort کے ساتھ ساتھ Intellectual effort اور عقل کا استعمال بھی بہت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اپنے سے بہتر اور تجربہ کار انسان سے مشورہ کرنا بھی بہتر ہے کیوں کہ یہ مومن کی نشانی ہے۔ مومن اپنے دنیاوی معاملات اسی ترکیب سے نمٹاتا ہے۔

مقامِ بندگی و شکر گزاری

تین چار روز قبل ایک واقعہ پڑھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جن لوگوں کو ہم کچھ زیادہ بڑے مقام پر نہیں رکھتے اور عرفِ عام میں نیک نہیں گردانتے، وہ بندگی کے اس اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں جس کا ہمیں کبھی اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ اگرچہ Writer نے وہ واقعہ بندگی اور نیکی کے Angel کے حوالے سے نہیں لکھا تھا لیکن میرا دھیان اسی سمت گیا۔

قصہ یہ تھا کہ محمود غزنوی کے ایک غلام تھے ایاز، جنھیں رب تعالیٰ نے بڑی شہرت اور خاص مقام عطا فرمایا۔ ایک روز وہ محمود غزنوی کے دربار میں بیٹھے تھے کہ وہاں پھل پیش کیا گیا۔ محمود غزنوی نے اس پھل کی ایک قاش اپنے اس وزیر کو دی جو بہت عقل مند اور وفادار گردانا جاتا تھا جب کہ دوسری قاش اپنے غلام ایاز کو دی۔ وہ پھل ذائقے میں ترش اور تلخ تھا۔ وزیر نے وہ پھل کھایا تو خاموشی ہی سے لیکن اس پھل کی ترشی اور ذائقے کی تلخی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے برعکس ایاز نے پھل کی وہ قاش مزے لے لے کر کھائی اور کہا کہ کیا اعلیٰ پھل ہے جو آپ نے مجھے کھانے کو دیا ہے۔ محمود غزنوی نے جب وزیر کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھے تو پوچھا "کیا یہ پھل زیادہ مزے کا نہیں ہے؟"

وزیر نے کہا "حضور! یہ بڑا ہی بدذائقہ اور ترش پھل ہے۔"

بادشاہ حیران ہوا کہ ایاز تو بڑی تعریف کر رہا تھا اور مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ بادشاہ نے ایاز سے دوبارہ پوچھا "تم نے یہ جو پھل کھایا ہے تمھیں اس کا ذائقہ کیسا لگا؟" اس نے جواب دیا "بہت شیریں اور مزے کا ہے۔" بادشاہ نے کہا "بقول وزیر یہ تو بہت بدذائقہ اور ترش ہے جب کہ تم اسے شیریں اور ذائقہ دار کہتے ہو۔" ایاز نے کہا "حضور! بات دراصل یہ ہے کہ یہ بجا ہی کہ پھل ترش اور بدذائقہ ہے لیکن آج تک جتنے پھل آپ نے مجھے کھلائے وہ کیسے کیسے ذائقہ دار تھے۔ دنیا کی کس قدر نعمتیں آپ نے مجھے Enjoy کروائی ہیں، ایسے میں کیا ہوا جو ایک روز مجھے آپ کے ہاتھ سے ترش اور بدذائقہ پھل بھی کھانا پڑ گیا۔"

یہ قصہ پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں فوراً آیا کہ ہم جن لوگوں کو کسی گنتی میں شمار نہیں کرتے اور عبادت گزار نہیں سمجھتے، در حقیقت وہ کس قدر بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم لوگ عموماً عبادات اور نیکی کو ایک ہی سمجھ رہے ہوتے ہیں جب کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ عبادت سے پارسائی تو آتی ہے لیکن رب نہیں ملتا جب کہ نیکی سے رب ملتا ہے۔ عبادت میں انسان صرف اپنا فرض ادا کرتا ہے لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہے وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے بھی تھوڑا آگے چلے جاتے ہیں۔ وہ نفلی عبادات کرتے ہیں لیکن جب انسان نیکی کی راہ پر چلتا ہے تو اس میں ایثار اور قربانی کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ رب تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور رزق سے اپنے عزیز رشتہ داروں، دوست احباب کو Look after کرتا ہے۔ اگرچہ رزق اس کا اپنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اللہ کے دیئے میں سے بھی کسی دوسرے کو دینا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنا آرام ترک کر دیتا ہے اور اپنے آرام کی قربانی کرتا ہے اور لوگوں کے کام آنے کی خاطر اپنا وقت صرف کرتا ہے، یہ سب نیکی ہی تو ہے۔ لیکن بندگی کے اونچے مقام پر بھی ہم میں سے بہت کم لوگ پہنچ پاتے ہیں۔ میرے نزدیک بندگی کا یہ مظاہرہ بہت اعلیٰ درجے کا تھا جو ایاز نے کیا۔ اگرچہ اس نے ایک انسان کے ساتھ وفاداری نبھائی جو بہرحال بادشاہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کے سامنے حقیر ہے۔ اگر ایسی ہی بندگی ہم رب تعالیٰ کے ساتھ نبھا لیں کہ بجائے وہ چیز یاد رکھنے کے جو ہمیں نہیں ملی یا ہم سے چھین لی گئی، ہم صبح سے شام تک عطا ہو جانے والی ہزاروں نعمتوں کو یاد کر لیں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی کیسی سہولتیں عطا فرمائیں، ہمارے کتنے کام کر دیئے، رب تعالیٰ نے کہاں کہاں کون سی ضروریات پوری کر دیں، کیا ہوا جو ایک کام نہ ہوا یا ایک خواہش پوری ہونے سے رہ گئی یا کوئی چیز ہمیں عطا نہ ہوئی یا عطا ہونے والی چیز ہم سے چھین لی گئی۔ جب ہمارے اندر یہ ادراک پیدا ہو جائے گا تو ہم بندگی کے مقام پر تو شاید نہ پہنچ سکیں لیکن شکر گزاری کے مقام تک ضرور آ جائیں گے۔

یہ شکر گزاری کا قصہ بھی بڑا عجیب ہے۔ ہم لوگ زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے لیکن ہماری Tone میں کہیں ایک ہلکی سی آواز چھپی ہوتی ہے کہ دیا کیا ہے جس کا شکر ادا کریں۔ یہ بہت عجیب سا رویہ ہے لیکن اس رویے کے باوجود ہمیں شکر گزاری کا دعویٰ رہتا ہے۔ شکر گزاری کا مقام بہت آگے کا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ صاحب! عزت اور ذلت سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے عزت عطا فرما دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ جسے جتنی زندگی عطا کرنا چاہے، عطا کر دیتا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ کسی انسان کی دنیا میں ضرورت نہیں رہی تو اسے واپس بلا لیتا ہے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اولاد کی نعمت عطا ہو یا نہ ہو، سب اللہ کے اختیار میں ہے۔

اولاد اللہ کا عطیہ ہے لیکن اسی اولاد کو اگر کانٹا یا سوئی بھی چبھ جائے تو انسان کا بس نہیں چلتا کہ اپنی جان دے کر اولاد کو اس تکلیف سے نجات دلا دے۔ خدانخواستہ کسی کا بچہ سرکش اور نافرمان نکل آئے تو اسے دنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ عزت بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دولت بھی، زندگی اور موت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اولاد بھی اللہ ہی کی نعمت اور امانت ہے۔ اگر ہم دل سے ان سب باتوں کو سچ سمجھتے ہیں تو پھر کسی بھی دکھ اور تکلیف پر واویلا کیوں؟

اگر ہم دکھ خاموشی سے سہہ جائیں اور اللہ کے حضور دعا کرتے رہیں "اے اللہ تو ہمارا خالق ہے۔ چونکہ ہم تیری ہی مخلوق ہیں، ہماری فطری کمزوریوں سے تیری ذات کے علاوہ بھلا اور کون واقف ہو سکتا ہے؟ تو جانتا ہے میں بہت کمزور ہوں اور دکھ کو محسوس کرنا بھی تو نے ہی میری فطرت میں رکھا ہے۔ اولاد کے رخصت ہو جانے کا مجھے دکھ تو ہے لیکن تو مجھے اس دکھ کو سہنے کا حوصلہ عطا کر دے تاکہ میں تیری طرف سے آنے والی اس مصیبت کو سہہ جاؤں۔ تیرے بندے کی حیثیت سے اس تکلیف کو برداشت کر جاؤں۔" اس دعا کے بعد دکھ کم ہو جائے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک ہفتے سے زیادہ ماتم لگے گا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک بہت ہی خوبصورت دعا مجھے یاد آ گئی "یا باری تعالیٰ! میرے لیے یہی عزت کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور تو میرا رب ہے۔"

"اس سے بڑھ کر شکر گزاری کیا ہو گی کہ اس سے غرض ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا عطا فرمایا، کون کون سی خواہش پوری کی، کیا کیا رحمتیں اور نعمتیں نازل فرمائیں اور کہاں محروم رکھا۔ اس سب سے غرض ہی نہیں۔ بس اسی کو کافی جان لیا کہ میں تیرے جیسے رب کا بندہ ہوں۔ یہ عزت ہی میرے لیے کافی ہے۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

"یا اللہ! بے شک تو ویسا ہی ہے جیسے میں نے تجھے چاہا، تو مجھے بھی ویسا ہی بنا دے کہ جیسے تو چاہتا ہے۔"

ذرا سوچیے ——— یہ بندگی کی انتہا نہیں تو پھر کیا ہے؟ یہ Total اور Unconditional Surrender ہے کہ تو مجھے ویسا ہی بنا دے کہ جیسے تو چاہتا ہے۔ میرے نزدیک یہ دعا دو حصوں پر مبنی ہے۔ پہلا حصہ شکر گزاری پر اور دوسرا حصہ بندگی پر مبنی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دعا کی روشنی میں جب میں اپنا رویہ دیکھتا ہوں تو مجھے اس پر دکھ ہوتا ہے اور شرم آتی ہے لیکن کوشش کے باوجود میں اپنا رویہ بدل نہیں پایا۔ مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ مجھے آج تک کیا کیا نعمتیں اور رحمتیں عطا ہوئیں، کس کس مشکل اور مصیبت سے کس قدر خوبصورتی سے رب تعالیٰ مجھے نکالتا رہا۔ میں نے کیا کیا گناہ نہیں کیے جن پر نہ صرف رب نے چشم پوشی کی بلکہ میرے ان گناہوں کو معاف بھی فرما دیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی یہ سب عنایات تو یاد نہیں رہتیں البتہ یہ ضرور یاد رہتا ہے کہ کل گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے مجھے دو بار، بہت کا منہ رہا پڑا۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو کر مختلف عاملوں اور پیروں فقیروں کے پاس دوڑا پھرتا ہوں۔

اگرچہ میں اٹھتے بیٹھتے "اللہ تیرا شکر ہے" کہتا رہتا ہوں لیکن میرا عمل میرے الفاظ کے برعکس ہے کیونکہ

میرے عمل سے بھی شکوہ جھلکتا ہے۔

ایک بار میں ایئر کنڈیشنڈ آفس سے اٹھ کر ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھ کر قبلہ مرشد صاحب کے پاس جب آیا تو اُن کے حجرے میں ایک دم سخت گرمی محسوس ہوئی۔ انگریزی کے آتش قدم پر چلتے ہوئے میں نے گفتگو کی ابتدا موسم پر تبصرے کی اور اس دوران بے اختیار میری زبان سے یہ جملہ پھسل گیا ''حضور! آج گرمی بہت ہے۔'' میرے اس جملے پر مرشد صاحب جلال میں آ گئے اور کہنے لگے

''تمھیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم اپنے آقا کے کسی کام پر انگلی اٹھاؤ۔ وہ مالک و آقا ہے۔ اس کا دل چاہے تو وہ گرمی زیادہ کر دے۔ اس کا دل چاہے تو سردی زیادہ کر دے۔''

اہلِ فقر کے ہاں بندگی اور شکر گزاری یہ ہے کہ انسان کی زبان اور عمل دونوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والی ہر چیز پر ''سرِ تسلیم خم'' کا اظہار ہو۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے ایک عقیدت مند ایک بار اُن کے لیے یہ سوچ کر غلام لے آئے کہ کام کاج کی وجہ سے ابراہیم بن ادھمؒ کے عبادت کے معمولات میں حرج ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ اس غلام کو پا کر بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے اس سے پوچھا ''تمھارا نام کیا ہے؟'' غلام نے جواب دیا ''کوئی نام نہیں ہے۔'' اُنھوں نے پوچھا ''کس نام سے پکارا جانا پسند کرو گے؟'' کہنے لگا ''جس نام سے بھی پکاریں وہی میرا پسندیدہ نام ہو گا۔'' پھر پوچھا ''کھانے میں کیا پسند کرتے ہو؟'' بولا ''جو آپ کھلا دیں وہی میرا پسندیدہ کھانا ہے۔'' پوچھا ''رات کو کس وقت سوتے ہو؟'' کہا ''جب آپ اجازت دے دیں۔ وہی میرا سونے کا وقت ہے۔'' اس پر ابراہیم بن ادھمؒ نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو اُس غلام سے کہا ''جاؤ تم آزاد ہو۔'' لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمانے لگے ''اس آدمی کو دیکھو جو اپنے ہی جیسے ایک آدمی کا غلام ہے لیکن اس درجے کی غلامی کر رہا ہے کہ اس کی اپنی کوئی مرضی ہی نہیں ہے اور میں ایک قادرِ مطلق رب اور آقا کا بندہ اور غلام ہونے کے باوجود بھی اس درجے کی غلامی نہ کر پایا۔''

تسلیم و رضا کا یہ پہلو بہت کم کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ ایسی باتوں کو سن کر سر دھننے یا واہ واہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ فائدہ تو تب ہے جب ہم اُنھیں اپنی زندگی میں Implement کر لیں۔

اگر اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے اور میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے غلام کی طرح اپنے رویے میں یہ تبدیلی لے آؤں کہ میرا رب جو کچھ بھی مجھے عطا کر رہا ہے اُسے میں اُسی خوشی قبول کر لوں۔ ماتھے پر بل ڈال کر نہیں بلکہ یہ سمجھ کر قبول کروں کہ یہ میرے آقا کی عطا ہے جو میرے لیے باعثِ عزت و تکریم ہے خواہ وہ مصیبت ہی کیوں نہ ہو۔ میرا آقا مجھے جس حال میں رکھے میں اس کے ہر حکم پر بخوشی سر جھکا دوں اور یہ سوچ لوں کہ میرے رب نے یقیناً اس میں میرے لیے بھلائی رکھی ہو گی۔ کیوں کہ میرا رب اتنا مہربان ہے کہ وہ کبھی

میرے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا — کیوں کہ میرے نزدیک صبر وہ مقام ہے جہاں رحمت اور زحمت کے درمیان فرق ختم ہو جائے۔ جہاں مصیبت آ جانے پر بھی انسان شکر ادا کرتا ہے اور نعمت کے حاصل ہو جانے پر بھی وہ شکر گزار رہتا ہے۔

سوال: صراط مستقیم میں کون سی چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں؟

جواب: انسان کو اس کی راہ سے صرف دو ہی چیزیں ہٹا سکتی ہیں، سزا اور تکلیف کا خوف یا پھر لالچ۔ کسی انسان سے اگر ہم کہیں کہ اس مظلوم کی حمایت نہ کرو ورنہ تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر وہ انسان کمزور ہے تو خوف سے پیچھے ہٹ جائے گا۔ اسی طرح اگر ہم اسے یہ لالچ دیں کہ تم فلاں مظلوم کی حمایت ترک کر دو تو میں تمہیں فلاں چیز دوں گا۔ اس طرح لالچ میں آ کر وہ پیچھے ہٹ جائے گا۔ اسی طرح جو چیزیں یا رویے رب تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں ان سے ہمیں دو ہی باتیں ہٹا سکتی ہیں، ایمان کی کمزوری اور اللہ پر غیر پختہ یا متزلزل یقین۔ ہم جانتے ہیں کہ رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اپنے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے سیدھی راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ اگر ہمارا ایمان پختہ ہو تو کوئی خوف یا ڈر اور دنیاوی ترغیبات ہمیں سیدھی راہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔

جب خانقاہی نظام رائج تھا تو اس دور میں جب کوئی شخص کسی خانقاہ پر جا کر بیٹھتا تھا تو اس کو کردار اور ایمان میں پختگی لانے کے لیے بعض اوقات 30,35 برس لگ جاتے تھے۔ پھر کہیں جا کر اسے خلافت عطا ہوتی تھی۔

خانقاہی سسٹم میں سب سے پہلے سر کے بال اتروا دیے جاتے، استرا پھروا دیا جاتا تھا۔ یہ پہلا جھٹکا ہوتا جس میں انسان کی ظاہری خوب صورتی کو ختم کر دیا جاتا اور وہ لوگوں میں مذاق کا نشانہ بنتا۔ اگلے مقام پر اسے کہا جاتا کہ خانقاہ پر آنے والے لوگوں کے جوتے صاف کر کے سیدھے رکھو۔ ہمارے معاشرہ میں یہ خدمت بہت حقیر گردانی جاتی ہے۔ اس خدمت کے ذریعے اس انسان کا نفس کچلا جاتا تھا۔ یوں اس کی تربیت کا آغاز ہوتا۔ یہ جو لالچ اور بھوک کے ہاتھوں انسان اللہ کی حکم عدولی کرتا ہے اس سے بچاؤ کے لیے یہ بندوبست کیا جاتا کہ اس انسان کی ڈیوٹی لنگر پر لگا دی جاتی کہ یہ سب لوگوں میں تقسیم کر دو۔ سب میں تقسیم کر دینے کے بعد اگر کچھ بچ جائے تو خود کھا لو ورنہ نہیں۔ یہ تربیت مختلف ترغیبات کے سامنے ڈھال بن جاتی اور انسان لالچ سے بچا رہتا تھا۔

سوال: کیا نماز Victory ہے؟

جواب: انگلینڈ کے ایک مسلم ادارے میں سوال و جواب کے Session کے دوران بھی کسی صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا "کیا نماز Victory ہے؟" تب میں نے عرض کیا تھا "یہ Victory تو نہیں ہے مگر نماز سے انسان کی بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے۔" ہم میں سے بہت کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہو گا کہ فجر کی نماز بہت مختصر اور عشاء کی نماز بہت طویل ہے حالانکہ فجر کے وقت انسان زیادہ Ex Fresh ہوتا ہے جب کہ عشاء کے وقت

سارے دن کا تھکا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ ان نمازوں کی تعداد میں بھی وہی مصلحت پوشیدہ ہے۔ فجر کے وقت جب انسان رات بھر کی نیند کے بعد بیدار ہوتا ہے تو وہ Fresh ہوتا ہے۔ اس وقت نماز کی چار رکعتیں انسان کی بیٹری چارج کرتی ہیں جب کہ عشاء کے وقت ایک تھکا ماندہ شخص جب اللہ کے حضور 17 رکعات میں قیام، رکوع و سجود کرتا ہے تو اس سے اس کی تھکن اتر جاتی ہے کیوں کہ نماز کا ہر Posture نہ صرف انسان کو روحانی فائدہ دیتا ہے بلکہ اسے جسمانی طور پر بھی Relax کر دیتا ہے۔

سوال: کیا ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں Victory ہیں؟

جواب: میں ان نمازوں کو Victory نہیں کہتا۔ یہ Victory ہیں ہی نہیں۔ نہ Temporary اور نہ ہی Permanent۔ ان سے تو بس بیٹری چارج ہوتی ہے۔

ہم میں اور دیگر قوموں میں اتنا ہی فرق ہے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی ملازم ایک فی صد بھی اپنی Duty پوری کرے تو ہم کہتے ہیں He is an efficient employee اور ہم اس کی ACR میں لکھتے ہیں Fit for promotion جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں اگر ایک ملازم اپنی سو فی صد ڈیوٹی کر رہا ہے اور سو فی صد Output دے رہا ہے تب بھی اس کی ACR پر محض یہ لکھا جاتا ہے۔

He performs his duty efficiently.

مراد یہ کہ اس نے اپنا فرض بہ احسن طور اس طرح نبھایا ہے جس طرح اسے نبھانا چاہیے تھا۔ اس پر اسے کوئی انعام نہیں ملے گا۔

یعنی اگر ہم نے دُنیاوی مصروفیات سے وقت نکال کر نماز وقت پر ادا کر لی تو وہ Victory نہیں ہو سکتی۔ ہم نے تو محض اپنا فرض نبھایا جو قابلِ تعریف نہیں ہے۔

ہم اکثر اپنی Dealings کے حوالے سے کہتے ہیں کہ صاحب میں بہت انصاف پسند ہوں، بہت انصاف کے ساتھ چلتا ہوں۔ انصاف تو Dealings میں ادنیٰ ترین مقام ہے۔ یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے۔ ہاں اگر میری Dealings ایثار و قربانی پر مبنی ہوں تو پھر اس کی تعریف ہونی چاہیے۔

اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ فرض نماز کی ادائیگی میں Victory کا کوئی عمل دخل نہیں۔ فرض تو بس فرض ہے جس کی ادائیگی لازم ہے۔

سوال: شکر گزاری کیسے حاصل کی جائے اور ناشکر گزاری سے کیسے بچا جائے؟

جواب: ہر وہ چیز جو اچھی ہوتی ہے اور ہر وہ کارنامہ جس کا انعام زیادہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ اگر آپ رب تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو چونکہ یہ ایک بہت بڑی خواہش ہے اس لیے اس میں دشواریاں بھی بڑی بڑی آئیں گی۔

شکر گزاری سے رب تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔ اتنا خوش کہ نعمتیں بڑھا دیتا ہے اور ہم پر اپنے انعامات میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ہم جس جس نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں وہ رب تعالیٰ نعمتیں انسان پر مزید بڑھا دیتا ہے۔

شکر گزاری کے کئی انداز ہیں۔ کچھ لوگ محض زبان سے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ عملی طور پر شکر گزار ہوتے ہیں جو در حقیقت بہت دشوار امر ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم زبان سے تو شکر گزاری کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہماری Body language چیخ چیخ کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ ہم مطمئن نہیں ہیں۔

شکر گزاری کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ ہم دل سے شکر گزار ہوں۔ جس طرح سخاوت کی تعریف یہ ہے کہ سخی وہ ہے جس کو ہمیشہ دوسروں کو دیتے وقت چیزیں کم معلوم ہوں۔ خواہ وہ بہت زیادہ ہی کیوں نہ دے رہا ہو اسے لگے کہ اس نے بہت کم دیا ہے۔ لیکن دوسروں سے لیتے وقت اسے لگے کہ یہ بہت زیادہ ہے۔ معمولی سی چیز بھی اسے بہت زیادہ معلوم ہو۔ اگر کسی نے اسے ایک گھونٹ پانی بھی دیا تو اس پر بھی اس کا دل بہت زیادہ شکر گزار ہو کہ مجھے بہت زیادہ ملا ہے۔ سخی وہی ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو پوری دنیا بھی دے دے تو اسے یہ کم لگے اور لیتے ہوئے ایک معمولی سی چیز (خواہ وہ ایک تنکا ہی کیوں نہ ہو) بھی پہاڑ کے برابر لگے۔

اسی طرح شکر گزاری بھی یہی ہے کہ رب تعالیٰ سے جو چیز بھی انسان کو عطا ہو، وہ اس پر مطمئن ہو جائے۔ دل سے اسے مان لے کہ یہ بہت زیادہ ہے جو اسے مل گیا ہے۔ اس کا حاصل اس کی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ اس طرح دل میں شکر گزاری پیدا ہو جائے گی۔ اگر اس کا عملی پہلو دیکھنا چاہیں تو ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ جب انسان اپنے آپ کو یہ یقین دلا دے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ میرا ذاتی نہیں ہے۔ وہ میرے رب تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے اور میرے حق سے کہیں زیادہ میرے رب نے مجھے عطا کیا ہے۔ اگر میں اس سے کسی دوسرے بندے کی کوئی خدمت کر رہا ہوں تو یہ میں کسی پر احسان نہیں کر رہا۔ کسی کی کوئی Favour نہیں کر رہا بلکہ میں رب تعالیٰ کی عطا کردہ چیز میں سے اس کے بندے کو اس کا حق دے رہا ہوں۔ جو کچھ بھی رب تعالیٰ نے مجھے عطا کیا ہے ان پر میرا صرف اتنا حق ہے کہ اس سے میری اور میرے Dependents کی جائز ضروریات پوری ہو سکیں۔ ان ضروریات کی تکمیل کے بعد جو کچھ بھی بچتا ہے وہ دوسروں کا حق ہے جو ان تک پہنچ جانا چاہیے۔ اگر میں کسی کے لیے کچھ کر رہا ہوں تو اس کو Favour نہیں کر رہا۔

دوسروں کی خدمت کرتے وقت اگر خدمت کرنے والے کی یہ کوشش رہے کہ وہ تمام لوگ جن کو وہ اپنا مخالف سمجھتا ہے ان کی بھی خدمت کرتا ہے تو یہ بہترین شکر گزاری ہو گی۔ (دوسروں کی تو وہ خدمت کر ہی رہا ہے، لیکن اگر ساتھ ساتھ وہ اپنے مخالفین کو بھی بالکل اپنے دوستوں کی طرح Treat کرتا ہے تو یہ بہت بڑی شکر گزاری ہے۔)

جب انسان یہ سوچتا ہے کہ خدمت کر کے وہ کسی کو Favour نہیں دے رہا بلکہ صرف اپنا بوجھ ہلکا کر رہا

ہے۔ جو کچھ بھی اس کے پاس دوسروں کا حق تھا وہ اس نے ان تک پہنچا دیا ہے تب اسے یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ اس نے کسی کی خدمت کی تھی۔ جب اسے یہ یاد نہیں ہوگا کہ وہ کسی کے کام آیا تھا تو اس طرح اس کی نیکی، نیکی ہی رہ جائے گی ریاکاری نہیں ہوگی۔ میرے نزدیک یہ بہترین شکر گزاری ہے۔ اس طرح انسان کبھی تکبر کا بھی شکار نہیں ہوتا۔

جب ہم یہ سوچ لیتے ہیں کہ میری ضروریات سے زائد جو کچھ بھی میرے پاس ہے، وہ دوسروں کا حق ہے اور جو مجھ سے اپنا یہ حق وصول کر کے چلا گیا وہ مجھ پر احسان کر رہا ہے کہ اپنا حق خود آ کر مجھ سے لے گیا۔ یوں اس نے میری مدد کی۔ یہ بہترین شکر گزاری ہے۔ اس سے انسان میں عاجزی آتی ہے اور رب تعالیٰ کی ربوبیت پر یقین بھی پختہ ہونے لگتا ہے جو کہ بذاتِ خود ایک بڑی Achievement ہے۔ یہ بہت دقیق نکتہ ہے کہ رب تعالیٰ کی ربوبیت پر یقین آنے لگے۔ روحانیت کا سارا کھیل اسی ایک نکتے میں پوشیدہ ہے کہ ''وہ میرا رب ہے۔'' علم لدنی، بندگی، فقیری، درویشی سب اسی ایک نکتے کے اندر پوشیدہ ہیں۔ جہاں یہ جملہ یہ سمجھ آ گیا کہ وہ میرا رب ہے اور یہ نکتہ دل میں بیٹھ گیا، اس دن تمام حجاب اٹھ جائیں گے۔ آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جائیں گے۔ رب تعالیٰ کے ساتھ ایک Direct تعلق قائم ہو جائے گا۔

جب رب تعالیٰ کی ربوبیت پر یقین آ جاتا ہے تو انسان کی ہائے ہائے ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کا دستِ سوال دراز نہیں ہوتا۔ غیر اللہ کی محتاجی ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی خواہش نا آسودہ نہیں رہتی۔ اس لیے کہ جب خواہشات ہی مٹ جائیں تو پھر نا آسودگی کہاں رہے گی۔ پھر انسان دوسروں سے متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے کیوں کہ وہ سب سے بڑا اپنے رب تعالیٰ کو سمجھنے لگتا ہے اور باقی سب کو وہ رب تعالیٰ کا بندہ جانتا ہے۔ اس طرح جب وہ کسی سے Impress ہی نہیں ہوگا تو کسی کے دباؤ میں بھی نہیں آئے گا۔ بلکہ حق علی الاعلان کہے گا۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کر پائے گا کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ پالنے والا تو میرا رب تعالیٰ ہے۔ یہ انسان مجھے کیا دے سکتا ہے۔ یہ تو خود میرے رب سے مانگتا ہے۔ خواہ وہ کسی ملک کا صدر یا وزیرِ اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ تمام لوگ میرے رب کے محتاج ہیں اور جو خود محتاج ہیں میں اُن سے کیوں مانگوں۔ میں اس رب تعالیٰ سے کیوں نہ مانگوں جو سب کو عطا کرنے والا ہے۔ یوں انسان ہائے ہائے کرنا چھوڑ دیتا ہے کہ ہائے میرا بچہ نہیں پڑھتا، ہائے میں ٹھیک نہیں ہوتا، ہائے میرے پاس پیسہ نہیں ہے، ہائے میں تین دن کے فاقے سے ہوں۔ تب انسان کے دل میں ایک ہی بات رہتی ہے کہ میرا رب تعالیٰ سنبھالنے والا ہے تو میں کیوں فکرمند ہوں۔ مجھے پالنے والا بیٹھا ہے۔ اُس نے میری ذمہ داری اُٹھائی ہے۔ وہ مجھے پالے گا تو مجھے کس بات کا غم ہے۔ اس طرح انسان تمام اندیشوں، وسوسوں اور خدشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

پھر وہ بھوکے برطانوی (Englandian) کی طرح تین دن کے فاقے کے باوجود، پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سڑک پر سیٹی بجاتا پھرتا ہے۔ ایسے میں آدمی بڑی مستی میں پھرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ انگلینڈین شاید درویش لوگ ہوتے ہیں کیوں کہ عام طور پر یہ لوگ بے چارے روپے پیسے سے میری طرح آزاد ہوتے

ہیں۔ جتنا زیادہ یہ لوگ فاقے سے ہوتے ہیں اُتنا ہی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اوپر کو منہ کر کے سیٹی بجا رہے ہوتے ہیں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر۔

ایک عرصے تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ انگلینڈ میں اوپر کو منہ کر کے سیٹی کیوں بجاتا ہے۔ بعد میں سمجھ آئی کہ شاید یہ رب تعالیٰ سے کہتا ہے "ٹھیک ہے۔ رکھ اسی حال میں۔ فاقے سے مارنا چاہتا ہے تو مار۔ تیرا ہی بندہ ہوں۔ تجھے ہی دُکھ ہوگا۔ مجھے کیا۔"

میں نے انگلینڈ میں سے سیکھا کہ سب سے اچھا کام یہ ہے کہ جس قدر مشکل میں پھنس گیا اُسی قدر سیٹی زیادہ بجانا شروع کر دی۔ ہر نماز کے بعد رب تعالیٰ سے کہیے میں مزے میں ہوں۔ مجھے کیا غم ہے۔ یہ ایک خوب صورت حقیقت ہے کہ پھر رب تعالیٰ واقعی کوئی غم رہنے نہیں دیتا۔

- جس دن یہ نکتہ سمجھ میں آ جائے اُس دن رب تعالیٰ کی ربوبیت پر بھی یقین ہو جاتا ہے اور اپنے نفس پر قابو بھی ہو جاتا ہے۔ اب ایک شخص ہے جس نے آپ کے بیٹے کو قتل کیا ہوا ہے۔ جی یہ چاہتا ہے کہ اس شخص نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے، میرے پاس طاقت بھی ہے اور وسائل بھی، میں اُسے اس بات کا مزا چکھا دوں کہ اس نے کیسے میرے بیٹے کو قتل کیا۔ پھر خیال آتا ہے کہ اولاد تمہاری کب تھی؟ یہ بھی تو رب تعالیٰ کا بندہ ہے۔ اولاد بھی رب تعالیٰ ہی کی امانت تھی۔ مالک تو وہ بیٹھا ہے، وہ جانے اور یہ جانے۔ میرا کام یہ ہے کہ آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اُسے معاف کر دوں اور مشکل میں اُس کی خدمت کرتا جاؤں۔ جب انسان جذبۂ انتقام کو کنٹرول کر لیتا ہے تو وہاں اُسے ربوبیت کی پہچان شروع ہو جاتی ہے لیکن اس میں قربانی بہت ہے اور قربانی رب تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

سوال: اللہ کی نعمتوں کا شکر کس انداز میں کیا جا سکتا ہے؟

جواب: کچھ لوگ اُٹھتے بیٹھتے بآوازِ بلند کہتے ہیں "شکر الحمدللہ"..... لیکن میرے نزدیک اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو خود بھی Enjoy کریں اور دوسروں میں بھی تقسیم کریں بالخصوص اپنے مخالفین کو ان نعمتوں میں حصہ دار بنا لیں۔ اس سے ہمارا سرکش نفس بھی کنٹرول میں رہتا ہے اور ہماری Training بھی ہوتی رہتی ہے۔

اگر ہم ہر لمحہ خود کو سمجھاتے رہیں گے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے یہ میرا نہیں بلکہ رب تعالیٰ کی عطا ہے اور جب میرا کچھ ہے ہی نہیں تو میں اس سے دوسروں کو کیسے محروم کر سکتا ہوں۔ لہٰذا جتنا اس پر میرا حق ہے اتنا ہی میرے دشمنوں کا حق بھی ہے۔ ہمارے اس رویے سے نفس کی سرکشی بہت حد تک ختم ہو جائے گی۔ جب ہم اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو کھلے ہاتھوں تقسیم کریں گے تو نعمتیں بڑھا دی جائیں گی۔ اللہ کو بندے کا یہ عمل بہت پسند ہے کہ اس کی نعمتیں اُن بندوں تک پہنچا دی جائیں جو ان نعمتوں کے حوالے سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں۔

نماز اور میڈیکل سائنس

اسلام کے Divine Religion ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس کی تمام باتوں میں حکمت نظر آتی ہے۔ اس کی بہت سی چیزوں میں میڈیکل سائنس کارفرما دکھائی دیتی ہے جب کہ چودہ سو سال قبل جب اسلام Introduce ہوا تھا تو اس وقت میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اگرچہ تب انسان کا ذہنی ارتقا مکمل ہو چکا تھا لیکن علوم نے ابھی ترقی نہیں کی تھی۔ علم کی وہ وسعت نہیں تھی جو آج ہے۔

آج جب اسلام کی چودہ سو سال پہلے بتائی گئی باتیں سائنسی تحقیق کے ذریعے درست ثابت ہوتی ہیں تو ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو اسلام کو Divine Religion سمجھنے پر تیار نہیں ہیں۔ اگر انسان اس پر ذرا سا غور کرے تو اُسے سمجھ آجائے گی کہ یہ انسان کا متعارف کردہ مذہب ہوتا تو اس میں اتنی Perfection نہیں ہو سکتی تھی۔

وضو کو دیکھیے۔ اس کے مختلف ارکان تھکن کے نتیجے میں یا کام کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہونے والے بلڈ پریشر کو Normalise کرتے ہیں۔ اس میں جب ہم مسح کرنے کے لیے گردن پر انگلیاں پھیرتے ہیں تو ایک مخصوص Direction میں ہاتھوں کی Movement سے Muscles سکون محسوس کرنے لگتے ہیں۔ موجودہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ انسان تھکا ہوا ہو تو صرف تین بار مسح کے انداز میں مساج کرنے سے تھکن دور ہو جاتی ہے اور تھکن کے نتیجے میں جنم لینے والا Blood Pressure بھی Drop ہو جاتا ہے۔

(میں بار بار تھکن کے نتیجے میں پیدا ہونے والے BP پر اس لیے زور دے رہا ہوں کہ بیماری سے پیدا ہونے والے BP کو اگر آپ اس طرح سے Control کرنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ لیکن تھکن سے پیدا ہونے والا BP مسح کرنے سے کم ہو جاتا ہے۔)

اسی طرح انگلیوں کے درمیان دوسرے ہاتھ سے انگلیاں پھیرنے سے تھکن کے نتیجے میں بڑھا ہوا BP کم ہو جاتا ہے اور تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ Likewise اعصاب پر Pressure آتا ہے تو اس سے تھکن

دور ہو جاتی ہے۔

انسان جب صبح سویرے سو کر اٹھتا ہے تو ذہنی و جسمانی لحاظ سے تازہ دم ہوتا ہے لیکن سونے کے نتیجے میں انسانی جسم سستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ نیند کی وجہ سے جانوروں میں بھی سستی آجاتی ہے۔ جانور اس سستی کو ختم کرنے کے لیے انگڑائی لیتے ہیں۔ یوگا میں بھی انگڑائی کی بہت اہمیت ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب آپ سو کر اٹھیں تو جس طرح بلی اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو اکڑا کر انگڑائی لیتی ہے اسی طرح اگر آپ بھی تین بار انگڑائی لیں تو آپ کا جسم Active ہو جائے گا۔ یہ یوگا کی ہدایات ہیں۔

میں بتا رہا تھا کہ نیند کے نتیجے میں سستی غالب آجاتی ہے جس کو دور کرنے کے لیے نماز کام آتی ہے۔ نماز میں بہت تھوڑے سے عرصے کے لیے آپ کا تعلق دنیا سے ختم ہو کر رب تعالیٰ کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نماز اس طرح پڑھیے کہ گویا آپ رب تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں یا پھر رب تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ جب اس قدر یکسوئی سے ہم نماز پڑھتے ہیں تو دنیا سے ہمارا رابطہ کٹ جانے کی وجہ سے جسم کی وہ سستی خود بخود دور ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ اور ہم دنیاوی فرائض سر انجام دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

سائنسی تحقیق سے پتا چلا ہے کہ انسانی جسم اور دماغ دن کے First half میں Efficiency کے Optimum Level پر ہوتے ہیں۔ انسان Lunch سے پہلے تک جتنا کام کرسکتا ہے اتنا کام لنچ کے بعد والے گھنٹوں میں نہیں کرسکتا۔ اس کا Efficiency Level وہ نہیں رہتا جو صبح کی نماز سے لے کر ظہر کے وقت تک تھا۔

فجر اور ظہر کے درمیان وقفہ سب سے لمبا ہے۔ اس وقفے میں انسان کام کرتا رہتا ہے۔ دنیاوی Pressures آتے رہتے ہیں اور انسان رفتہ رفتہ ذہنی دباؤ اور مسائل کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان مسائل اور Pressures کو Handle کرتے کرتے دوپہر تک وہ تھک چکا ہوتا ہے اور اس تھکن کے نتیجے میں اس کی Performance بہت Drop کر جاتی ہے۔ اس کا حل اللہ تعالیٰ نے نماز ظہر کی صورت عطا کیا۔ ظہر کی 12 رکعات ادا کرنے کا ہمیں دوہرا فائدہ ملتا ہے۔ نماز کے دوران جب ہم رکوع اور قعدہ کرتے ہیں تو Medically Speaking اس سے جسم کے اندر Blood Circulation بہتر ہو جاتی ہے۔ حالت قیام میں Blood Circulation کا زور ٹانگوں اور پاؤں کی طرف برابر تقسیم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ہم دو مرتبہ مخصوص دورانیہ کے لیے سجدے میں جاتے ہیں تو اس دوران Blood Circulation سر کی طرف ہوتا ہے۔ سجدے سے اٹھ کر قعدہ میں بیٹھنے سے ہماری تھکن دور ہو جاتی ہے۔

ایک نئی تحقیق کے مطابق یوگا کا سب سے زیادہ Comfortable اور تھکن دور کرنے کا جو آسن ہے وہ التحیات (قعدہ) کی پوزیشن ہے۔ اس سے تھکن فوری طور پر دور ہو جاتی ہے اور انسان Fresh ہو جاتا ہے۔ اس دوران دوران خون Improve کر جاتا ہے۔ یوں نماز کے مختلف Postures کی وجہ سے ہماری جسمانی تھکن دور ہو جاتی ہے اور ظہر کی ان 12 رکعات کی ادائیگی کے دوران جب ہمارا تعلق دنیا سے ختم ہو کر

رب کے ساتھ جڑ جاتا ہے تو ہمیں ذہنی سکون بھی مل جاتا ہے۔ صبح سے عصر تک کے وقفے میں دنیاوی پریشانیوں سے لگنے والے تمام جھٹکے اس خیال کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں کہ ہمارے سر پر ایک All time Powerful ہستی "رب" موجود ہے جس کے ہم بندے ہیں اور جو ہمیں ہر وقت Look after کر رہا ہے۔ یہ خیال ہماری بیٹری چارج کر دیتا ہے اور یوں ہم ایک نئے حوصلے کے ساتھ کام کرنے لگتے ہیں۔ جب دوبارہ تھکنے لگتے ہیں تو عصر کی چار فرض رکعات ادا کرتے ہیں اور اگر چاہیں تو چار غیر موکدہ سنتیں بھی ادا کر لیتے ہیں۔ سب سے کم وقفہ عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان ہے کیوں کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انسان کام کرنے کے لائق نہیں رہتا۔ جسمانی اور ذہنی طور پر وہ بہت زیادہ تھک چکا ہوتا ہے۔ ایسے میں اس کے لیے مغرب کی نماز رکھ دی گئی کہ جب انسان گھر جائے تو وہ پُرسکون اور بہتر حالت میں ہو۔ وہ مغرب کی سات رکعات ادا کر کے جسمانی و ذہنی تھکن اتارتا ہے اور پھر گھر والوں کو Relax ہو کر وقت دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ عشاء کی نماز کی 17 رکعات ادا کرتا ہے۔ چونکہ فجر تک آرام کے لیے ایک لمبا وقفہ ہے۔ اس وقفے میں ایک پُرسکون نیند لینے کے لیے ضروری ہے کہ انسان سونے سے پہلے Maximum Time کے لیے اپنے رب تعالیٰ سے ناتا جوڑے۔ اس سے اس کی بیٹری چارج ہو جائے گی اور وہ ذہنی طور پر بھی یہ سوچ کر Comfortable ہو جائے گا کہ ایک ایسی Superpower ہے جو ہر لمحہ میرے ساتھ ہے۔ ایک ایسی قوت موجود ہے جو میرے تمام مسائل حل کر دے گی اور میں جس مشکل میں پھنسا ہوا ہوں، اس سے مجھے نکال دے گی۔ عشاء کی 17 رکعات کی ادائیگی میں یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ عشاء سے فجر تک کے طویل وقفے میں پُرسکون نیند لینے کے لیے ہم سونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کے حضور گزاریں اور ذہنی و جسمانی تھکن سے چھٹکارا پالیں۔

سوال: شوگر کے مریضوں کو ایکسر سائز کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اگر وہ باقاعدگی سے نماز پڑھیں تو کیا اس ورزش کی کمی پوری ہو جائے گی؟

جواب: اگر شوگر موروثی وجوہات کی بنا پر نہ ہو تو عموماً اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان مطلوبہ معیار کے مطابق اپنے جسم کو Active نہیں رکھتا اس لیے ذیابیطس کا شکار ہو جاتا ہے۔

نماز جسم کو Active رکھتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی یوگا ایکسر سائز سے ہمارا جسم Active رہتا ہے اور جسم کے تمام اعضا کی ورزش ہو جاتی ہے۔ اس سے انسان فشارِ خون (بلڈ پریشر) اور شوگر کے امراض سے بچا رہتا ہے لیکن جو لوگ نماز کی پابندی کرتے ہیں وہ شوگر اور بلڈ پریشر کے علاوہ بھی بہت سی دیگر جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں سے بچے رہتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جن کے معاشی حالات بہت Demanding ہیں۔ نماز کی ادائیگی کے باوجود ان کے کسی نہ کسی حد تک ان امراض میں مبتلا ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔

نماز ایک باقاعدہ ورزش (Regular Exercise) ہے کوئی Muscle یا Organ ایسا نہیں جس کی دوران نماز Exercise نہ ہو رہی ہو۔ لیکن یہاں یہ واضح کر دوں کہ نماز کو نماز سمجھ کر ہی ادا کیجیے نہ کہ

Exercise سمجھ کر کریں گے اس طرح نماز کا اصل مقصد ختم ہو جائے گا۔ نماز کے فوائد کا علم حاصل کرنے کی غرض سے جاننا بہت اچھی بات ہے لیکن صرف فوائد کے حصول کے لیے ادا کی جانے والی نماز سے آپ بہت سی ایسی نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے جو رب تعالیٰ آپ کو عطا کر رہا ہے۔ اس لیے نماز یہی سوچ کر ادا کیجیے کہ میرا رب لائق عبادت ہے اور اس کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

سوال: جس نماز میں خشوع و خضوع نہ ہو کیا ایسی نماز کا کوئی فائدہ ہے؟ بعض علما کا کہنا ہے کہ نماز بغیر خشوع و خضوع بھی ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نماز میں کھڑے ہونے اور رکوع و سجود کرتے ہوئے کسی خشوع و خضوع کی ضرورت نہیں؟

جواب: یہ جو میں نے ابھی گزارش کی کہ نماز جسمانی ورزش ہے اور اس میں دنیا کے تفکرات اور پریشانیوں سے رابطہ ٹوٹ کر رب کے ساتھ رابطہ جڑ جاتا ہے تو اس سے میری مراد خشوع و خضوع ہی تھی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جو لوگ نماز پابندی اور اہتمام سے قائم کرتے ہیں وہ عموماً ذہنی طور پر زیادہ پریشان نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کے اندر آپ کو ایک عجیب سا سکون اور ٹھہراؤ ملے گا۔

اگر خشوع و خضوع کی اہمیت دنیاوی نقطہ نگاہ سے دیکھی جائے تو وہ یہ ہے کہ دوران نماز جب دنیا سے تھوڑی سی دیر کے لیے بھی رابطہ ٹوٹتا ہے تو اس دوران تفکرات اور دنیاوی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور دل میں ایک نئے سرے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارا رب موجود ہے جو ہمارے مسائل حل کر دے گا۔ ہمیں پریشانیوں سے نکال دے گا۔

انسان کی بیٹری چارج ہونے سے میری مراد یہی تھی کہ خشوع و خضوع کے بغیر نماز ادا کی جائے تو تفکرات سے چھٹکارا اور اللہ پر بھروسا پیدا ہونے کی کیفیت کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔

ایسی صورت میں نماز جسمانی ایکسرسائز کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں نماز ہر صورت میں پڑھتے رہنا چاہیے اور اُمید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ خشوع و خضوع بھی پیدا کر دے گا۔

سوال: نماز میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کا کوئی طریقہ بتا دیجیے۔

جواب: دیکھیے ۔۔۔۔ اس میں سو فی صد تو کامیابی نہیں ہو گی لیکن تقریباً 80 فی صد فائدہ ضرور ہو جائے گا۔ جب آپ حالتِ قیام میں ہوں تو دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن کو غور سے دیکھتے رہیں۔ اس سے آپ کی سوچوں کا Flow کم ہو جائے گا اور Concentration (یکسوئی) بڑھ جائے گی۔ یوں خشوع و خضوع حاصل ہو جائے گا۔

سوال: اگر انسان اللہ کے منع کردہ کام نہیں چھوڑتا تو کیا ایسی صورت میں اس کی نماز ہو جائے گی؟

جواب: سیدھی اور سادہ سی بات ہے کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا:

"نماز تو برائیوں سے روکتی ہے۔" (العنکبوت: 45)

ایک بار صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ "یہ کیسے پتا چلے گا کہ ہماری نماز قبول ہو رہی ہے یا نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "جس کی نماز اُسے بے حیائی اور برائی سے نہ روکے وہ اللہ عزوجل سے مزید دور ہوا ہے۔" (المعجم الکبیر، صفحہ 54، حدیث نمبر 11025)

اگر نماز کو محض ایکسرسائز نہیں بلکہ نماز سمجھ کر ادا کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ برائیوں سے نہ روک پائے۔
اگر نماز کو صرف Duty سمجھ کر ادا کیا تو پھر برائیاں بھی ساتھ چلتی رہتی ہیں۔

اگر ہم ہر وقت اس تصور میں رہیں کہ مجھے ابھی نماز میں اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے تو میں اُسے کیا منہ دکھاؤں گا کہ میں نے وہ کام کیا جس سے رب تعالیٰ نے مجھے منع کیا ہوا ہے۔ جب انسان کو یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ مجھے رب کے حضور پیش ہونا ہے تو یہ دھڑکا اور احساس اُسے برائیوں سے دور کر دے گا۔

سوال: ایک فلم میں دکھایا گیا کہ ایک چور چوری کرنے کے لیے کسی کے گھر جاتا ہے۔ اسی اثنا میں نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔ چور نماز پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی دوران گھر والے جاگ جاتے ہیں اور ایک چور کو نماز پڑھتا دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ تب وہ کہتا ہے کہ نماز میرا فرض ہے اور چوری میرا پیشہ۔
کیا ایسا پیشہ جو اللہ کی قائم کردہ حدود سے باہر ہو، وہ اور نماز ایک ساتھ چل سکتے ہیں؟

جواب: نماز کو محض Duty سمجھ کر نہ پڑھیے۔ عبادت کے کئی ایک درجے ہیں۔ سب سے نچلا درجہ یہ ہے کہ عبادت اس غرض سے کی جائے کہ نماز یا وظیفے سے میرا فلاں مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اگر انسان یہ سمجھ کر عبادت کرے کہ یہ میرا فرض ہے اور مجھے یہ Duty ادا کرنی ہے تو یہ پہلے والے سے ذرا بہتر درجہ ہے لیکن پھر بھی بہت ادنیٰ مقام ہے۔

اگر انسان نے نماز اس لیے قائم کی کہ یہ میرے رب تعالیٰ کا حکم ہے تو اگرچہ یہ پہلے دونوں درجات سے بلند درجہ ہے لیکن پھر بھی کمتر ہے۔

اگر انسان نے عبادت صرف اس لیے کی کہ میرا رب لائقِ عبادت ہے اور یہ رب تعالیٰ کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے تو یہ عبادت کا سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ دل میں ارادہ یہ ہے کہ میں اپنے رب کا حق ادا کر رہا ہوں۔ یہ اسی کو سزاوار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اس عبادت کے صلے میں اگر وہ مجھے جہنم میں بھی پھینکے تو کوئی گلہ نہیں ہے۔ وہ مالک اور آقا ہے، جو چاہے کرے۔ اور اگر اس عبادت کے بدلے میں وہ مجھے جنت دیتا ہے تو اس کی مہربانی ہے کہ وہ غفور الرحیم ہے۔ اس سے توقع یہی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ احسان اور مہربانی کا سلوک کرے گا۔

سوال: بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو ظاہری طور پر نماز نہیں پڑھتے۔ کچھ کا یہ کہنا ہے کہ ہم روحانی نماز پڑھتے ہیں جب کہ بعض کا کہنا ہے کہ نماز حاضری ہے اور ہم ہر وقت حاضر رہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

جواب: مجھے پتہ معلوم نہیں کہ کون بزرگ کیا کرتا ہے اور وہ درست ہے یا نہیں۔ دیکھیے اگر میں کسی سرجن کے

بارے میں Comment کروں تو ضروری ہے کہ مجھے اس سے زیادہ سرجری آتی ہو۔ اگر میں کسی Teacher کے بارے میں Comment کرتا ہوں کہ یہ ٹیچر اچھا ہے یا فلاں ٹیچر برا ہے تو یہ Comment کرنے سے پہلے مجھے Teaching Profession میں اُن سے زیادہ تجربہ کار ہونا چاہیے۔ اگر میں اس مقام پر نہیں ہوں تو میں کسی کے اچھا یا برا ہونے کے بارے میں فیصلہ یا رائے نہیں دے سکتا۔

اولیائے کرام میں سے کسی کا جو بھی عمل رہا اس کو درست یا غلط کہنے سے پہلے مجھے اُن سے بڑا ولی اللہ ہونا پڑے گا جب کہ میں تو اولیائے کرام کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں۔ لہٰذا ایک کم تر انسان کیسے اتنے اعلیٰ انسانوں کے عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ البتہ نماز کے بارے میں یہ ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ یہ تو وہ فرض ہے جس کی معافی آپ ﷺ کو بھی نہ ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ کے بعد بزرگ ترین ہستی نماز سے مستثنیٰ قرار نہ پائی تو کسی ولی اللہ کو یہ کیسے معاف ہو سکتی ہے۔

بیان ہے حضرت غوثِ اعظم دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کے پاس ایک روز شیطان نے آ کر کہا ''میں فرشتہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے تا کہ آپ کو یہ خوش خبری سنا دوں کہ آپ کی عبادات سے خوش ہو کر آپ کو نماز معاف کر دی گئی ہے۔'' یہ سن کر چند لمحے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ خاموش رہے پھر لاحول ولا قوۃ پڑھی اور فرمایا ''دور ہو جا مردود شیطان۔ جو چیز آپ ﷺ کو معاف نہ ہوئی مجھ جیسے انسان کو کیسے معاف ہو سکتی ہے۔'' اس پر شیطان ہنسا اور کہنے لگا ''شکر کریں آپ کو آپ کے علم نے بچا لیا ہے۔'' تب غوثِ اعظم ؒ نے دوبارہ لاحول پڑھی اور فرمایا ''مجھے میرے علم نے نہیں بلکہ میرے رب نے بچایا ہے۔''

اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ نماز آپ ﷺ کو معاف نہ ہوئی کسی صحابیؓ کو معاف نہ ہوئی تو کسی ولی اللہ کو کیسے معاف ہو سکتی ہے۔ نماز رب تعالیٰ کا حق ہے جو کہ ادا کیا جانا چاہیے۔ یہ محض حاضری نہیں ہے۔

سوال: نماز اپنے مقررہ وقت پر فرض ہے لیکن یہ مقررہ وقت مختلف مساجد میں مختلف ہوتا ہے۔ کہیں ظہر کی نماز سوا ایک بجے، کہیں دو بجے تو کہیں سوا دو بجے ہوتی ہے ایسا کیوں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اسلام میں جو احکامات دیے ہیں ان کا مقصد بندوں کو تنگ کرنا نہیں بلکہ سہولت دینا ہے۔ رب تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ آپ ایک بج کر 31 منٹ پر ہی ظہر کی نماز ادا کریں۔ اس طرح انسان تنگ ہوتا۔ نماز کی Timings مقرر ہیں۔ زوال کا وقت ختم ہونے سے لے کر سائے بڑھ جانے تک ظہر کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ یوں آپ کو تین گھنٹے کے برابر وقت مل جاتا ہے۔ ان تین گھنٹوں میں جب آپ کو فرصت ملے نماز ادا کر لیجیے۔ وہ بروقت نماز کہلائے گی۔ البتہ تلقین یہ ہے کہ نماز جلد سے جلد ادا کر لی جائے۔ عصر کا وقت غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے تک ہے۔ ہم نمازِ مغرب کے لیے سمجھتے ہیں کہ وقت بہت تنگ ہے۔ اس کے اندر بھی تقریباً 25 منٹ کا وقت با آسانی مل جاتا ہے۔ عشاء کی نماز کا وقت باقی تمام نمازوں کی نسبت زیادہ لمبا ہے۔ یہ نماز فجر سے کچھ پہلے تک رہتا ہے۔ ہر نماز کو اگر اس کے مقرر کردہ وقت کی حدود میں رہتے ہوئے ادا کر

لیا جائے تو وہ ادا نماز تصور ہوگی۔ البتہ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ نماز اپنے ابتدائی وقت میں ادا کرلی جائے۔ مساجد میں لوگوں کی سہولت کے لیے وقت مقرر کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اگر وہ ڈیڑھ بجے یا دو بجے نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو کون سی مساجد میں ان اوقات میں جماعت کھڑی ہوتی ہے۔

سوال: اگر انسان باجماعت نماز فجر ادا نہ کرسکے اور سورج بھی بس طلوع ہونے کو ہو تو ایسی صورت میں سورج نکلنے کا انتظار کیا جائے یا پھر جلدی سے محض فرض پڑھ لیے جائیں؟

جواب: اگر تو آپ کو یقین ہے کہ سورج طلوع ہونے کا Process شروع ہونے سے پہلے آپ نماز ادا کرلیں گے تو پھر فوری طور پر نماز پڑھ لیں۔ لیکن اگر یہ اندیشہ ہو کہ آفتاب کے طلوع ہونے کا Process شروع ہونے سے پہلے نماز ختم نہیں ہوگی تو پھر احتیاط کیجیے۔ ایسی صورت میں انتظار بہتر ہے۔

سوال: نماز فجر کے وقت ہمارے اوپر نیند کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ باوجود اذان سنائی دینے کے ہم ایک لمحہ کے لیے آنکھیں کھولتے ہیں اور پھر نیند میں چلے جاتے ہیں۔

جواب: اگر یہ کیفیت نہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ اذان میں یہ الفاظ شامل نہ کرواتے کہ نماز نیند سے بہتر ہے۔

''حضرت ابو محذورہؓ سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے اذان سکھائی اور آخر میں فرمایا:

فان کان الصلاۃ قلت 'الصلوٰۃ خیر من النوم، الصلوٰۃ خیر من النوم'

کہ جب صبح کی نماز کے لیے اذان دو تو الصلوٰۃ خیر من النوم دو مرتبہ بھی کہا کرو۔''

(سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب کیف الاذان، حدیث نمبر 500)

''نبی کریم ﷺ نے حضرت بلالؓ کو تثویب کا حکم دیا جس کی تشریح محدثین نے 'الصلوٰۃ خیر من النوم' کے ساتھ کی ہے۔'' (جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ التثویب فی الفجر، حدیث نمبر 198)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت بلالؓ نے ایک دن صبح کی اذان کے بعد نبی کریم ﷺ کے حجرہ مبارک کے باہر کہا ''الصلوٰۃ خیر من النوم۔'' نبی کریم ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ صبح کی اذان میں یہ جملہ کہا کرو۔ (المعجم الاوسط، حدیث نمبر 7583، موطا امام مالک حدیث نمبر 154)

سوال: محرم الحرام شروع ہونے پر کچھ لوگ نئے سال کی مبارک باد دیتے ہیں اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ اسلامی سال کی ابتدا رنج والم سے ہوئی ہے اس لیے مبارک باد نہیں دینی چاہیے؟

جواب: نئے سال کی مبارک باد ضرور دینی چاہیے کیوں کہ نیا سال شروع ہوا ہے۔ رنج وملال اپنی جگہ۔ واقعہ کربلا یقیناً رنج زدہ کرنے والا واقعہ ہے لیکن کسی کو 8 محرم سے پہلے تک معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے جارہا ہے البتہ حضرت امام حسینؓ کو ضرور علم تھا کیوں کہ انھوں نے تین مرتبہ قرآن پاک کی فال نکالی تھی۔ جب وہ عمرہ کرکے تشریف لے جانے لگے تو انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ اس سفر کا انجام موت ہے لیکن عام لوگوں کے علم میں یہ سب

کچھ نہیں تھا۔ آٹھ محرم کے بعد حالات و واقعات واضح ہوئے۔

واقعہ کربلا کے حوالے سے رنج و غم تو ہے لیکن افسوس نہیں ہے کیوں کہ کسی بھی مسلمان کے لیے اس کی شہادت اس کی معراج ہے۔ یہ بہت سادہ سی بات ہے اگر سمجھ میں آ جائے۔

سوال: آپ 7 محرم کو ختم دلاتے ہیں، اس کی کیا اہمیت ہے؟

جواب: جو اہل بیت میدان کربلا میں شہید ہو گئے ان کے ایصال ثواب کے لیے وہ ختم دلایا جاتا ہے۔ کیوں کہ میرے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب نے حکم دیا تھا کہ رمضان کی افطاری اور 7 محرم الحرام کو ختم کا سلسلہ زندگی بھر ختم نہ کرنا اس لیے میں مرشد صاحب کے حکم کی تعمیل میں 7 محرم الحرام کو ختم دلاتا ہوں۔

جب آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تو اپنی ڈکشنری سے "پانچ ک ۔ کب، کیوں، کیسے، کہاں، کیا" نکال دیں۔ چونکہ مجھے ختم دلانے کا حکم دیا گیا تھا اس لیے آج بھی وہ کام کرتا ہوں۔ جب میں انگلینڈ میں تھا تب بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں آپ سے بھی گزارش کروں گا کہ 7 محرم الحرام کا ختم ضرور دلایا کیجیے۔ یہ ختم اللہ تعالیٰ کے نام کا ہوتا ہے لیکن شہیدان کربلا اور حضرت عباس کو اس کا ثواب پہنچا دیا جاتا ہے۔

اکثر لوگ رزق کی تنگی کا شکوہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو یہ تک کہتے ہیں کہ کسی نے ہمارا رزق باندھ دیا ہے۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ کہنا شرک کے مترادف ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ رازق اللہ کی ذات ہے، جو کہ وہ یقیناً ہے۔ اللہ قادر مطلق اور سب سے زیادہ طاقت والا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا مجال کہ رزق باندھ دے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تو ہمیں رزق دینا چاہتا ہے لیکن فلاں شخص نے ہمارا رزق باندھ دیا ہے۔ تو (معاذ اللہ) مجھے یہ بتائیں کہ طاقت ور کون ہے...... رزق دینے والا یا رزق روک دینے والا۔ اس لیے میرے نزدیک یہ الفاظ شرک کے مترادف ہیں اور ان سے اجتناب بہت ضروری ہے۔ رزق میں فراخی کے لیے ایک حدیث آپ نے سن رکھی ہوگی۔

"جسے پسند ہو کہ اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس کی عمر میں
برکت دی جائے، اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔"

(صحیح بخاری، حدیث 1961)

میں یہاں اپنا ایک تجربہ بیان کروں کہ اگر انسان چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت پیدا ہو جائے تو اپنے اوپر لازم کرے کہ اللہ کے بندوں کو کھانا کھلاتا رہے۔ آپ اپنے رشتہ داروں، پڑوسیوں یا دوستوں میں سے کوئی ایسا گھر ڈھونڈ لیجیے جو سفید پوش ہوں، جو مشکل میں ہونے کے باوجود دوسروں پر اپنے حالات ظاہر نہ کرتے ہوں۔ انتہائی خاموشی اور رازداری کے ساتھ کہ خود آپ کی ذات کو بھی پتہ نہ چلے انھیں باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ دیتے رہیے۔ میرا تجربہ ہے کہ وہ کئی گنا اضافے کے ساتھ اسی وقت لوٹ آتا ہے۔ خاص طور پر اگر آپ کسی ایسے مقروض کو دیکھیں جو باوجود کوشش قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو نہایت خاموشی کے ساتھ اس کا قرض ادا کر دیجیے۔ آپ کا رزق وسیع ہو جائے گا۔ یہ بڑی آزمودہ بات ہے۔

اسی طرح اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عزت عطا کر دے تو ایک کام یہ کریں کہ اپنے بدترین دشمن کے بھی عیب بیان نہ کریں۔ اس کے بارے میں ہمیشہ تعریفی کلمات ہی کہیں۔ اب مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ آپ کے تعریف کرنے سے آپ کے دشمن کو عزت ملے گی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ خود آپ کو عزت مل جائے گی۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ حاسدین کی سازشیں اور منصوبے آپ کے خلاف کامیاب نہ ہونے پائیں تو یہ جان لینے کے باوجود کہ کس شخص نے آپ کے خلاف کیا پراپیگنڈا کیا ہے۔ آپ صدق دل سے قہقہہ لگائیں اور بات کو اڑا دیں۔ پھر تماشا دیکھیے کہ رب تعالیٰ کس طرح آپ کو اپنی امان اور حفاظت میں رکھتا ہے۔ انشاءاللہ ان باتوں پر عمل کرنے سے کبھی آپ کو دشمنوں کے ہاتھوں نقصان نہیں پہنچے گا۔

سوال: کیا رزق میں اضافے کا کوئی اور نسخہ بھی ہے؟

جواب: رزق میں اضافے کا ایک اور بڑا خاص الخاص نسخہ ہے کہ جہاں باوجود دعاؤں اور اللہ کے نام پر لوگوں کو کھانا کھلانے کے رزق میں وسعت پیدا نہ ہو تو رب تعالیٰ سے وسیع رزق حاصل کرنے کا یہ آخری نسخہ ہوتا ہے جو کبھی رائیگاں نہیں گیا۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ آپ جب بھی اپنی ہمشیرہ کے گھر جائیں تو اگر وہ Multibillionaire بھی ہوں تب بھی اپنی جیب سے کچھ نہ کچھ ضرور انھیں دیں خواہ وہ پانچ روپے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور پھر دیکھیے کہ کس طرح رزق کا سیلاب آپ کی طرف آئے گا۔ اگر کسی انسان کی Real sister نہیں ہے تو وہ اپنی فرسٹ کزن کی مدد کرے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کسی کام کو کرنا چاہے تو ہزار راستے ہیں اور اگر نہ کرنا چاہے تو ہزاروں حجتیں ہیں۔

بہت سے لوگوں نے رزق کی وسعت کے لیے اس نسخے کو آزمایا اور بہت مفید پایا۔

سوال: کیا بہن کو نقدی دینا ضروری ہے یا پھل اور دیگر ضروری اشیا بھی دی جا سکتی ہیں؟

جواب: رقم ضروری نہیں۔ آپ بہن کے لیے کپڑے لے جائیے۔ اس کے گھر کے لیے کوئی اور چیز لے جائیے لیکن عام طور پر اس کے لیے زیادہ رقم مطلوب ہوتی ہے جو ہر مہینے انسان کے لیے Spare کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ خواہ پانچ روپے ہی ہوں آپ اپنی ہمشیرہ کو ضرور دیجیے۔

اس تمام سلسلے میں ایک احتیاط بہت ضروری ہے۔ ہم عموماً کسی کو بتاتے تو نہیں کہ ہم کسی کی مدد کر رہے ہیں یا کسی کو کچھ دے رہے ہیں لیکن اگر کہیں بات ہو گئی اور کسی نے آپ کو یہ کہہ دیا کہ بھائی تم اللہ کے نام پر کسی کو کچھ دلا دیا کرو تو فوراً ہماری زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے "نہیں جی۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ میں تو اللہ کے نام پر دیتا ہی رہتا ہوں۔" جہاں زبان سے یہ بات نکلی وہاں وہ فوراً تکبر میں چلا گیا۔ جہاں یہ بات آ گئی کہ میں لوگوں کو کچھ نہ کچھ دیتا ہوں وہاں نیکی نیکی نہ رہی تکبر ہو گیا۔

نیکی اور تکبر میں بال برابر فرق ہے۔ جب تک انسان کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ نیکی کر رہا ہے تب تک وہ نیکی

ہے۔ جہاں یہ ادراک ہوا کہ میں نیکی کر رہا ہوں تو وہ نیکی تکبر میں بدل گئی۔ اس سے ذرا دور رہنے کی کوشش کیجئے۔ خاص طور پر ایسے موقع پر جب آپ جس انسان کی مدد کر رہے ہوں، وہ لوگوں میں بیٹھ کر کہے کہ اس نے تو آج تک مجھے پھوٹی کوڑی تک نہیں دکھائی۔ یہ الزام سن کر آپ فوراً جوش میں آ کر کہتے ہیں "بھول گئے ہو۔ ہر مہینے تو پیسے دے کر جاتا ہوں۔"

یہ جوش اور رویہ نیکی ضائع کر دیتا ہے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ انسان مسکراتے ہوئے کہہ دے "بھائی! دعا کیجیے اللہ مجھے توفیق دے کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں۔" بس اتنی سی بات پر انسان کی بچت ہو گئی۔

بہت سی باتوں کا جواب ایک مسکراہٹ سے دے دیا کیجیے۔ دوسروں کے اعتراضات خندہ پیشانی سے سن لیا کیجیے۔ اسی طرح بہت سی تہمتیں آپ پر لگتی رہتی ہیں۔ کوئی شخص آ کر آپ کو بتاتا ہے کہ فلاں شخص آپ کو آوارہ، شرابی اور چور کہہ رہا تھا، تو بجائے یہ کہنے کے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، یہ خوبصورت جواب دیا کیجیے۔ "بھائی! وہ تو بہت اچھا انسان ہے۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اگر اتنے اچھے انسان نے میرے بارے میں یہ سب کہا ہے تو یقین کر لو کہ میرے اندر یہ خامیاں موجود ہیں ورنہ اتنا اچھا انسان میرے بارے میں ایسی غلط بات کیوں کہتا۔" یہ رویہ اپنانے کے بعد تماشا دیکھیے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے کیسے آپ کے لیے مدد آتی ہے۔

معرفتِ حقیقت

روحانیت کو تصوف اور معرفت بھی کہا جاتا ہے۔ اس معرفت کو نہ تو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جب تک کہ معرفتِ حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت کو نہ صرف ہم سمجھ لیں بلکہ صدقِ دل سے اس پر عمل پیرا بھی ہو جائیں۔ اگر عمل میں کوئی فرق رہ جاتا ہے تو علمِ معرفت حاصل کرنے اور اس Direction میں پوری محنت کرنے کے باوجود انسان کہیں پہنچ نہیں پاتا۔ ساری عمر وہ کولہو کے بیل کی طرح محنت تو کرتا ہے لیکن ایک ہی جگہ پر گردش میں رہتا ہے۔ بزعم خود وہ سمجھتا ہے کہ اس نے بہت سفر طے کر لیا ہے لیکن وہ معرفت کی طرف ایک قدم بھی اٹھا نہیں پاتا۔ اگر ہم علمِ معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے لازم ہے کہ اللہ کی معرفت پر صدقِ دل سے یقین بھی رکھیں اور اس کو Exercise بھی کریں۔

اللہ کی معرفت کو مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ اخلاص کا ترجمہ و خلاصہ ہے جو اللہ کے صفاتی ناموں کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت یہ ہے کہ وہ تنہا ہے، یکتا و یگانہ ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے، نہ کسی کا بیٹا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے وہ پالنے والا ہے، قادرِ مطلق ہے، سمیع و بصیر ہے۔ (اس کی جتنی صفات کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ علمِ معرفت کے Context میں ہیں لہٰذا انھیں کو صرف اسی Context میں لیجیے تاکہ کوئی غلط فہمی ہی نہ ہو)۔

علمِ معرفت کے Context میں اس کی تمام صفات میں سے صفت ''سمیع و بصیر'' ہی کافی ہے ہمیں سیدھا راستہ دکھانے اور سیدھے راستے پر قائم رکھنے کے لیے۔ اللہ کا سمیع و بصیر ہونا راہِ معرفت پر چلنے والے بندے کے لیے ایک Constant check ہے۔ یہ خوف کہ وہ دیکھ رہا ہے اور میری ہر اچھائی برائی اس کے علم میں ہے، مجھ جیسے انسان کو غلط کاموں سے روکے رکھے گا۔ رب تعالیٰ کی اس صفت پر اگر مجھے یقین ہے تو پھر میں غلط کاموں سے بچا رہوں گا۔ چاہے میں تنہائی میں ہوں یا ظاہری طور پر لوگوں میں موجود ہوں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم تمام چیزوں کو سمجھتے اور جانتے ہیں لیکن ان پر عمل کرنے میں کوتاہی کر جاتے ہیں۔

We all believe in Allah but we don't trust Him.

ہم سب دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ میرا اللہ پر بھروسا پورا ہے لیکن جہاں ذرا سے ہمارے معاملات خراب ہو جائیں وہاں ہمارے Reactions (ردِعمل) سے فوراً اظہار ہو جاتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر کس درجہ بھروسا کرتے ہیں۔

ہم پر ذرا سی تنگی آ جائے تو ہم کسی صاحب دُعا یا ماہر عملیات کے پاس دوڑے جاتے ہیں کسی تعویذ کے حصول کے لیے۔ یہ کیسا بھروسا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کریم پر کہ ہم ذرا سی تکلیف پہنچنے پر غیر اللہ کے پاس دوڑے چلے جاتے ہیں۔

ایک سلطان نے اپنے غلام کو ایک پھل کھانے کو دیا اور وہی پھل اپنے وزیر کو بھی دیا۔ پھل کا ذائقہ تلخ و ترش تھا۔ وزیر نے کھایا تو خاموشی سے لیکن اس کے چہرے سے پھل کی تلخی و ترشی کا اثر ظاہر ہو گیا جب کہ غلام نے وہی پھل اس قدر اطمینان سے کھایا گویا کہ وہ بہت ہی خوش ذائقہ ہو۔ سلطان نے اپنے غلام سے پوچھا "تم نے اتنے کڑوے پھل کو اتنی رغبت سے کیسے کھایا؟" اس نے جواب دیا "میں نے سوچا کہ سلطان مجھے رب تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں انجوائے کرواتا ہے، کیسی مزے مزے کی چیزیں آج تک کھلاتا رہا، اگر آج ایک بار کڑوا پھل کھلا دیا تو اس میں کیسا گلہ اور کیسا شکوہ"۔

ذرا سوچیے ہم تو دن رات رب تعالیٰ کی نعمتیں Enjoy کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ ہمارے تمام کام صبح سے شام تک بغیر ہمارے کہے کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس قدر کرم نوازی کے دوران ذرا سی کوئی تکلیف ہم پر آتی ہے، ذرا سی مشکل ہم پر آن پڑتی ہے تو ہماری چیخ پکار اور واویلا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ ذرا سی تکلیف ہے جو آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گی۔ یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا۔ ساری عمر ہم اللہ تعالیٰ کے انعامات کو Enjoy کرتے رہے۔ یہ ایک ذرا سی تکلیف آ گئی تو کیا ہوا۔ چند دنوں میں یہ ختم ہو جائے گی۔ مجھے جب اس تکلیف کو سہنا ہی ہے تو کیوں نہ خوش دلی سے سہہ جاؤں۔ بلاوجہ چیخ پکار کر کے رب کا ناشکر گزار کیوں بنوں۔

میں نے بارہا دیکھا ہے کہ جو لوگ مصیبت کو ہنستے کھیلتے ہوئے جھیل لیتے ہیں رب تعالیٰ انھیں طرح طرح کے انعامات عطا فرماتا ہے۔ لیڈی ڈیانا کے مرنے پر اکثر لوگوں نے کہا کہ یہ سب کیا ہے۔ ایک خاتون More or less a playgirl کہلاتی تھی۔ اس کی آخری رسوم اس قدر شاندار انداز میں ہوئیں۔ تب میں نے عرض کیا "جناب! یہ رب کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ڈیانا کا قصہ نہیں ہے۔ یہ رب تعالیٰ کے دعویٰ کی سچائی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ عزت اور ذلت میرے ہاتھ میں ہے۔ میں جسے چاہتا ہوں عزت دیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں ذلت دیتا ہوں۔" وہی خاتون جس کے پیچھے فوٹوگرافر دوڑ لگا رہے تھے کہ کوئی پوز مل جائے تاکہ وہ اسے Evening Paper کے Page 3 پر چھاپ سکیں۔ اس خاتون کا انتقال ہوتے ہی اس کا جنازہ اس شان سے اٹھا کہ اس کے کچھ عرصے بعد جب Mother Queen کی Death ہوئی تو اس کا جنازہ ڈیانا کے جنازے کی شان کے دسویں حصے کے برابر بھی نہیں تھا۔

اسی طرح صدام کی پھانسی کا ایک واقعہ ابھی حال ہی میں گزرا ہے۔ اس کے بارے میں ہر طرح کے Comments لکھے گئے جو کہ بہت زیادہ Pleasant نہیں ہوتے تھے۔ اس کے پھانسی چڑھنے پر کسی نے اسے مرد جری کہا، کسی نے Iron man اور کسی نے مرد مومن کا لقب دیا کیوں کہ وہ پھانسی کی طرف ہنستے کھیلتے چلا گیا۔ وہ یہ سادہ سی بات سمجھ گیا تھا کہ پھانسی کی سزا ہو چکی ہے اور اس پر عمل درآمد بھی ہونا ہے تو پھر چاہے اسٹریچر پر لیٹ کر پھانسی گھاٹ تک جائے، چیخ پکار اور واویلا کرکے پھانسی پر چڑھ جائے یا پھر تمکنت اور وقار سے ہنستے کھیلتے ہوئے موت کو گلے لگا لے۔ یہ اس کی اپنی Option ہے اور اس نے تیسری Option پر عمل کیا۔ تمکنت اور وقار سے اپنے قدموں پر چل کر ہنستا کھیلتا ہوا پھانسی گھاٹ تک گیا۔ اس کے اس رویے اور عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس کے خلاف لکھتے تھے وہی اس کی Favour میں لکھنے لگے، اس کی تعریف کرنے لگے۔

جب انسان کو یہ باریک نکتہ سمجھ آ جاتا ہے کہ بُرا وقت ہر انسان پر آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ جب ہمیں اسے جھیلنا ہی ہے تو کیوں نہ ہنسی خوشی جھیل جائیں اور اللہ کے شکر گزار بندے کہلائیں۔ ایک صاحب بڑے شاہ صاحب قبلہ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ ایک ہی جملے کی تکرار کرتے جا رہے تھے "میں بڑی مشکل میں ہوں۔ دعا کر دیں کہ میرے حالات ٹھیک ہو جائیں۔"

بڑے شاہ صاحب کے Face expressions سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ انھیں یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ میں نے ان صاحب کو چپکے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن وہ باز نہ آئے اور دوبارہ اور سہ بار وہی جملہ دہرا دیا کہ دعا کر دیں میرے حالات ٹھیک نہیں ہے۔ تیسری بار انھوں نے یہ کہا تو شاہ صاحب نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا "تمہارے بُرے وقت کو ٹالنے کے لیے میں دعا کر دوں۔ کیوں؟ اچھا وقت تم نے گزارا ہے، بُرا وقت تمہاری جگہ کوئی اور گزارے گا کیا؟" ذرا اس ایک جملے میں پوشیدہ حکمت پر غور کیجیے کہ اگر زندگی میں رب تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو ہم Enjoy کرتے ہیں تو زندگی کے سمندر میں آنے والا تھوڑا بہت تلاطم بھی ہمیں ہی برداشت کرنا چاہیے۔ اب یہ ہمارا ظرف ہے کہ اسے ہنستے کھیلتے ہوئے گزارتے ہیں یا روتے پیٹتے ہوئے جھیلتے ہیں۔ وقت تو دونوں صورتوں میں گزر جائے گا لیکن رونے پیٹنے اور واویلا کرنے سے لوگوں میں قائم بھرم بھی جاتا رہے گا اور ہم رب تعالیٰ کے نزدیک ناشکر گزار بندے بھی کہلائیں گے۔ لہٰذا رب تعالیٰ کا شکوہ غیر اللہ کے سامنے بیان کرنے کے بجائے اگر خود اس ذات اقدس کے حضور ہم اپنی مناجات، گزارشات پیش کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

بہتر یہی ہے کہ ہم رب کی شکایت خود رب سے کریں۔ آپ کو شاید لفظ "شکوہ و شکایت" نامناسب لگے لیکن میرے نزدیک یہ شکوہ اس لیے ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ مجھ پر بُرا وقت آیا ہے تو بھول جاتے ہیں کہ وقت تو من جانب اللہ ہے۔ اچھا یا بُرا دونوں صورتوں میں جب وقت من جانب اللہ ہے تو ہم انگلی کس پر اٹھاتے ہیں؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔

اس لیے بہت بہتر ہے کہ رب کا شکوہ غیر اللہ سے بیان کرنے کے بجائے خود رب تعالیٰ کے حضور پیش کر دیں۔ رات کی تنہائی میں بیٹھے ہوئے بجائے اُس کی بارگاہ میں واویلا کرنے کے ہم بہت Pleasant انداز میں اُس کے ساتھ گفتگو کریں اور اُس سے بجائے یہ کہنے کے کہ "یا اللہ! میں مر گیا، میں لٹ گیا، قیامت آ گئی۔" آپ سیدھے سادے انداز میں کہیے "یا باری تعالیٰ! یہ سچ ہے کہ آج تک تو نے مجھے بڑے اچھے حال میں رکھا۔ تو نے مجھے ہر نعمت سے نوازا، تیری عطاؤں اور کرم نوازیوں میں کوئی شک نہیں لیکن یہ تو ہی ہے جس نے مجھے بے صبر اور کمزور بنایا۔ بس تو نے مجھ پر یہ جو مشکل وقت بھیجا ہے، اپنی رحمت کے صدقے اسے ٹال دے۔"

یہ شکوہ کے بجائے ایک درباری مسخرے کی فریاد بن جائے گی۔ روتا بسورتا ہوا چہرہ تو کسی کو بھی پسند نہیں آتا۔ ہنستے ہوئے چہرے سے گلہ شکوہ بھی چل جاتا ہے۔ تو بس رب تعالیٰ کے ساتھ بھی کوئی ایسی ہی تکنیک لڑائیے۔ اگر رب تعالیٰ سے مانگتا ہے تو شکر گزار بندے کی طرح مانگیں۔ اس سے کہیے "اس میں کوئی شک نہیں کہ تو ہمیشہ مجھے نوازتا رہا ہے۔ تو نے ہمیشہ مجھے میرے استحقاق اور توقع سے بہت بڑھ کر عطا فرمایا ہے۔ اب بھی اپنی اسی ڈگر پہ رہ۔ یہ مشکل وقت بھی ٹال دے۔" یہ تکنیک آزما کر دیکھیے کہ کیسے کڑا وقت ٹل جاتا ہے اور آپ کو پتا بھی نہیں چلتا۔

آج صبح فجر کے بعد سورۂ نمل دیکھ رہا تھا تو ایک آیت نے میری توجہ ایک عجیب طرف دلا دی کہ ملکہ سبا جن کا نام بلقیس تھا، جب ہدہد نے اُن تک خط پہنچایا تو ملکہ سبا نے خط پڑھ کر فیصلہ کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے ٹکر لینے کے بجائے صلح جوئی کا راستہ نکالا جائے۔ اس نے قاصدوں کے ہاتھ کچھ تحائف روانہ کیے اور انھیں ہدایت کی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں اس وقت تک کھڑے رہنا جب تک وہ تمھیں خود بیٹھنے کا حکم نہ دے دیں۔ جو عورت As observer اُن کے ساتھ بھیجی گئی اُس کے ذمہ یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تمام الفاظ کو من وعن یاد رکھے تاکہ ان کی روشنی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے آئندہ کے Attitudes اور رویوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

بلقیس کی ہدایات کے پیچھے حکمت یہ تھی کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام (معاذ اللہ) متکبر و مغرور حکمران ہیں تو وہ ان قاصدوں کو بیٹھنے کو نہیں کہیں گے لیکن اگر وہ باوقار اور عالم حکمران ہیں تو ان قاصدوں کو بیٹھنے کا ضرور کہیں گے۔

عالم ہونا انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے رویے تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ وہ بہتر حکمت عملی ترتیب دے کر اصل حقائق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور حقائق تک یہ رسائی اکثر اوقات اس کی زندگی کو سہل بنا دیتی ہے۔

فقر کے آداب اور اسمِ اعظم

ہر چیز کی طرح فقر کے بھی کچھ آداب ہیں۔ فقر میں سب سے زیادہ دو چیزوں پر زور دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کسی کے سامنے سوال نہ کرے۔ دوسری چیز دراصل بہت بڑی Warning ہے۔ فقیر پر لازم ہے کہ جب وہ تنگ دستی اور عسرت کا شکار ہو جائے تو دل میں اس چیز کے غم کو جگہ نہ دے کہ میں فاقہ کش ہو گیا اور اس تنگ دستی اور عسرت کے حوالے سے اللہ کے لیے دل میں کسی قسم کا شکوہ اور گلہ نہ لائے۔ کیوں کہ اگر ایسی کیفیت دل پر طاری ہو جائے اور تنگی و عسرت کی شدت کی وجہ سے فقیر کے دل میں اللہ کے بارے میں یہ گلہ اور شکوہ آنے لگ جائے کہ رب نے مجھے یہ کس حال میں کر دیا ہے تو پھر سمجھ لیں کہ یہ غربت اور عسرت گردشِ ایام نہیں ہے بلکہ فقر کے دوران کہیں کسی بڑی غلطی کا نتیجہ ہے اور پروردگار نے اُسے نئے سرے سے کندن بنانے کے لیے کٹھالی میں ڈالا ہے۔

راہِ فقر میں اگرچہ دستِ سوال دراز کرنے کی ممانعت ہے لیکن ایک صورت میں اس کی Conditional اجازت دی گئی ہے۔ اگر فقیر عیال دار ہے اور اس کی فیملی فاقوں میں مبتلا ہے تو انہیں فاقوں سے نکالنے کے لیے دستِ سوال دراز کرنے کی اجازت ہے لیکن اس کے لیے بھی Protocol ہے۔ فقیر کسی شخص کے پاس جا کر باقاعدہ یہ نہ کہے کہ میں تنگ دست ہو گیا ہوں۔ مجھ پر غربت ہے۔ میں فاقے کا شکار ہوں۔ میری کچھ مدد ہی کر دیں بلکہ اس کے بجائے اس طرح سے Affirmative Tone میں بات کرے کہ تم مجھے کچھ دینا چاہتے ہو یا پھر یوں کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جس مال پر نگہبان مقرر کیا ہے تم اس مال میں سے مجھ سے کچھ Share کرنا چاہ رہے ہو۔ یہ انداز درست ہے کیوں کہ یہ سوال سے ہٹ کر Affirmative بات ہو جائے گی۔

اس طرح بات کرنے کے بھی Further protocols ہیں جن میں دو Conditions ہیں۔ فرض کریں کہ آپ کو سو روپے کی ضرورت ہے اور آپ کے گھر میں ایک روپیہ پڑا ہے تو آپ باقی ننانوے روپے کے لیے سوال نہیں کر سکتے۔ آپ کو پہلے وہ ایک روپیہ بھی خرچ کرنا ہو گا اور جب آپ کے پاس بالکل Zero

ہو جائے تب آپ کسی سے سوال کر سکتے ہیں۔ اس کا دوسرا Protocal یہ ہے کہ اگر آپ کو سو روپے کی ضرورت ہے تو آپ ایک سو ایک روپے نہیں مانگ سکتے، پورا سو ہی لیں گے۔ اگر کوئی ایک سو ایک روپے بھی دے تو زائد ایک روپیہ اس کو لوٹا دیں گے۔ اس سوال کی بھی بنیادی شرائط وہی ہیں کہ آپ اپنی ذات کے لیے سوال نہیں کر سکتے۔ آپ پر وہی Conditions لاگو ہوتی ہیں کہ آپ فاقے سے ہیں، بھوکے پیٹ ہیں تب بھی آپ کو ظاہر کرنا ہوگا کہ آپ بھرے پیٹ سے ہیں۔ غربت میں خود کو امیر ظاہر کرنا پڑے گا۔ اگر غمگین ہیں تو خود کو خوش ظاہر کرنا ہوگا۔ مصیبت زدہ ہیں تو آپ کو ظاہر کرنا پڑے گا کہ زمانے میں مجھے کوئی دکھ نہیں۔

ایک طرف تو یہ Conditions ہیں اور دوسری طرف یہ Conditions ہیں کہ جو آپ کے ارد گرد لوگ ہیں ان پر نظر رکھیں کہ ان میں سے کوئی مشکل میں تو نہیں ہے۔ کوئی مصیبت میں تو مبتلا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو جہاں تک ممکن ہو ان کے سوال کرنے سے پہلے ہی ان کی مدد کر دیجیے۔ اگر کسی کو قرض دیں تو حتی الوسع کوشش کریں کہ اس کی واپسی کا تقاضا نہ کریں۔ اگر وہ لوٹا سکتا ہے تو لوٹا دے نہیں لوٹا سکتا تو نہ لوٹائے۔

ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے (آپ سب تو بھلے لوگ ہیں میں اپنی بات کر رہا ہوں) کہ ابھی کوئی پوچھے "شاہ صاحب! کیسے حالات ہیں؟" تو میں کہوں گا "اللہ کا شکر ہے جی۔" لیکن ان لفظوں کے درمیان میری آواز میں ہلکا سا شکوہ چھپا ہوگا کہ کس چیز کا شکر؟ مجال ہے کہ کبھی جذبے کے ساتھ کہہ دیں کہ پروردگار کا شکر ہے۔ رب کا بڑا احسان ہے۔

رب تعالیٰ کی بندگی صرف یہی تو نہیں کہ نماز پڑھ لی جائے، روزے رکھ لیے جائیں۔ یہ تو رب تعالیٰ کا حق ہے کیوں کہ وہ لائق عبادت ہے۔ اس کی عبادت اس لیے نہیں کی جاتی کہ یہ فرض ہے بلکہ یہ رب تعالیٰ کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

ہم کتے سے بہت نفرت کرتے ہیں کہ وہ نجس ہے۔ جس گھر میں اس جانور کو رکھیں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے لیکن اسی کتے کی وفاداری کا یہ عالم ہے کہ ایک بار اگر آپ اسے روٹی ڈال دیں یا پانی دے دیں تو وہ کبھی آپ پر نہیں بھونکے گا۔ ہمیشہ آپ کو دیکھ کر دم ہلائے گا۔

میں اپنے رب سے روز ہزار ہا نعمتیں وصول کرتا ہوں۔ صبح سے شام تک وہ بغیر میرے کسی استحقاق کے میرے ہزار ہا کام کرتا ہے۔ میں ان تمام نعمتوں کے حصول کے لیے Qualify نہیں کرتا لیکن پھر بھی وہ مجھے اپنی رحمت اور ربوبیت کے صدقے ہر طریقے سے پالتا ہے۔ اس کی اس قدر رحمتوں اور نعمتوں کے باوجود اگر کوئی مجھ سے پوچھتا ہے "کیا حال ہیں؟" تو میں روتی ہوئی شکل کے ساتھ بمشکل کہوں گا "جی اللہ کا شکر ہے، بس ٹھیک ہوں۔" یہ بندگی نہیں ہے۔ میں تو کتے کی ایک صفت کے قریب تک نہیں جا سکا۔ میں خود میں اس کی دوسری صفت کیسے پیدا کروں گا؟ یہ جانور اپنے مالک کا انتہائی وفادار ہے۔ آپ اس کو کھانا نہ دیں، یہ پھر بھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ آپ اس کو باندھ دیجیے، Stick سے ماریں، مر جائے گا لیکن گھر چھوڑ کر نہیں جائے گا اور ایک میں ہوں کہ زبان سے یہ کہتا ہوں کہ میرا رب قادر مطلق ہے اور ہر جگہ موجود ہے لیکن ابھی ذرا

میں مشکل کا شکار ہو جاؤں تو تعویذ اور عملیات کرنے والوں کے پاس بھاگا جاؤں گا۔ ان کی تیغ اور کیلی باتیں بھی برداشت کرلوں گا تا کہ میرا کام ہو جائے اور ایسے میں بھول جاؤں گا کہ میرا رب موجود ہے۔ یہ بندگی نہیں ہے۔ غیر اللہ کے پاس حاجت روائی کے لیے جانا اور ذرا سی مشکل پر شکوے شکایات پر اتر آنا آداب بندگی کے خلاف ہے۔

میرے خیال میں یہ بھی بندگی کے آداب کے خلاف ہے کہ انسان زبان سے تو اللہ کا شکر ادا کرے لیکن اس کے حلیے یا چہرے کے تاثرات سے مایوسی ٹپکنے لگے۔ یہ بھی گویا شکوہ ہے۔ بُرے وقت میں بھی چہرے پر ایسی بشاشت ہونی چاہیے کہ دیکھنے والا بھی Guess نہ کر پائے کہ آپ کیسے تلخ حالات سے گزر رہے ہیں۔ یہ رویہ اپنا کر دیکھیے کہ کیسے رب تعالیٰ آپ پر اپنی رحمت فرماتا ہے اور بُرا وقت کیسے وقت سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ اسم اعظم کیا ہے؟ اسی طرح کچھ لوگوں نے آ کر بتایا کہ فلاں Astrologer نے میرا اسم اعظم نکال کر مجھے بتایا ہے کہ اس کو پڑھ لیا کرو، تمہارے بگڑے کام سنور جائیں گے۔ وہ بات میرے لیے باعث حیرت تھی کہ اسم اعظم کسی نے کیسے بتا دیا اور کسی Astrologer کے ہاتھ اسم اعظم کیسے آ گیا۔

اسم اعظم قرآن پاک میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے اور وہ بھی لفظوں میں چھپا ہوا ہے۔ کہیں بھی یہ Single word میں آپ کو نہیں ملے گا۔ کوئی ولی اللہ بھی اسم اعظم آپ کو نہیں بتائے گا کیونکہ اسے بتانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لیے میں حیران ہوا کہ یہ کون Astrologer ہیں جنہوں نے اسم اعظم بتا دیا ہے۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا "کیا اسم اعظم آپ کو بتایا گیا ہے۔" انھوں نے جو لفظ مجھے بتایا اس پر تھوڑا سا غور کرنے کے بعد پتہ چل گیا کہ در اصل وہ اعداد کے ذریعے نکالا گیا تھا۔ اسم اعظم کو Work out کرنے کا ایک ہی Method نظر آیا کہ وہ Astrologer علم الاعداد کا ایک سیدھا سادھا Principle لگا کر اسم اعظم کی جستجو میں رہنے والے لوگوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انھوں نے آپ کا نام پوچھا، تاریخ پیدائش پوچھی، ان کے اعداد نکالے، ان اعداد کو جمع کیا پھر رب تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں سے وہ اسم ایسے لے لیے جن کا ٹوٹل آپ کے نام اور تاریخ پیدائش کے اعداد کے ٹوٹل کے برابر بنتا ہے اور ان اسماء الحسنیٰ کو اسم اعظم قرار دے دیا۔ حالانکہ در حقیقت وہ اسم اعظم نہیں ہوتا۔

اسی طرح بہت سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جو شخص (آصف بن برخیا) پلک جھپکنے میں ملکہ بلقیس کا تخت لے آیا تھا، وہ اسم اعظم کا عامل تھا۔ کسی صاحب نے مجھ سے پوچھا "آصف بن برخیا کن اسماء الحسنیٰ کے عامل تھے؟" تو میں نے ان سے عرض کیا "کہ وہ یاحی یا قیوم کے عامل تھے۔" کسی بھی اسم مبارک کو آپ پڑھیں اور اس کا بڑا دور مکمل کر لیں تو اس سے ایسی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں کہ ناممکن نظر آنے والا کام ممکن ہو جاتا ہے۔ آصف بن برخیا نے بھی یاحی یا قیوم کا دور کبیر مکمل کیا ہوا تھا، دوسرے لفظوں میں وہ یاحی یا قیوم کے عامل تھے۔ ایک

صاحب کسی ولی اللہ کے پاس جا کر بیٹھتے تھے۔ ان کی شاگردی میں جب انھیں پچیس تیس برس گزر گئے تو مرشد نے کہا" تمہاری تربیت اب مکمل ہو گئی۔ اب میں تمہیں علم عطا کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے شرط یہی ہے کہ شہر کے باہر جو جنگل ہے، اس میں جا کر چالیس روز تم نے سورۂ اخلاص ایک مقررہ تعداد میں پڑھنی ہے۔ جنگل میں جانے کا اس لیے کہا ہے کہ وہاں تمہیں کوئی Disturb نہیں کرے گا۔ دنیاوی کاموں کی طرف تمہارا دھیان نہیں جائے گا اور تم یکسوئی کے ساتھ یہ تعداد پوری کرو گے۔ چالیس دن بعد تم شہر کی طرف لوٹ آنا۔ جب تم جنگل سے نکل رہے ہو گے تو تمہیں ایک مرد خدا ملے گا۔ وہ تم سے پوچھے گا 'بولو کیا مانگتے ہو؟' تم اس سے علم کا مطالبہ کرنا۔ اگر وہ بحث کرے پھر بھی تم اس سے اصرار کرنا کہ مجھے علم عنایت فرما دیں۔ اس پر وہ تمہیں علم عطا کر دے گا۔ وہ دراصل اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہو گا۔ اس علم کے حصول کے بعد تم اپنے مقام کو پہنچ جاؤ گے۔"

مرشد صاحب کے حکم کے مطابق وہ صاحب قریبی جنگل میں چلے گئے۔ جو سامان ساتھ لے گئے تھے وہ بھی ختم ہو گیا۔ آخری دنوں میں یہ حالت ہو گئی کہ نہ پینے کو پانی نہ کھانے کو روٹی۔ بڑے لاغر ہو گئے لیکن اپنی عبادت جاری رکھی حتیٰ کہ چالیس دن مکمل ہو گئے۔ چالیس دن مکمل ہونے کے بعد حسب حکم جنگل سے شہر کی طرف واپس چلے تو وہی ہوا جو مرشد نے کہا تھا۔ ایک فرشتہ ملا اور کہا" جو مانگو گے، ملے گا۔" اب ان صاحب کی حالت بھوک پیاس کی وجہ سے بہت خراب تھی۔ ایک بار تو جی چاہا کہ کہیں کہ مجھے کھانے پینے کو کچھ دے دو۔ پھر مرشد کا حکم یاد آیا تو کہا" مجھے علم دے دو۔" فرشتے نے کہا" تم بالکل پاگل ہو گئے ہو۔ کیا علم کو چاٹو گے؟ رہنے کو تمہارے پاس مکان نہیں، کھانے کو روٹی نہیں، پینے کو پانی نہیں۔ اپنی حالت دیکھو کیا ہو گئی ہے کوئی اور چیز مانگو جس سے تمہاری Quality of life بہتر ہو جائے گی۔" اس نے کہا" جی! میرا تو بہت جی چاہتا ہے لیکن مرشد صاحب کا حکم یہی ہے اور میں مرشد کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ تم مجھے وہی علم دے دو۔" فرشتے نے کافی بحث کی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی" تمہیں تمہاری حالت کے پیش نظر علم سے زیادہ اپنا معیار زندگی بہتر بنانے کی ضرورت ہے لیکن اگر تم اتنا ہی اصرار کرتے ہو تو یہ علم لے لو۔" فرشتے نے جب ان صاحب کو علم دیا تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کا وزن کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ اصل میں یہ وزن نہیں بڑھا کرتا بلکہ وہ علم کا زور ہوتا ہے جس سے طاقت محسوس ہوتی ہے۔

علم لینے کے بعد وہ صاحب بھوک سے بے حال ٹانگیں گھسیٹتے ہوئے شہر کی طرف چل دیے۔ رات ہو گئی تو وہاں کے دستور کے مطابق جس گاؤں میں پہنچے اس کے پہلے ہی گھر پر دستک دے دی اور رات کو قیام کی درخواست کی۔ انھوں نے اسے مہمان خانے میں ٹھہرا دیا۔ رات کو وہ شخص عبادت میں مصروف تھا کہ اچانک کہیں سے چیخ پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جب وہ آوازیں بہت بڑھ گئیں تو اس نے سوچا کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ نیکی کی ہے ذرا باہر نکل کر دیکھوں تو سہی کہ ماجرا کیا ہے۔ پتا چلا کہ اس گاؤں کے قبیلے کے سردار کا بیٹا حالت نزع میں ہے۔ یہ سب لوگ اس کی محبت اور جدائی کے خوف میں رو رہے ہیں۔ مہمان نے لڑکے کا نام پوچھا۔ اس کی طرف توجہ کی تو فوراً دعا میں جواب آ گیا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا کہ تم

اُن کے گھروں کے باہر فلاں بوٹی لگی ہوئی ہے۔ اس کے پتوں کو مسل کر رس نکالو اور اس بچے کے منہ میں ٹپکاؤ۔ ان شاء اللہ بچہ صحت یاب ہو جائے گا۔ وہ لوگ سردار کے پاس گئے اور اسے یہ حل بتایا۔ سردار نے سوچا کہ بیٹا رخصت تو ہو ہی رہا ہے اس کو آزما لینے میں کیا حرج ہے۔ ایک شخص گیا۔ بوٹی توڑ کر لایا اور رس نکال کر اس بچے کے منہ میں ٹپکانا شروع کیا۔ فوراً ہی اس کی حالت میں بہتری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ صبح تک اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ وہ بچے کو دن بھر وہ رس پلاتے رہے حتیٰ کہ شام کو وہ کافی حد تک ٹھیک ہو گیا۔ سردار نے ان صاحب سے کہا "تم میرے محسن ہو۔ ایک ہفتے تک میرے پاس مہمان رہو۔" وہ شخص رُک گیا۔ اسی دوران سردار کا بیٹا بھی مکمل تندرست ہو گیا۔ اسی ہفتے کے اختتام پر خبر ملی کہ دشمن قبیلہ حملہ آور ہونے کو ہے۔ سردار نے تیاری کا حکم دیا اور گاؤں کے باہر مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہ شخص مہمان خانے میں بیٹھا لڑائی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جس قبیلے کا وہ مہمان ہے وہ دشمن کے سامنے کمزور پڑ رہا ہے اور لگتا ہے کہ مارا جائے گا۔ اس نے ایک آدمی کو بلا کر کہا کہ قبیلے کے سردار کو میری طرف سے یہ پیغام دو کہ تم فلاں حکمت عملی اختیار کرو تو تمہیں فتح حاصل ہو جائے گی۔ سردار کو چونکہ بیٹے کے سلسلے میں تجربہ ہو چکا تھا لہٰذا اس نے ان صاحب کی ہدایات پر عمل کیا جس کے نتیجے میں دشمن کا قبیلہ گھیرے میں آ گیا اور یوں یہ قبیلہ جیت گیا۔ یہ لوگ واپس آئے اور فتح کا جشن منایا۔ جشن کے آخر میں سردار نے لوگوں سے کہا "بھائیو! ہمارے پاس جو مہمان ٹھہرا ہوا ہے وہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ مردِ عاقل ہے۔ میں Genuinely یہ Feel کرتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ یہ مردِ عاقل قبیلے کے سردار کے طور پر Qualify کرتا ہے۔ میں اس کے حق میں بخوشی Step down کر رہا ہوں اور اسے اپنی جگہ بٹھا رہا ہوں۔ اسے اپنے قبیلے کا سردار بنا لو۔"

یوں اس شخص کو علم بھی مل گیا اور دنیا بھی مل گئی۔ تب اُسے اپنے مرشد کی بات یاد آئی کہ تم انعام میں علم ہی مانگنا، کوئی اور چیز قبول نہ کرنا۔ اس طرح اُسے علم سے دونوں چیزیں عطا ہو گئیں۔ یہ کوئی من گھڑت قصہ نہیں ہے بلکہ ابھی نوے سال قبل ظہور پذیر ہونے والا سچا واقعہ ہے۔

اگر کوئی صاحبِ علم آپ کو سورۂ اخلاص یا کوئی بھی اسمائے مبارک پڑھنے کے لیے بتاتے ہیں کہ اس سے مختلف قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں تو اس سلسلے میں ایک بنیادی Key point یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ کوئی بھی عمل یا وظیفہ کرنے کے پیچھے نیت دنیاوی فوائد کا حصول نہ ہو۔ میں اس سے دولت حاصل کر لوں گا یا لوگوں کو Impress کر لوں گا۔ لوگ مجھے سلام کرنے لگیں گے۔ میری عزت کریں گے۔ یاد رکھیے کہ اس نیت سے کی جانے والی عبادت، عبادت نہیں رہے گی بلکہ ریاکاری بن جائے گی۔ پھر آپ کچھ حاصل نہیں کر پائیں گے۔ لیکن اگر اس کو بغیر لالچ اور طمع کے پڑھا تو بہت سی قوتیں عطا ہو جائیں گی۔ جس طرح سورۂ نمل میں آصف بن برخیا کے پلک جھپکنے میں تخت لانے کا واقعہ ہے۔ آصف بن برخیا یا حی یا قیوم کے عامل تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جب اس بارے میں پوچھا گیا "کیا یا حی یا قیوم اسم اعظم ہے" تب انھوں نے جواب تو نہیں دیا لیکن اسماء الحسنیٰ میں سے ایک اور لفظ عطا فرمایا "یہ پڑھ لیا کرو۔" یہ اسم

اعظم ہی ہے۔"

"یہ اسم اعظم ہی ہے۔" اس جملہ میں لفظ "ہی" ساری بات واضح کر دیتا ہے کہ اگر یہ اسم اعظم ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ فرماتے کہ یہ اسم اعظم ہی ہے۔ پھر وہ یہ فرماتے کہ یہ اسم اعظم ہے۔ دراصل یاحی یاقیوم اسم اعظم نہیں ہے، یہ اسم اسم اعظم کے بہت Close ہے۔

اسماء الحسنٰی میں سے تین چار اسم ایسے ہیں جو اسم اعظم تو نہیں ہے لیکن اسم اعظم کے بہت قریب چلے جاتے ہیں۔ جیسے یاحی یاقیوم، یا احد۔ یہ تقریباً 96,95 فی صد اسم اعظم کے قریب ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو اسم مبارک "یا ذالجلال والاکرام" عطا فرمایا تھا وہ بھی اسم اعظم سے بہت قریب ہے۔ اسی طرح "وھو الرحمن الرحیم" بھی اسم اعظم سے خاصا قریب ہے۔ یہ سب اسمائے مبارک اسم اعظم کے طور پر کام کرتے ہیں لیکن ان کا دائرہ اثر (Area of influence) اتنا وسیع نہیں ہے جتنا اسم اعظم کا ہے۔ یا ذالجلال والاکرام اگر ایک خاص وقت میں ایک مخصوص تعداد میں پڑھیں تو انسان کو لوگوں میں عزت ملنے لگتی ہے۔ ظاہر ہے جب عزت ملے گی تو اس کے اور بھی بہت سے کام ہونے لگیں گے۔

وھو الرحمن الرحیم کو اگر ایک مخصوص تعداد میں اور مخصوص اوقات میں پڑھا جائے تو انسان کے رُکے ہوئے کام ہونے لگتے ہیں۔ کوئی شخص آپ کو کسی بھی کام کے لیے انکار نہیں کرے گا۔

یاذالجلال والاکرام جلالی ہے جب کہ وھو الرحمن الرحیم Construction میں جمالی اور اثرات میں جلالی ہے۔ "یا احد" بے پناہ جلالی ہے۔ اگر یہ Suit کر جائے تو جس کام کے لیے پڑھا جائے وہ کام ہو جائے گا۔ اس کی بھی ایک مخصوص تعداد اور وقت ہے جو روح کی کیمسٹری اور لطافت کے حساب سے Man to man تبدیل ہو جائے گا۔ روح کی لطافت کے پیش نظر پڑھائی کی تعداد کم یا زیادہ ہو جائے گی۔

اسی طرح ایک اور وظیفہ ہے جو میں نہیں پڑھ سکتا۔ بعض اوقات زبردستی پڑھنے کی کوشش کی تو ایک دن آرام کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ دوسرے دن Turbulence شروع ہو جاتی ہے اور پھر Warning مل جاتی ہے کہ چھوڑتے ہو یا پھر سوٹی؟ (باقاعدہ ڈنڈا دکھایا جاتا ہے) اس لیے میں تین دن وہ وظیفہ پڑھ کر چھوڑ دیتا ہوں۔ میرا مقصد اس وظیفے کو پڑھ کر کوئی دنیاوی کام کروانا نہیں ہوتا۔

ایک روز عشاء کی نماز کے بعد گھٹنوں میں درد کی وجہ سے جا نماز سے اُٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سوچا وہ وقت جو یہاں فارغ بیٹھنا ہے کیوں نہ رب تعالیٰ ہی کو Disturb کیا جائے۔ آنکھیں بند کر کے دھیان رب تعالیٰ کی طرف کیا تو پتا نہیں دل میں کیا آیا، میں نے کہا "دیکھ باری تعالیٰ! میں تیرا بندہ ہوں۔ نیک کام بھی کیا نہیں، نہ ہی آئندہ کرنے کا کوئی امکان ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ بڑے سچے دل کے ساتھ تجھ کو رب مانتا ہوں اور اپنے آپ کو تیرا بندہ۔ آج سے اسی لمحے سے میں اپنے تمام معاملات کی فکر نہیں کروں گا۔ میں اپنے تمام معاملات (اپنی اولاد اور اپنی Family) آج سے تیرے سپرد کرتا ہوں۔ تو جانے اور تیرا کام جانے۔ مجھے یقین ہے کہ تو رحیم و کریم ہے۔ تو میرے تمام معاملات کو میرے بہترین مفاد میں حل کرے گا۔"

یہ کئی سال پرانی بات ہے۔ جب میں نے اپنے تمام مسائل گٹھڑی میں باندھ کے رب تعالیٰ کے حوالے کر دیے کہ یہ لے اب ان کو حل کرنا تیرا کام ہے۔ میں پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ اگر کبھی شیطان نے بہکا بھی دیا کہ فلاں کام اتنے عرصے سے نہیں ہو رہا یا فلاں کام بگڑ رہا ہے، فلاں جگہ نقصان ہو رہا ہے تو اللہ کا کرم ہے ایسا وسوسہ اور خیال آتے ہی میں نے فوراً لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا اور خود سے کہا کہ جب ایک چیز اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دی تو پھر پلٹ کر کیا دیکھنا۔

ابھی دنوں کا ذکر ہے کہ میں انڈسٹریل یونٹ لگا بیٹھا۔ معلوم نہیں کبھی آپ نے لیموں کا رس نکلتے ہوئے دیکھا ہے Squeezer میں یا نہیں؟ اس میں لیموں کو دونوں Sides سے Press کرتے ہیں تو اس کے عرق کا آخری قطرہ تک نکل جاتا ہے۔ ان دنوں میں بھی کچھ Squeezer میں آیا ہوا تھا۔ حالات کی تنگی کی وجہ سے ایک دن شیطان نے دل میں وسوسہ ڈال دیا۔ فوراً لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کہ یہ کیا شیطان کے بہکاوے میں آ رہے ہو۔ رات کو ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ دو ڈھائی بجے بیٹھے بیٹھے دل سے یہ بات نکلی "ٹھیک ہے تو مجھے فاقے سے مارنا چاہتا ہے تو مار لے۔ میرا کیا جائے گا۔ پھر تجھے ہی دُکھ ہوگا کیوں کہ تو میرا رب ہے۔" اس بات کے تیسرے دن ہی سے حالات بہتر ہو گئے۔ تین مہینے کے بعد مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ کن حالات سے گزر آیا ہوں۔ یوں اللہ تعالیٰ رحمت کر دیا کرتا ہے۔ ایسے میں دُنیاوی مقاصد کی تکمیل کے لیے وظیفہ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اُن اسمائے مبارک کا ذکر ہو رہا تھا جو اسم اعظم سے قریب تر ہیں۔ "یا بدیع العجائب بالخیر یا بدیع" یہ ذکر بھی بہت جلالی ہے اور اسم اعظم کے بہت قریب ہے اپنی Efficiency میں۔ اسم اعظم سے قریب ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان اسماء کے ذکر کے اثرات یا Influence اسم اعظم کے اثرات کے بہت قریب چلا جاتا ہے۔ یہاں میں آپ سے گزارش کروں گا کہ ان اسماء کو پڑھیے گا نہیں کیوں کہ آپ کو پتا نہیں چلے گا کہ آپ کی Body Chemistry کیا ہے؟ آپ کی روح کا Controlling word کیا ہے؟ کون سے اسماء آپ کے لیے Compatible ہیں، کون سے Neutral اور کون سے Unfavourable ہیں۔

میرے عقیدے کے لحاظ سے یہ جرم ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لیے کرنا شروع کر دوں کہ میرا کوئی دُنیاوی کام ہو جائے۔ اگر پڑھنا ہے تو اللہ کی محبت میں پڑھیے کہ یہ میرے رب تعالیٰ کا نام ہے۔ اگر اس محبت سے پڑھا تو بہت کچھ حاصل ہو جائے گا۔ بہت کچھ پا جائیں گے آپ اور اگر ضروری پڑھنا چاہیں تو پہلے کسی صاحب علم سے اس بارے میں پوچھ لیں۔ لیکن اس پڑھائی کے بعد کوئی دُعا مت کیجیے گا تاکہ کہیں آپ کی عبادت مزدوری نہ بن جائے۔

آپ کسی جگہ اینٹیں اٹھا کر اوپر کی منزل پر پہنچاتے ہیں۔ سارے دن کی محنت کے بعد آپ کو پچاس روپے معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ اب نہ آپ کا مالک پر کوئی احسان نہ مالک کا آپ پر کوئی احسان۔ آپ نے کام کیا اور اس نے آپ کو معاوضہ دے دیا۔ بات ختم ہو گئی۔

اگر آپ نے اس نیت سے رب تعالیٰ کی عبادت کی کہ میرا فلاں مسئلہ حل ہو جائے اور اس عبادت کے عوض مجھے فلاں چیز عطا ہو جائے تو گویا آپ نے مزدوری طے کر لی۔ رب تعالیٰ آپ کو وہ مزدوری فوراً دے دے گا کیوں کہ وہ کسی کا قرض نہیں رکھتا لیکن ذرا سوچیے آپ نے کیا پایا؟

اگر رب تعالیٰ کی محبت میں اسے یاد کیا..... تو مزدوری چھوڑ وہ انعام عطا فرمائے گا جو ہمیشہ مزدوری سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ کی قربت علیحدہ سے ملے گی۔ رب دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے اس لیے آپ رب تعالیٰ کو اس کی محبت میں یاد کیجیے اور پھر دیکھیے کہ کیا کچھ عطا ہوتا ہے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ اسم اعظم بتایا نہیں جاتا؟

جواب: اسم اعظم کا ادراک رب تعالیٰ کے انعام کے طور پر ہوتا ہے۔ جب رب تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے ایک مخصوص مقام تک انسان جا پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے اُس پر عنایات کرتا چلا جاتا ہے۔ اُسے علم عطا کرتا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک Stage پر جا کر اس صاحب علم پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ یہ اسم اعظم ہے۔ لیکن اس وقت صاحب علم ظرف کے اس بلند مقام پر ہوتا ہے کہ اُسے استعمال نہیں کر پاتا۔ اس فقیر کو شرم اور حیا آنے لگتی ہے کہ جو رب تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ میری ضروریات کو میرے بغیر کہے پورا کر دیتا ہے، جو میری ضروریات کا مجھ سے زیادہ خیال رکھتا ہے، اس رب کے ہوتے ہوئے میں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اسم اعظم بھلا کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔

کسی بھی صاحب علم کے لیے سب سے زیادہ طمانیت کا باعث یہ بات ہوتی ہے کہ اس پر علم کے راز کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اس پر بڑی بہت خوش ہوتا ہے کہ اسم اعظم اس کے علم میں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اسم اعظم کی گردان بھی نہیں کرتا۔ وہ تو اسے محض Routine میں پڑھتا ہے۔ جن سورتوں میں اسم اعظم ہے وہ ان سورتوں کو Routine میں پڑھتا ہے، بغیر رکے اور دیکھے کہ کب وہ اسم اعظم پڑھ کے آگے گزر گیا۔ اس کے نزدیک قرآن پاک کے تمام الفاظ اسم اعظم کی مانند مقدس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسم اعظم پر رکتا یا اٹکتا نہیں۔

یہاں سر ہنری فورڈ کی مثال Quote کرتے جانا ہوگا۔ وہ ساری عمر کنجوسی سے اپنا گزارہ کرتا رہا۔ وہ کھانے پر پیسے خرچ نہ کرتا تھا بلکہ لوگ Bin میں جو استعمال شدہ روٹی پھینک دیتے تھے، ہنری فورڈ وہ اٹھا کر کھا لیتا۔ یوں وہ اپنی ساری دولت جمع کرتا چلا گیا حتیٰ کہ آخری ایام عمر میں وہ دنیا کا امیر ترین شخص بن گیا۔ جب ہر سو اس کی امارت کا ڈنکا بج رہا تھا تو ایک روز اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی لوگوں کی طرح اچھا کھانا کھائے۔ وہ نیویارک کے سب سے اعلیٰ اور مہنگے ترین ریسٹورنٹ میں گیا اور بہترین کھانوں کا آرڈر دیا۔ لیکن جب انواع و اقسام کے کھانے اس کے سامنے میز پر چن دیے گئے تو اس کے معدے نے ان کھانوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یوں سر ہنری فورڈ کو بغیر کچھ کھائے بھاری بل ادا کر کے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

بعینہٖ جب انسان علم کے حصول کی طرف بڑھتا ہے تو ابتدا میں اسے اسم اعظم جان لینے کی بہت بے چینی

ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ علم کے اس بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسم اعظم اس کے علم میں آجاتا ہے لیکن تب وہ اسم اعظم کو استعمال کرنے کی سطح سے بہت اوپر جا چکا ہوتا ہے۔ تب ضمیر سوچتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا رب جو اتنا مہربان ہے کہ بغیر میرے مانگے اور کہے میری ضروریات پوری کر دیتا ہے ایسے مہربان رب کے ہوتے ہوئے میں اسم اعظم استعمال کروں تو یہ مقام شرم ہے۔ یوں وہ صاحب علم اسم اعظم معلوم ہونے کے باوجود اس کی تسبیح پڑھنے نہیں بیٹھتا۔

میں جب پہلی بار اپنے مرشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان دنوں میں صبح شام 40,42 وظائف کیا کرتا تھا۔ انھوں نے کہا "یہ سب کچھ پڑھنا چھوڑ دو۔" یہ سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا کہ میں تو بچپن سے یہ سب پڑھتا چلا آ رہا ہوں اور آج اتنے سالوں بعد یہ فرما رہے ہیں کہ یہ سب بے کار اور غلط ہے، چھوڑ دو۔ کیا کیا کمال کے وظائف تھے جو میں کیا کرتا تھا۔ مثلاً

ربی انی مغلوب فانتصر ، حسبنا الله ونعم الوکیل ، انا لله وانا الیه راجعون

میں نے مرشد صاحب سے رخصت چاہی۔ گاڑی میں بیٹھا سوچتا چلا جا رہا تھا کہ یار یہ کیسا انسان ہے۔ مجھے وہ سارے وظائف چھوڑنے کا حکم دے دیا جو قرآنی آیات پر مشتمل ہیں لیکن خیر چونکہ مرشد صاحب کا حکم تھا اس لیے وہ سب 40,42 وظائف ترک کر کے وہ ذکر کرنا شروع کر دیا جو انھوں نے مجھے پڑھنے کے لیے بتایا تھا۔ وہ پانچ حروف پر مشتمل دو الفاظ تھے۔ پڑھنے کی تعداد بمشکل پانچ سے سات بار بنتی تھی۔ حکم یہ تھا کہ وضو کے دوران وہ حروف پڑھوں۔ اب دن میں میں وضو دو بار کرتا یا پانچ بار۔ بس اسی دوران وہ پڑھ سکتا تھا۔ انھوں نے سختی سے مجھے تاکید کی تھی کہ ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد کوئی دعا نہیں مانگنی۔

کچھ مغربی تعلیم کا اثر تھا اور کچھ وہ زمانہ بھی جوانی کا تھا۔ دو دن تو میں نے وہ وظیفہ خاموشی سے حسب ہدایت کر لیا لیکن تیسرے دن دماغ میں آیا کہ دعا مانگ کر تو دیکھو ہوتا کیا ہے۔ لہٰذا میں نے اطمینان سے دعا مانگ لی۔ رات کو جب سویا تو دیکھا کہ جنت میں پہنچ گیا ہوں اور وہاں سیر کر رہا ہوں۔ اس میں مختلف چیزیں دیکھ کر میں نے بہت Enjoy کیا اور بہت خوش ہوا۔ صبح اٹھا تو بڑی بے چینی تھی کہ جا کر بڑے شاہ صاحب کو بتاؤں کہ جناب رات میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ آفس سے چھٹی کی اور ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور تفصیل بیان کی جسے سن کر وہ حیرت میں ڈوب کر کہنے لگے "ذرا پھر بتانا کہ کیا دیکھا۔" وہ تین بار انھوں نے مجھ سے وہ تفصیل Repeat کروائی۔ بعد میں احساس ہوا کہ وہ مجھے پرکھ رہے تھے کہ کہیں میں نے کسی سے سنی سنائی بات تو ان کے سامنے بیان نہیں کر دی۔ جب انھیں Confirm ہو گیا کہ میں نے واقعی ایسا کچھ دیکھا ہے تو وہ حالت کشف میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا اور فرمایا "تم نے دعا مانگی تھی؟" بس صاحب! وہ بگڑ گئے کہ جاؤ یہاں سے۔ اب کیا لینے آئے ہو۔ تمھیں میں نے کہا تھا کہ دعا نہیں مانگنی۔ سب کچھ کھو دیا تم نے۔

یوں بڑے باعزت طریقے سے میں وہاں سے نکال دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد میں دوبارہ ان کی خدمت

میں حاضر ہو گیا۔ اُنھوں نے مجھے معاف تو کر دیا لیکن معافی بھی اس طرح سے ملی کہ مجھے چکی پیسنے پر لگا دیا۔ دو لمبی لمبی سورتیں بتائیں کہ روزانہ عشاء کے بعد پڑھنی ہیں۔ ناغہ نہیں ہونے دینا۔ میرا خیال ہے کہ اڑھائی یا تین سال میں عشاء کے بعد بیٹھ کر ان سورتوں کی تلاوت کرتا رہا پھر کہیں جا کر معافی ملی اور معافی ملنے کا مجھے یوں پتا چل گیا کہ ایک دن مجھے کہنے لگے "فلاں دن تم اتنے بج کر اتنے منٹ پر آ جانا۔ وقت کا خیال رکھنا۔" میں نے کہا "ٹھیک ہے۔" میں مقررہ وقت سے تھوڑی دیر پہلے پہنچ گیا۔ اُنھوں نے گھڑی کلائی سے اُتار کر سامنے رکھ لی اور مجھ سے باتیں کرنے لگے لیکن نظر گھڑی پر تھی۔ جب وہ خاص وقت ہوا تو بولے "یہ وظیفہ پڑھ لیا کرو۔" یہ وظیفہ پہلے والے وظیفے سے بھی مختصر تھا۔ بہر حال پھر اللہ تعالیٰ نے بے پناہ عنایات فرمائیں۔ وقت گزر گیا۔ آخری دنوں میں جب اُنھوں نے مجھے خلافت عطا کر دی تھی اور مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ دُعا مانگ کر جو کچھ میں نے ضائع کیا تھا وہ دراصل اسم اعظم تھا۔ اُنہی دنوں ایک روز بڑے شاہ صاحب بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے جسارت کر لی "حضور! آپ نے پہلی بار جو وظیفہ مجھے دے کر دُعا نہ مانگنے کی تاکید فرمائی تھی، آپ نے جتنا علم سکھایا اور عطا کیا ہے اُس کے ذریعے دیکھوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ اسم اعظم تھا۔" اُنھوں نے اثبات میں سر ہلایا کہ ہاں وہ اسم اعظم ہی تھا۔ اس سے آگے میری اُن سے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی دوبارہ جی چاہا کہ میں وہ الفاظ پڑھوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس طرح صبر دے دیا کہ آج تک دل میں یہ ملال نہیں آیا کہ میں وہ اسم اعظم پڑھ کر کچھ حاصل کر لیتا۔

تصوف کے بنیادی پروٹوکولز

تصوف کو سیکھنے کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں۔ اگر تو اسے بطور علم سیکھنا ہے تو پھر اس کی Prerequisites پوری کیے بغیر بھی اس پر بات ہو سکتی ہے لیکن اگر تصوف کو اس لیے سیکھنا ہے کہ اس پر عمل کیا جا سکے تو پھر اس کی Prerequisites پوری کرنا ضروری ہیں۔ آج سے بیس پچیس برس قبل ایک مشہور رائٹر نے مجھے خط لکھا تھا "تصوف کا حاصل کیا ہے؟ اس کا فائدہ کیا ہے؟" میں نے انھیں جواب میں ایک خط لکھا جس کا عکس انھوں نے اپنی ایک مشہور کتاب میں بھی شائع کیا۔ میں نے ان کی خدمت میں یہی گزارش کی تھی "صاحب! تصوف کا بذات خود کوئی فائدہ نہیں ماسوائے اس کے کہ چونکہ شریعت پر عمل کرنا خاصا دشوار ہے، اس میں کئی ایسے سخت مقام آجاتے ہیں جہاں انسان کے پاؤں اکھڑنے لگتے ہیں۔ تصوف ایک Training ہے کہ جس کے ذریعے انسان کے لیے شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ تصوف انسان کو شریعت پر عمل کرنے کے لیے ذہنی و جسمانی طور پر تیار کر دیتا ہے۔ شریعت پر پوری طرح عمل کرنے میں ہمارا اپنا آرام مانع ہو سکتا ہے کہ تہجد کی نماز کے لیے اٹھنا دشوار ہے، فجر کی نماز کے لیے وقت پر آنکھ نہیں کھلتی۔ تصوف ایک طرف تو اس حوالے سے Training کرتا ہے اور شریعت پر عمل کرنا آپ کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف تصوف میں آپ کا اپنا کچھ ہے ہی نہیں، سب کچھ لوگوں کا ہے۔ آپ لوگوں کے لیے اپنے آرام کو تج دیتے ہیں۔ چونکہ آپ کا آرام اپنے لیے نہیں ہے اس لیے آرام کی قربانی دینا آپ کی عادت بن جاتی ہے۔ ایسے میں راتوں کو جاگنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری دینا کچھ مشکل نہیں رہتا۔

لالچ، بد دیانتی اور امانت میں خیانت پر اکسا سکتا ہے۔ شریعت پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان امانت دار ہو، سچا ہو، دیانت دار ہو۔ ان تینوں چیزوں خصوصاً دیانت داری اور امانت داری میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ لالچ اور طمع و حرص ہے۔

چونکہ تصوف میں انسان صرف دیتا ہے، لیتا کچھ نہیں۔ جب دینا ہی عادت ٹھہری تو وہاں بجائے لالچ کے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس انسان میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہو وہ لالچ میں نہیں آتا۔ انسان

دوہی صورتوں میں جھوٹ بولتا ہے۔ لالچ کے تحت اور خوف کے تحت۔ تصوف میں تو انسان رب تعالیٰ سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے اور دل میں یہ خواہش رہتی ہے کہ جس سے میں ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں اُس سے ملاقات کب ہوگی؟ وہ موت کے انتظار میں رہتا ہے۔ پس جو شخص موت کے انتظار میں ہو، خوف اُس کے قریب سے بھی نہیں گزرتا۔ اس لیے وہ نہ ہی خوف کے تحت جھوٹ بولے گا نہ لالچ میں آئے گا۔ اس طرح تصوف کے ذریعے شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔''

یہ سب باتیں کہنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ میں بدھ کے روز کراچی میں دعا کے لیے بیٹھتا ہوں۔ وہاں ایک میجر صاحب ایک لیفٹیننٹ کرنل کا پیغام لے کر آئے جس پر مجھے افسوس ہوا کیوں کہ ان لیفٹیننٹ کرنل کے نام کے ساتھ چشتی صابری لگا ہوا تھا۔ انھوں نے خاص طور پر مجھے پیغام بھجوایا کہ میں بھی سلسلہ چشتیہ صابریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ درخواست یہ ہے کہ گورنمنٹ نے مجھے ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی ٹرانسفر کرنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔

میں نے اُن صاحب سے عرض کی ''صاحب! آپ دو طرح سے غلطی کر رہے ہیں۔ تصوف کے بنیادی Protocol کے مطابق جب آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تو ہوتا یوں ہے کہ اوپر ایک رجسٹر موجود ہے جو Scroll کہلاتا ہے۔ جو بھی کوئی شخص کسی کو اپنا مرشد مانتا ہے، اس کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے تو بیعت کرنے والے کا نام اُس Scroll میں اس کے مرشد کے نام کے نیچے لکھ دیا جاتا ہے۔ باقی تمام رشتے موت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں لیکن بیعت کا رشتہ ایسا ہے جو روزِ محشر تک قائم رہتا ہے۔ یہ صرف اُسی وقت ختم ہوگا جب حساب کتاب شروع ہوگا۔ اس لیے جب بیعت کرنے والا شخص کسی اور ولی اللہ کے پاس جا کر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے یا کسی اور ولی اللہ سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اُسے فائدہ نہیں ہوتا کیوں کہ اس کا نام تو کسی اور مرشد کی فہرست میں لکھا ہوا ہے۔ اس لیے تصوف کا بنیادی Protocol یہ ہے کہ جب انسان کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لے اور اُسے اپنا مرشد مان لے تو دیگر اولیا اللہ کی عزت بھی کرے، اُن کی خدمت بھی کرے لیکن مدد کے لیے اپنے مرشد کے علاوہ کسی سے درخواست نہ کرے۔ یہ Protocol ہے۔''

'مدد' سے مراد یہ نہیں کہ جناب مجھے دس روپے دے دیجیے بلکہ روحانیت میں مدد یہ ہے کہ علم سیکھا جائے اور دعا کے لیے صرف اپنے مرشد سے عرض کریں۔ چونکہ وہ لیفٹیننٹ کرنل صاحب اس بنیادی پروٹوکول کی خلاف ورزی کر رہے تھے اس لیے میں نے اُن سے کہا کہ مجھے تو کوئی مشکل نہیں ہے دعا کرتے میں لیکن چونکہ آپ نے کسی اور کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہے اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ مجھ سے دعا نہ کروائیں بلکہ اپنے مرشد صاحب کے پاس چلے جائیں۔

یہاں ایک بنیادی نکتہ اُٹھ سکتا تھا کہ جناب میرے مرشد صاحب تو انتقال کر گئے ہیں۔ (انھوں نے یہ نہیں کہا لیکن میں ایک Possibility پر بات کر رہا ہوں تا کہ یہ نکتہ آپ کے ذہنوں میں Clear ہو جائے۔) ایسی صورت میں یہ کہنا کہ آپ کے مرشد اگر واقعی ولی اللہ تھے اور آپ کا اُن کے ساتھ بیعت کا تعلق ہے تو کوئی

بہتری نہیں کہ آپ کی ان کے ساتھ Communication نہ ہو پائے۔ یاد رکھیے کہ جب کبھی آپ اپنے مرشد سے ملیں گے اور بیعت کریں گے تو پہلے دن وہ آپ کو ایک پڑھائی دے گا۔ وہ اصل میں آپ کی پڑھائی کی Key note ہے۔ جب آپ کو اپنے مرشد کے ساتھ Communicate کرنا ہو تو اطمینان سے کسی ایسے وقت میں جب آپ بالکل پُرسکون ہوں اور ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہو فرض نماز پڑھیں۔ پھر دو نفل اپنے مرشد صاحب کے ایصالِ ثواب کے لیے پڑھیں اور ان کی طرف توجہ کر کے بیٹھ جائیں اور وہاں درخواست دائر کریں کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔ آپ کو جواب مل جائے گا خواہ اسی وقت ملے یا بعد میں۔

اگر آپ رُوحانی لطافت کے بلند مقام پر ہیں تو اسی وقت جواب مل جائے گا ورنہ پھر خواب یا القاء کی صورت میں جواب آ جائے گا۔

یہ تصوف کے بنیادی Protocols ہیں۔ یہ رویہ درست نہیں کہ بیعت کرنے کے باوجود میں مدد کے لیے جگہ جگہ جاؤں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرا نکتہ اس میں یہ تھا جو میں نے ان لیفٹیننٹ کرنل صاحب سے کہا کہ صاحب آپ نے ماشاءاللہ بیعت کی ہے اور یقیناً آپ کے مرشد بڑے ولی اللہ ہوں گے، صاحبِ علم ہوں گے۔ انھوں نے آپ کو ایک سبق پڑھایا ہوگا کہ رب تعالیٰ ہمارا مالک و آقا ہے۔ وہ مختارِ کل بھی ہے۔ رب تعالیٰ کو ہم بہت عزیز ہیں۔ اتنے عزیز کہ ہماری ماں اس محبت میں رب تعالیٰ کے کہیں قریب بھی نہیں پہنچتی۔ آپ کے مرشد صاحب نے آپ کو یہ بھی سکھایا ہوگا کہ رب تعالیٰ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ کی ٹرانسفر ہو رہی ہے اور یہ فیصلہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کے باوجود آپ اس ٹرانسفر کو رکوانے کے لیے دنیاوی کوشش بھی کر رہے ہیں اور دعا بھی کروا رہے ہیں لیکن فیصلہ آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا۔ آپ ٹرانسفر رکوانے کے لیے بضد ہیں۔ یہ سرکشی نہیں تو اور کیا ہے؟ آقا کے حکم کو ماننے سے پہلو تہی اور اس کو Avoid کرنے کے حربے آپ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ کیسی غلامی ہے کہ آقا کہتا ہے کہ فلاں جگہ چلے جاؤ اور آپ اور ہم سفارش ڈھونڈ رہے ہیں کہ یہ سلسلہ روک دیا جائے۔ پھر یہ کیسا ایمان ہے کہ رب جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ہم اپنی عقل پر بھروسا کر کے کہہ رہے ہیں کہ میرا یہاں رہنا بہتر ہے۔ دوسری جگہ جانا غلط ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ (معاذ اللہ) رب تعالیٰ نے آپ کے لیے غلط فیصلہ کیا ہے اور آپ رب تعالیٰ کے فیصلے پر نہ صرف بداعتمادی ظاہر کر رہے ہیں بلکہ اپنے آقا کے فیصلے پر انگلی اٹھا رہے ہیں۔ یہ کیسی غلامی کر رہے ہیں آپ؟

غلامی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے فیصلے کو ہنسی خوشی مان لیا جائے کہ ٹھیک ہے میرے رب تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ میں نئی جگہ پر اس اعتماد کے ساتھ جاؤں گا کہ میرا مالک میرے لیے جو کچھ بھی فیصلہ کرے گا وہ میرے بہترین مفاد میں ہوگا اور میرے لیے اس سے بہتر کوئی اور فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے مرشد نے آپ کو یہ نہیں سکھایا تو انھیں میرا ایک Message دے دیں کہ آپ کو حکم دیں کہ آپ چھ ماہ کی چھٹی لیں اور وہ اپنی خانقاہ پہ آپ سے لوگوں کے جوتے سیدھے کروائیں تا کہ آپ کو یہ Training مل جائے کہ مالک کا حکم کیسے مانتے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے جب یہ واقعہ ہوا تب یوم عاشور کو گزرے ہوئے کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بتائیں آپ کا کیا خیال ہے کہ حضرت امام حسینؓ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا انجام کیا ہوگا؟ اگر آپ روحانی علم پڑھ بھی جائیں صرف تاریخ کو ہی دیکھ لیں تو جب آپؓ مکہ سے تشریف لے چلے تھے تو لوگوں نے اُس وقت آپؓ کو سمجھایا تھا۔ آپؓ نے قرآن پاک سے فال نکالی تو اُس کا جواب یہ آیا تھا کہ اس سفر کا انجام موت ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مکہ سے روانگی کے وقت انھیں معلوم تھا کہ اُن کی شہادت کا وقت آن پہنچا ہے۔ آپؓ اُسی وقت اس ساری صورت حال کو Avoid کر سکتے تھے۔ اس کے بعد جب یزیدی فوج تعاقب کر رہی تھی تو بیعت کرنے کے کئی مواقع ملے۔ عقل تو یہی کہہ رہی تھی کہ ہم بہت کم ہیں اور یزیدی فوجیں زیادہ ہیں لہٰذا مصلحت کا یہی تقاضا ہے کہ Clash کو Avoid کر لیا جائے لیکن آپؓ نے بڑے سکون کے ساتھ سفر جاری رکھا اور حق کے راستے پر کربلا کی جانب گامزن رہے۔

آپ میں سے اکثریت صاحب اولاد ہے۔ ذرا اندازہ تو لگائیں کہ میدان جنگ میں اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہاتھ سے تیار کر کے بھیجنا، خیمے کے باہر بیٹھ کر اُن کی شہادت کا نظارہ کرنا اور اُن کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر لانا۔ اسی طرح باری باری سب عزیزوں اور رشتہ داروں کو شہید ہوتے دیکھنا، اُن کی لاشیں اٹھانا اور پھر آخر میں خود میدان جنگ میں جانا یہ سب بڑے دل گردے کی بات ہے۔

یہ اُس وقت ہوتا ہے جب انسان عین الیقین کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے اپنے رب تعالیٰ کے فیصلے کو مانتے ہوئے شہادت کو بخوشی تسلیم کر لیا اور اپنے اہل خانہ کی شہادت کو بھی رب تعالیٰ کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا اور آپ ایک Transfer کو تسلیم نہیں کر پائے۔ اسے رکوانے کے لیے بے پناہ قسم کی بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ اگر آپ تصوف کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں تو آپ کو رب تعالیٰ کو اپنا آقا ماننا ہوگا۔ صرف زبان سے نہیں بلکہ دل سے بھی اُسے آقا ماننا ہوگا۔ ایسے یقین کے ساتھ اُسے آقا ماننا ہوگا کہ اُس کی طرف سے آنے والی کسی بھی مصیبت، ذلت اور آفت پر بھی ہمارے ماتھے پر بل نہ آئے بلکہ ہنستے کھیلتے ہوئے ہم اُس تکلیف اور ذلت و مصیبت سے گزر جائیں۔

اس ٹرانسفر کے سلسلے میں تیسری بات اُن صاحب سے میں نے یہ کہی کہ صاحب آپ سے Intellectual dishonesty سرزد ہو رہی ہے۔ کیوں کہ جب آپ نے گورنمنٹ سروس جوائن کی تھی تو آپ نے جس Agreement سائن کیا تھا اُس پر واضح طور پر درج تھا کہ گورنمنٹ آف پاکستان آپ کو کہیں بھی کسی بھی وقت ٹرانسفر کر سکتی ہے۔ جب آپ اپنی Free-will پر اس Agreement کو تسلیم کر چکے ہیں تو اب آپ معاہدے کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے ہیں۔ فقیر تو کبھی معاہدہ نہیں توڑتا تا وقتیکہ دوسری پارٹی خود وہ معاہدہ نہ توڑ دے۔ یہ حدیث بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ آپ ﷺ کا حکم ہے کہ آپ اپنے معاہدے سے کبھی نہ پھریں جب تک کہ دوسرا فریق اُس سے مکر نہ جائے۔ فتح و فائدہ اسی میں ہے۔

یہ مثال جو میں نے آپ کو دی ہے یہ کسی ایک آدمی کی مثال نہ سمجھیے گا۔ یہ تو ایک Case Study ہے جس کو

بتانے کا مقصد یہی ہے کہ تصوف کی راہ پر چلنے کی Prerequisites میں سے بنیادی چیز Total submission ہے۔ جب انسان کو کوئی فیصلہ درپیش ہو تو اپنی عقل اور سمجھ کو پوری طرح بروئے کار لائے۔ فیصلہ کر گزرے اور اُس کا رزلٹ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ پھر جو بھی Result اُس بارگاہ سے ملے اُسے قلبی خوشی تسلیم کرلے۔

کچھ لوگ مالی تنگ دستی میں چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ ہائے ہائے کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ (معاذ اللہ) رب تعالیٰ اپنے بندے کو دُکھ دے کر خوش ہوگا، قطعاً ایسا نہیں۔ جس طرح جسم کے کسی حصے میں پیپ پڑ جائے، ناسور ہو جائے تو ڈاکٹر بڑی بے دردی سے اُس حصے کو کاٹ دیتا ہے۔ وہ اُس زخم پر نشتر چلاتا ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ ڈاکٹر بڑی بے دردی سے یہ سب کر رہا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ وہ انسان کی بہتری کے لیے نشتر چلا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح مالی تنگی ہماری بہتری کے لیے ہوتی ہے۔ جتنی شدید مالی تنگی اور دیگر مشکلات ہوں اُن کے بعد ملنے والا انعام اُتنا ہی بڑا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ انعام دیتا ضرور ہے۔ اس لیے ہم ان کڑے دنوں کو بجائے واویلا اور ہائے ہائے کر کے گزارنے کے کیوں نہ ایسے وقار اور تمکنت کے ساتھ گزار لیں کہ ہمارے قریبی لوگوں کو بھی پتا نہ چلے کہ ہم کن حالات میں زندہ ہیں۔ یہی شکر گزاری ہے۔

تصوف کی راہ پر چلنے کے لیے جذبہ شکر گزاری بہت ضروری ہے اور اس مقام تک آنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ اپنے اندر تھوڑی سی Clarity of concepts لائیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں مجبورِ محض پیدا نہیں کیا۔ اُس نے اچھا اور بُرا سب ہم پر واضح کر دیا اور اس کے بعد اُس نے ہمیں اختیارات بخشے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جہاں ہم بھٹکنے لگتے ہیں وہاں وہ اپنی Veto power استعمال کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ماں اپنے بچے کو کھیلنے کی اجازت تو دیتی ہے لیکن آگ سے کھیلنے سے منع کرتی ہے۔ جیسے ہی بچہ چولھے میں جلتی آگ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، ماں اُسے روک لیتی ہے۔ بعینہٖ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اختیارات تو عطا فرمائے ہیں لیکن ایک حد پر جا کر وہ Veto power استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے تک ہم آزاد ہیں۔ ہمارے ہاں ایک نیا سلسلہ چل نکلا ہے کہ ہم دو، چار سال کے بچے کو بھی دُعا کرنے والوں یا تعویذ کرنے والے پیر صاحبان اور عامل حضرات کے پاس لے جا رہے ہوتے ہیں کہ جناب یہ بچہ ہمارا کہنا نہیں مان رہا، اس کو دم کر دیں۔ بچوں کی پرورش ہم پر فرض ہے۔ جو کام ہمیں خود کرنا چاہیے وہ ہم دم اور دُعا کے ذریعے کروانا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہم خود بھی بے عملی کی راہ اختیار کرتے ہیں اور بچے کو بھی انجانے میں بے عملی کی طرف راغب کرتے ہیں اور اُس کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ محنت کی کیا ضرورت ہے۔ جب امتحان ہوں گے تو جا کر دُعا کروا لوں گا۔

مسئلہ یہی ہے کہ بہت ساری چیزوں کے حوالے سے ہمارے Concepts clear نہیں ہیں۔ ہمیں علم ہونا چاہیے کہ رب تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا فرض کیا ہے؟ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اور وہ Line کہاں Draw ہوتی ہے جہاں ہمیں اپنے معاملات رب تعالیٰ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ تصوف کی راہ پر چلنے کے لیے ہمیں

Dos اور Do nots کا علم ہونا چاہیے۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ بہترین روزی وہ ہے جو آپ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائیں۔ نذر، نیاز، ہدیے لینے سے اجتناب کیجیے۔ محنت کر کے کمایئے۔ خود بھی کھایئے اور اپنی Family کو بھی پالیے۔ اپنے دوستوں کی بھی خدمت کیجیے۔ یہی صحیح راہ ہے۔ یاد رکھیے! رب کی غلامی کے یہی آداب ہیں کہ جدوجہد کرنے کے بعد رب تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی بھی نعمت یا زحمت کو ہم بڑی خوش دلی سے قبول کریں۔ اپنے رب تعالیٰ کی ہر عطا کو سینے سے لگائیں خواہ وہ کسی زخم کی اذیت ہی کیوں نہ ہو۔

راہِ سلوک میں گائیڈ کی اہمیت

جب میں نے گورنمنٹ سروس چھوڑی تو کینٹ میں دی گئی گورنمنٹ کی رہائش گاہ بھی واپس کرنا پڑی۔ وسائل زیادہ نہیں تھے اس لیے موجودہ وسائل میں رہتے ہوئے علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع یہ گھر خریدا۔ اس گھر میں ڈرائنگ روم کا جو Dining Area تھا اس حصے میں Dark colour carpet بچھا ہوا تھا اور دروازے کے قریب کا کونا میری عبادت کا ٹھکانا تھا۔ والدہ صاحبہ نے بھی جب نماز پڑھنا ہوتی تو وہ اس جگہ آ کے نماز پڑھ لیتی تھیں۔ اُن دنوں ایک عجیب Experience ہوا کہ جب بھی میں Official tour پر جاتا تھا تو Carpet کے اوپر گیلی لکیریں دکھائی دیتیں۔ کارپٹ کا رنگ گہرا ہونے کی وجہ سے وہ لکیریں بہت واضح نظر آتیں۔ جیسے کوئی بیل Urinate کرتا ہوا سڑک سے گزرتا ہے تو ایسی Zigzag لائنیں ہوتی تھیں۔

ٹور سے جب بھی میری واپسی ہوتی تو یہ لائنیں موجود ہوتیں اور ان سے بڑی بُری Smell آیا کرتی۔ بہت ہی Strong smell۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہے کیا؟

ایک روز قبلہ بڑے شاہ صاحب میرے ساتھ اس گھر میں تشریف لائے۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ واردات جو پڑھائی کے سلسلے میں میرے ساتھ پیش آ رہی تھیں اُن کا ذکر میں قبلہ بڑے شاہ صاحب سے کر رہا تھا تب اسی ضمن میں مجھے یہ بات بھی یاد آ گئی۔

میں نے اُن سے کہا ''حضور! ایک بات سمجھ نہیں آ رہی۔ میں جب بھی Overnight کہیں باہر ٹور پہ جاتا ہوں تو یہ جو سامنے Carpet ہے اس پر گیلی لکیریں ہوتی ہیں۔'' میری بات سن کر انھوں نے دریافت کیا ''کیا تم نے یہ گھر حال ہی میں خریدا ہے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں!'' فرمانے لگے ''رہائش'' کے نقطہ نظر سے یہ کچھ زیادہ اچھی جگہ نہیں ہے۔ اس کے باہر والی دیوار کی بنیادوں میں جنات کا ٹھکانا ہے۔ دوسرے یہاں تمھیں شیطان تنگ کرتا ہے۔ جب تم یہاں ہوتے ہو تو پڑھائی ہوتی رہتی ہے۔ اس پڑھائی اور عبادت کی وجہ سے وہ تمھیں تنگ نہیں کر پاتا۔ تمہارے چلے جانے کے بعد چونکہ یہاں عبادت کم ہوتی ہے اس لیے وہ پیشاب کر جاتا ہے۔ وہ تم سے اسی طرح بدلے نکالتا ہے۔ اس طریقے سے بدلے لے کر وہ تمھیں تنگ کرتا ہے۔'' میں نے پوچھا ''اب اس کا کیا حل ہے؟'' بولے ''بس ہو گیا حل۔ آج کے بعد یہ سب نہیں ہوگا۔'' یہ سن 1979 یا

1980ء کا ذکر ہے۔ اس روز کے بعد سے اب تک کبھی دوبارہ ایسا نہیں ہوا۔

اسی طرح میرے ساتھ ایک اور ایسا سلسلہ ہے کہ جب بھی کوئی بڑی مشکل آنے والی ہوتی ہے یا میں کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوتا ہوں تو اس سے چند روز قبل میں ایک خواب دیکھتا ہوں۔ (ورنہ عموماً میں رات کو خواب نہیں دیکھتا کیوں کہ رات کو سوتا نہیں۔ البتہ صبح کی نماز کے بعد جب سوتا ہوں تو جو خواب دیکھتا ہوں وہ بالعموم سو فی صد سچے ہوتے ہیں۔) اس اکثر دکھائی دینے والے خواب میں میں دس محرم کا جلوس دیکھتا ہوں جس میں ماتم ہو رہا ہوتا ہے۔ جتنی بڑی مصیبت ہو گی اسی نسبت سے ماتم دکھائی دے گا۔ اگر بڑی مصیبت آنے والی ہے تو چھریوں اور زنجیروں والا ماتم دکھائی دیتا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ خواب دیکھنے کے بعد میں کسی پیر صاحب کے پاس گیا ہوں کہ بتائیں میں کیا کروں؟

یہ حقیقت ہے اور میرا اس پر ایمان ہے کہ راحت اور مشکل اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر اچھا وقت میں گزارتا ہوں تو مشکل وقت میری جگہ کوئی دوسرا تھوڑی گزارے گا۔ اس لیے میں خود سے کہتا ہوں کہ آرام سے بیٹھو۔ مشکل آئے گی اور گزر جائے گی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس روز دوران گفتگو میں نے بڑے شاہ صاحب سے اس خواب کا بھی تذکرہ کیا۔ تب انھوں نے فرمایا کہ دیوار کی بنیادوں میں مقیم جنات کی وجہ سے تمھیں متوقع مشکلات کی خبر اس انداز میں ملتی ہے۔

اس بار بدھ کو کراچی میں ایک پڑھی لکھی خاتون جو کسی وڈیرے کی بیوی ہیں دعا کے لیے آئیں تو انھوں نے ایک سوال پوچھا "شاہ صاحب دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی آپ کے بارے میں بہت تجسس رہتا ہے۔ میں نے کسی صاحب سے آپ کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کہا کہ ایسے لوگوں کے پاس جانا حرام ہے کیوں کہ ایسے لوگ کے پاس جنات ہوتے ہیں۔ جنات اوپر آسمان پر جاتے ہیں اور وہاں ہونے والی گفتگو سن کر ان کو خبر کر دیتے ہیں۔ یوں یہ لوگوں کو کچھ باتیں بتا دیتے ہیں۔" یہ ساری بات کرنے کے بعد وہ خاتون کہنے لگیں "شاہ صاحب میں جاننا یہ چاہتی ہوں کہ کیا آپ کے پاس آنا واقعی حرام ہے؟"

چونکہ سوال میری ذات سے متعلق تھا اس لیے Obviously اس کا جواب بڑا سیدھا سا تھا۔ "بی بی بالکل حرام ہے۔ آپ کو نہیں آنا چاہیے۔" میرے اس جواب پر ان خاتون نے کہا "چلیے مان لیا کہ حرام ہے، نہیں آنا چاہیے مجھے یہاں لیکن یہ تو بتا دیجیے کہ جنات سے جو گفتگو سن کر آپ ہمیں بتاتے ہیں وہ کیسے سنتے ہیں؟" میں نے کہا "چونکہ اب علم سے متعلق سوال آپ نے کر دیا ہے اس لیے دعا کے بعد میں آپ کو اس سوال کا جواب دوں گا۔"

انھوں نے باہر جا کر دوسرے لوگوں کو بھی بتا دیا۔ یوں کافی لوگ دعا کے بعد بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے انھیں Explain کیا کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ میرے پاس آنا حرام ہے۔ آپ میرے پاس تشریف نہ لائیے۔ لیکن آپ کے سوال کا جو علمی پہلو ہے وہ میں واضح کر دیتا ہوں کہ System کیسے کام کرتا ہے۔

دعا کے بارے میں کوئی بھی Statement دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جس آدمی کے پاس آپ دعا کے لیے گئے وہ آپ کو مستقبل کی خبر دے رہا ہے یا آپ کے لیے دعا کر رہا ہے۔ اگر اس نے دعا کی ہے اور اس کے بعد آپ سے کہہ رہا ہے "جاؤ اللہ آپ کا یہ کام کر دے گا" تو اس میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اگر وہ آپ کو مستقبل کی خبر دے رہا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اس کو ماننے سے انکار کر دیجیے کیونکہ مستقبل کی پیش گوئیاں کروانا اور کسی نجومی کے پاس جا کر مستقبل کا حال جاننا غلط ہے۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

اگر وہ شخص آپ کے وسیع رزق کے لیے اللہ کے حضور دعا کر رہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کے دعا کرنے کا انداز یہ ہو کہ چونکہ اس کو اپنے رب تعالیٰ پر بہت بھروسا ہے اور اس بھروسے کی بنیاد پر وہ آپ سے کہے "جاؤ! اللہ تمہیں بہت رزق عطا فرمادے گا۔" دعا کے اس انداز کے پیچھے اپنے رب تعالیٰ پر بے پناہ اعتماد اور یقین پوشیدہ ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ صاحبِ دعا یہ کہنے کے بجائے "اللہ تعالیٰ تمہیں بہت رزق عطا فرمائے" یوں کہہ دے "جاؤ میاں اللہ تمہیں بہت رزق عطا فرمادے گا۔" یہ بھی دعا کا ایک طریقہ ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دعا کرنے والے شخص کو دعا کی Confirmation مل رہی ہے۔ وہ دعا کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کے حضور "تیرا یہ بندہ مشکل میں ہے اور میرے پاس آیا ہے تو اس پر اپنی رحمت نازل فرمادے، اس پر رزق وسیع فرما دے۔" دعا کے بعد اس صاحبِ دعا کو چونکہ قبولیت کا اشارہ مل رہا ہوتا ہے اس لیے وہ آپ سے کہتا ہے کہ بے فکر ہو کر جایئے اللہ تعالیٰ جلد ہی آپ کو وسیع رزق عطا فرمائے گا۔ ایسی دعا کی کسی صورت ممانعت نہیں۔

دعا کروانا آپ ﷺ اور صحابہؓ سے ثابت ہے۔ صحابہ کرامؓ نے مختلف کاموں کے سلسلے میں آپ ﷺ سے دعا کروائی ہے۔

دعا کے سلسلے میں یہ واضح کر دوں کہ اس کے کئی مدارج ہیں۔ کسی شخص کی دعا کا یہ مقام ہو سکتا ہے کہ وہ سجدے میں گر کر کئی گھنٹوں تک گڑگڑاتا رہے۔ ماتھا رگڑ کے دعا کرے تو تب وہ قبول ہو ــــ یا اس شخص کے علم کا ایک مقام ہے جہاں انعامات اس صورت میں عطا ہوتے ہیں کہ انسان سجدے میں گر کر، گڑگڑا کر دعا مانگے تو دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ابتدائی مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ جس آدمی پر اس سے بھی زیادہ رحمتیں کیے ہوتا ہے ایسا انسان ہاتھ اٹھا کر ایک ہی بار دعا مانگتا ہے تو اس کی دعا مستجاب ہو جاتی ہے۔ یہ سیکنڈری مقام ہے۔ اس کے بعد کا مقام یہ ہے کہ کسی شخص پر رب تعالیٰ کی رحمتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ شخص صرف دل میں ہی دعا کرتا ہے۔ بغیر ہاتھ اٹھائے، بغیر سجدے میں گڑگڑائے، خاموشی سے اس کا دل رب تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے اور وہ دعا کرتا ہے "یا اللہ! تیرا یہ بندہ میرے پاس آ گیا ہے۔ تو میرا بھرم رکھ لے اور اپنے اس بندے کی ضرورت پوری کر دے۔ اپنی رحمت کے صدقے اس پر رحم فرمایا۔" ایسا شخص عموماً آپ کو باقاعدہ طور پر دعا کرتا دکھائی نہیں دے گا۔ پھر اس سے اگلا دعا کا مقام یا درجہ وہ ہے کہ جس میں انسان مستجاب الدعوات ہو چکا ہوتا

ہے۔ ایسا بندہ رب تعالیٰ کو صرف سوچتا ہے اور اس کا یہ سوچنا ہی دعا بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ اللہ کے حضور مستجاب ہوتی ہے اور رب تعالیٰ محض اس کے سوچ لینے پر ہی اس کی دعا قبول کرتا اور اپنی رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ اس سے اگلا دعا کا مقام وہ ہے کہ جس میں صاحبِ دعا صرف آنکھ اٹھاتا ہے اور رب تعالیٰ اس بندے پر اتنا مہربان ہوتا ہے اور اس کو اس قدر اپنے قریب کیے ہوتا ہے کہ اس کے محض آنکھ اٹھانے سے ہی اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرما لیتا ہے اور اپنی رحمت نازل فرماتا ہے۔ درحقیقت یہ وہ مقام ہے جس کا ذکر رب تعالیٰ نے حدیثِ قدسی میں کیا ہے کہ "جب میں اپنے بندے کو محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کی سماعت ہو جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ سنتا ہے، اس کی بصارت ہو جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ کوئی چیز پکڑتا ہے، اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو ضرور عطا کرتا ہوں۔" (صحیح بخاری، حدیث نمبر 6337)

یہ وہ مقام ہے جہاں دوئی ختم ہو کر یک جائی میں بدل جاتی ہے۔ اب ایسا آدمی نہ تو زبان ہلاتا دکھائی دیتا ہے نہ مراقبے میں نظر آتا ہے اور نہ ہی اس کے دعا کرنے کا پتا چلتا ہے۔ اس کے پاس کوئی انسان گیا اور جا کر دعا کے لیے درخواست کی۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر اوپر عرش کی طرف دیکھ لیا تو دعا قبول ہو گئی اور لوگوں کے کام ہو گئے۔

دعا میں ایک اور مقام وہ ہے کہ جہاں انسان علم کے اس درجے پر چلا جاتا ہے کہ وہ صاحبِ دعا زبان سے جو کہہ دے رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے وہ پورا فرما دیتا ہے۔ اس مقام پر فائز انسان صاحبِ امر کہلاتا ہے۔ اس مقام پر جا کر بعض اوقات ایسی رحمت ہوتی ہے، رب تعالیٰ اتنی عنایات فرما دیتا ہے اپنے بندے پر خوش ہو کر کہ اس کو دعا کی قبولیت کا اشارہ ملنے لگتا ہے۔ دعا کا جواب آنے لگتا ہے۔ ادھر اس نے دعا کی ادھر اس کا جواب مل گیا اور اس نے آپ سے کہہ دیا "جاؤ میاں! اللہ تمہارا کام کر دے گا۔" اب وہ صاحبِ امر تو اپنے ایک خاص رنگ، ترنگ اور لے میں بیٹھا ہے "جاؤ میاں! ہو جائے گا کام۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کر دے گا۔" یہ سن کر سامنے بیٹھا شخص سوچتا ہے کہ شاید یہ شخص مستقبل کی پیش گوئی کر رہا ہے۔

یہ تو علم کے مقامات ہیں۔ اسی طرح جب انسان اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلتا ہے، تصوف کی راہ پر چلنا چاہتا ہے یا روحانیت حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے تو اپنے آپ کو ایک خاص رنگ میں ڈھالتا ہے، جس کا یہاں بار بار ذکر ہوتا رہا ہے اور اس خاص رنگ کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ وہ خلقِ خدا کے لیے مہربان ہو جاتا ہے۔

لفظ مہربان بہت وسیع المعانی ہے۔ یہ صرف ایک یا دو جہتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر ہر طریقے سے خلقِ خدا کو Accommodate کرنے کا نام مہربانی ہے۔ جب کوئی خلقِ خدا کے لیے مہربان ہو جاتا ہے تو اللہ اس بندے پر مہربان ہو جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیتا ہے۔ اسے اپنی قربت سے نوازتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ شخص عبادت گزار بھی ہو تو حتی الوسع کوشش کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کے

احکامات کی پابندی کرے۔ تب حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے اس Combination کے جواب میں اللہ تعالیٰ اس آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کر لیتا ہے۔ اس پر مہربانی فرماتا ہے۔ تب انعامات کی بارش کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ کوئی شخص ٹرین میں بیٹھ کر اسلام آباد جا رہا ہے تو لاہور سے روانہ ہوتے ہی اس کو ریلوے لائن کے دونوں اطراف میں آبادی اور کارخانے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ٹرین ذرا آگے نکلتی ہے تو منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ کھیتوں اور فیکٹریوں کا ایک Combination دکھائی دیتا ہے۔ کھیتوں کے اندر جگہ جگہ فیکٹریاں قائم ہیں۔ دھواں اٹھ رہا ہے اور لوگ آ جا رہے ہیں۔ Production ہو رہی ہے۔ ٹرین مزید آگے بڑھتی ہے۔ منظر تبدیل ہوتا ہے اور تاحد نگاہ صرف کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف ہریالی اور درخت ہیں۔ سفر کے دوران اسے پہاڑ، دریا اور دیگر مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح جب انسان تصوف کا سفر شروع کرتا ہے تو اسے مختلف چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور مختلف حالات و واقعات اس کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ابتدا میں اسے کچھ غیر مرئی چیزیں مثلاً جنات وغیرہ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ان سے گفتگو ہونے لگتی ہے۔ اگلی Stage پر انسان کو عجائبات عالم نظر آنے لگتے ہیں اور اس سے بھی اگلے مرحلے میں اسے دوسرے جہانوں کی کچھ جاندار چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں جو ہمارے ہاں پائی جانے والی مخلوق سے ذرا مختلف شکل کی ہیں۔ پھر انسان اس مقام سے بھی آگے گزر جاتا ہے اور صدیوں پہلے دنیا سے رخصت ہو جانے والی جید ہستیوں سے اس کی ملاقات ہونے لگتی ہے۔ اس سے اگلے مقام پر مختلف پیغمبروں سے ملاقاتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ مختلف خوشبوؤں سے واسطہ پڑتا ہے۔ پھر وہ مقام آ جاتا ہے کہ جہاں انسان کھلی آنکھوں سے چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ انسان کمرے میں بیٹھا ہوتا ہے تو احساس ہوتا ہے جیسے کوئی برق رفتاری سے دروازے کے پاس سے گزرا ہے۔ انسان نماز پڑھتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کوئی اور بھی نماز پڑھ رہا ہے۔ انسان اگر اونچی آواز میں قرآن پاک پڑھ رہا ہو تو اس کی آواز کے ساتھ اور آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ وہ چلتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ تمام مختلف واردات ہیں۔ جو پہلی صورت ہے اسے مشاہدہ کہتے ہیں۔

اسی دوران جب انسان مالی تنگی سے گزر رہا ہوتا ہے تو کچھ عرصے کے بعد اس کو دست غیب حاصل ہو جاتا ہے۔ جس میں اس کو کہیں دروازے پر پڑے ہوئے یا پھر تکیے یا جانماز کے نیچے سے پیسے ملنے لگتے ہیں۔

اگر انسان ان تمام مشاہدات اور وارداتوں کا ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے خاموشی سے انھیں اپنے اندر جذب اور برداشت کرے اور کسی سے ان کا ذکر نہ کرے تو ان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آدمی مزید آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر کشف جاری ہو جاتا ہے اور اس کشف میں وہ Real (اصلی) حالتوں میں چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کارخانہ قدرت کی سیر کرنے لگتا ہے۔ جاگتی اور کھلی آنکھوں سے۔ بالکل ایسے جیسے

آپ حقیقت میں جن ان کو سمجھتے ہیں۔

جنات بالکل ابتدائی Stage میں دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر انسان کا کوئی مرشد یا Guide نہیں ہے تو وہ انہی کے اسرار اور مزے میں کھو کر وہیں رُک جائے گا اور سمجھنے لگے گا کہ شاید یہی انتہا ہے۔ میں اپنی منزل پر آ گیا۔ وہ انہی میں کھو کر جنات سے دوستی کر بیٹھتا ہے۔ لیکن اگر اسے ایک کامل Guide میسر ہے تو وہ اسے رُکنے نہیں دے گا اور ہاتھ پکڑ کر اسے اس مقام سے آگے لے جائے گا ورنہ بہت بڑی اکثریت آپ کو اسی مقام پر ٹھہری ہوئی ملے گی۔ جیسے ٹنگمرو میں ایک صاحب تھے نواز صاحب۔ جب وہ روحانیت کی راہ پر چلے تو جنات سے گفتگو ہونے لگی۔ وہ اسی مقام کے ہو کر رہ گئے اور آگے نہیں بڑھے۔ وہ تینوں جنات میں سے ایک سے بہت انوکھا کام لیا کرتے۔ وہ جب بھی اپنی Pajero سے سفر کرتے تو خود پچھلی نشست پر براجمان ہو جاتے اور جن گاڑی چلاتا۔ دیکھنے والوں کو گاڑی بغیر کسی ڈرائیور کے چلتی نظر آتی اور یوں نواز صاحب کی خود بخود پبلسٹی ہو جاتی۔ ایک مرتبہ تو ایک دو سارجنٹ تیز رفتاری کی وجہ سے اُن کے پیچھے موٹر سائیکل پر دوڑے لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ گاڑی بغیر کسی ڈرائیور کے چل رہی ہے تو خوف سے بے ہوش ہو کر گر گئے۔

نواز صاحب میرے پاس دو تین بار تشریف لائے۔ ایک دوہرا قتل ہوا جس کی وجہ سے پولیس پر وزیر اعظم صاحب کا بہت Pressure تھا۔ پولیس نواز صاحب کے پاس چلی گئی کہ آپ ہمیں قاتل پکڑوا دیں ہم آپ کو ایک لاکھ روپے دیں گے لیکن نواز صاحب نے زیادہ رقم کا مطالبہ کر دیا۔ پولیس چونکہ پھنسی ہوئی تھی کیوں کہ وزیر اعظم صاحب نے 24 گھنٹے کا ٹائم دے رکھا تھا اس لیے پولیس نے کوئی ساڑھے سات لاکھ روپے نواز صاحب کو دیے اور انھوں نے اپنے جنات کی مدد سے قاتل پکڑوا دیے۔ پھر یہ ہوا کہ ایک ہی ہفتے بعد پولیس نے ان پر چوری کا مقدمہ ڈال دیا اور انھیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا اور دوگنا پیسہ لے کر انھیں رہا کیا۔

یہ واقعہ سنانے کا مقصد یہ تھا کہ بعض اوقات انسان اصل راہ سے بھٹک کر اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتا ہے کیوں کہ اسے بتانے والا کوئی نہیں ہوتا یا پھر وہ کسی کی سنتا ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگ جنات کی طرح پریوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ لاہور میں بھی ایک خاتون پریوں سے کام لیتی رہی ہیں لیکن اب کافی عرصے سے ان سے رُوحانی طور پر ملاقات نہیں ہوئی۔

ایک زمانہ تھا جب مجھے ابھی کشف و کرامات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت مجھے مزارات دیکھنے کا بڑا شوق ہوتا تھا۔ جنڈانوالہ کے پاس ایک جگہ ہے چنڈی شیخ موسیٰ کے نام سے۔ ایک بہت ہی نیک انسان شیخ محمد موسیٰ بنو عباس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر عرب سے ہجرت کر کے اس علاقے میں پہنچے۔ تب یہ علاقہ ایک جنگل تھا جس میں انھوں نے ڈیرے ڈال لیے۔ چونکہ اللہ کے نیک بندے تھے اس لیے ان کے ارد گرد آبادی ہو گئی اور ان کے نام پر اس آبادی کا نام چنڈی شیخ موسیٰ رکھا گیا۔ وہیں ان کا مزار بھی ہے۔ میری ان سے

صرف ایک بار ملاقات ہوئی اور وہ ملاقات بھی کشف میں ہوئی تھی۔ ان کے Descendents میں ایک بہت اچھے بزرگ تھے ۔۔۔۔ سید مختار شاہ ہاشمی۔ ان سے میری ملاقات ایام جوانی میں ہوئی۔ انھوں نے مجھے بیٹا بنایا ہوا تھا۔ میں نے ایک روز ان سے کہا "حضور! مجھے موکل دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ مجھے اس سے کوئی کام نہیں کروانا۔ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ موکل ہوتا کیسا ہے؟" انھوں نے مجھ سے کہا "یہ ایک لفظ پڑھ لو۔ جب رات کو نماز اور دوسری عبادات سے فارغ ہو جاؤ تو سوتے وقت اسے علیحدہ کمرے میں پڑھنا۔" میں اگلے روز اپنے معمولات سے فارغ ہو کر جب حسب عادت جا نماز پر سونے کے لیے لیٹا ہوا تھا تو میں نے کوئی آٹھ یا دس بار ابھی وہ لفظ پڑھا ہوگا کہ اچانک مجھے گوشت کے جلنے کی بو آنے لگی۔ بڑی تیز بو تھی۔ اس Smell کے ساتھ ہی موکل صاحب تشریف لے آئے۔ میں تو زمین پر لیٹا تھا۔ وہ آئے اور میری دائیں طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ جھک کے مجھے دیکھ رہے تھے اور میں نیچے لیٹا ہوا آرام سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے کہا ہوگا کہ عجیب شخص ہے مجھے کوئی کام کیوں نہیں بتاتا۔ اگر کوئی کام نہیں تھا تو بلایا کیوں؟ تھوڑی دیر بعد وہ اسماحت مانگ کر چل دیئے۔ مجھے شغل مل گیا۔ جب جی چاہتا اپنی دلچسپی کے لیے پڑھ لیتا تھا۔ وہ بے چارہ آکر کھڑا ہو جاتا اور کسی حکم کا انتظار کرتا رہتا۔ تین راتیں میں اس کو مسلسل بلاتا رہا۔ چوتھی رات میں نے وہ لفظ پڑھا۔ لیکن موکل نہیں آیا۔ مجھے وجہ سمجھ نہ آئی۔ جب میری سید مختار شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں سارا ماجرا سنایا جس پر وہ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں گئے۔ پھر سر اٹھایا اور مجھ سے پوچھا "کیا آج کل آپ نے کوئی نیا وظیفہ شروع کیا ہے؟" میں نے کہا "جی!" بولے "کیا پڑھتے ہو؟" میں نے کہا جناب بسم اللہ الرحمن الرحیم کا وظیفہ شروع کیا ہے۔" کہنے لگے "کمال کرتے ہیں آپ بھی ۔۔۔۔ ہاتھ میں دو دھاری تلوار لیے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ موکل آپ کے قریب آجائے۔ یہ وظیفہ چھوڑیں گے تو موکل قریب آئے گا۔" پھر وہ پوچھنے لگے "یہ وظیفہ کس نے بتایا آپ کو؟" میں نے کہا "بس دل میں آیا تو میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔" وہ بولے "بیٹا! یہ تو دو دھاری تلوار ہے۔" میں نے وہ وظیفہ جاری رکھا۔ ایک روز بیگم صاحبہ کہنے لگیں کہ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے سوالیہ انداز میں دیکھا تو انھوں نے ٹیوب لائٹ کی طرف اشارہ کیا جو بار بار خود بخود جل اور بجھ رہی تھی۔ پھر میں نے پنکھے پر نظر ڈالی تو ٹیوب لائٹ تو جلنے لگی لیکن پنکھا بند ہو گیا۔ پنکھے سے نظر ہٹا کر AC پر ڈالی تو AC نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں جس چیز پر بھی نظر ڈالتا ہوں وہ رک جاتی ہے۔ مجھے ایک کھیل مل گیا۔ میں گاڑی لے کر باہر نکلا تو ایک سائیکل والا لڑکا سڑک پر جا رہا تھا۔ میں نے بڑے مزے سے اس پر نظر لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ غریب زور لگا رہا ہے اور سائیکل کھڑی ہے۔ یوں کھیل تماشا مل گیا مجھے۔ اگلے دن ایک صاحب میرے پاس آئے اور بڑے شاہ صاحب سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ بڑے شاہ صاحب سے اجازت لے کر میں ان صاحب کو ان کے پاس لے گیا۔ ہم وہاں بیٹھے تو مرشد صاحب پوچھنے لگے "کھانا کھاؤ گے؟" میں نے کہا "جی کھاؤں گا۔" (اس وظیفہ میں پرہیز یہ تھا کہ بڑا گوشت، مچھلی جس کی Smell ہو، کیا لہسن، پیاز، مولی یا دوسری Smell والی چیزیں

نہیں کھا سکتے۔ بڑے شاہ صاحب نے شیلف میں سے ایک چھوٹی دیگچی اٹھا کر سالن گرم کیا اور پلیٹ میں انڈیل دیا۔ بازار سے روٹیاں بھی منگوائی جا چکی تھیں۔ میں نے پلیٹ میں سالن کو بڑے غور سے دیکھا۔ اب یہ تو ہمت تھی نہیں کہ میں ان سے پوچھ لیتا کہ یہ کیا پکایا ہے۔ مجھے خدشہ صرف یہ تھا کہ یہ بڑا گوشت نہ ہو کیوں کہ قبلہ شاہ صاحب گائے کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

لیکن کھانے کو بغور دیکھنے کے بعد مجھے لگا کہ جیسے وہ مسور کی دال ہو۔ لہٰذا میں نے بڑے مزے سے جونہی نوالہ منہ میں رکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ گائے کا قیمہ تھا اور اسی وقت مجھے لگا کہ میرا وزن پچاس فی صد بھی نہیں رہ گیا۔ فوراً اندازہ ہو گیا کہ جو کچھ بھی کمایا تھا وہ سب چلا گیا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کر بڑے شاہ صاحب میرے اس دوست سے کہنے لگے "لوگوں کا کیا پوچھتے ہو بھائی۔ انھیں معلوم تو ہوتا نہیں کہ کون سی چیز کیا ہوتی ہے۔ بس پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جب اس پڑھائی کے اثرات آتے ہیں تو ان اثرات سے کھیل کر خوش ہوتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کتنا نقصان دہ ہے۔"

یوں شاہ صاحب نے اس وظیفے کے اثرات سے صاف کر کے مجھے واپس بھیجا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ویسے ہی کشف و کرامات عنایت فرما دیں۔

یہ سارا واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بعض اوقات انسان پر جو کیفیات طاری ہو جاتی ہیں ان کے بارے میں اسے پتا نہیں چلتا کہ وہ اس کے لیے سود مند ہیں یا نقصان دہ۔ وہ خوش ہوتا ہے کہ میں بہت Powerful ہو گیا کہ رب تعالیٰ نے مجھے یہ قوت دی ہے لیکن بعض اوقات وہ قوتیں درست نہیں بھی ہوتیں۔ یاد رکھیے! ایسے ہی موقعوں پر آپ کا Guide کام آتا ہے۔ وہ آپ کو خود بخود ان چیزوں سے دور کرتا رہتا ہے۔

سوال: راہِ سلوک میں کن چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

جواب: ہر شخص ولی اللہ بننا چاہتا ہے، علم روحانیت حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی Prerequisites پوری کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں کچھ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

مثلاً ہم کسی ڈاکٹر، وکیل یا صاحب دعا کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں کوشش کریں کہ ہم کم سے کم وقت لیں تاکہ کسی کو ہماری وجہ سے انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کا احساس کرنے کی ہماری یہ ادا رب تعالیٰ کو اتنی زیادہ بھا جائے کہ وہ ہم سے اس ایک بات کی وجہ سے راضی ہو جائے اور ہمارے اس رویے کی وجہ سے ہماری بہت سی مشکلات کو آسانیوں میں بدل دے۔ سات آلائشیں ایسی ہیں جن کا دھونا انتہائی ضروری ہے۔ خود غرضی، غصہ، کینہ، بغض، حسد، بخل، انتقام۔ ان آلائشوں کو دھوئے بغیر انسان فقیری کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان سات آلائشوں کو دھونے کے لیے ستر صدقات دینا پڑتے ہیں۔ یہ صدقات ہم اندر ہی اندر دیتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے گھر میں شادی ہو یا موت حتیٰ کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے بھی راستہ روک دیا جاتا ہے حالاں کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ راستے میں کھڑے نہ ہو تا کہ دوسروں کا راستہ نہ رُکے۔ لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ جب ہم اس فرمان کی حامل ہستی آپ ﷺ کی سالگرہ کا جشن مناتے ہیں تب بھی اس فرمان کو نظر انداز کرتے ہوئے راستہ روکنے سے گریز نہیں کرتے۔

ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں محتاط رہنے سے انسان فقر کے راستے پر چل نکلتا ہے۔

باادب ـــ بانصیب

مرشد سے محبت...... حصولِ علم اور رب کے قرب کا ذریعہ

ایک زمانے میں بغیر یہ جانے کہ اس ورد یا وظیفے کے میری رُوح یا مثالی جسم پر کیا اثرات مرتب ہوں گے بغیر کسی صاحبِ علم سے پوچھے خود اپنی مرضی سے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بہت جلد اثرات مرتب ہوئے اور میرے جسم سے ایسی Vibrations نکلنے لگیں جن سے چلتی ہوئی چیزیں رُک جاتی تھیں۔

اصل میں بسم اللہ الرحمن الرحیم بہت ہی Powerful ذکر ہے۔ یہ اپنی اصل میں جلالی ہے۔ اس کو پڑھنے میں بہت ادب آداب کی ضرورت رہتی ہے۔ کچھ Aspects میں اس کے اثرات جمالی بھی ہیں۔

"بسم" کی ب، س اور م میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ پہلا حرف "ب" رب تعالیٰ کی تخلیق کی صفت اور قدرت سے متعلق ہے۔ مختلف اولیائے کرام نے اس کی توجیہہ اپنے اپنے انداز میں بیان کی لیکن بنیادی نچوڑ اور مطلب سب کا ایک ہی رہا کہ "ب" رب تعالیٰ کی تخلیق کرنے کی قدرت اور صفت کو Depict (ظاہر) کرتا ہے۔ "س" رب تعالیٰ کی ثنا اور اس کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ "م" رب تعالیٰ کے غفور الرحیم ہوتے، اس کے معاف کر دینے اور بخش دینے کی قدرت و صفت کو Depict (ظاہر) کرتا ہے۔

یہ سب علم کی باتیں ہیں جنہیں سیکھنے سے پہلے ادب کا قرینہ سیکھنا بہت ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے "علم حاصل کرنے سے پہلے لازم ہے کہ علم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والا انسان باادب ہو جائے۔"

جناب ابو عبداللہ بلخیؒ ایک بہت بڑے ولی اللہ تھے۔ آپ نے فرمایا "علم حاصل کرنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ انسان ادب کا قرینہ سیکھ لے۔" حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا "اگر مجھے کسی صاحبِ علم کے بارے میں پتا چلے کہ وہ تمام گزرے ہوئے علوم اور تمام آنے والے علوم سے بھی زیادہ علم رکھتا ہے تو مجھے ان

سے نہ ملنے کا دکھ نہیں ہوگا۔ ان کی محفل میں نہ بیٹھنے کا دکھ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کسی شخص کے بارے میں یہ پتا چل جائے کہ وہ ادب کا پابند ہے تو ایسے شخص سے نہ ملنے کا دکھ مجھے بے پناہ ہوگا۔"

ایسا آدمی جو باادب ہے اور تمام آداب کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے وہ کبھی تہی دامن نہیں رہتا۔ تمام علوم (دینی، دنیاوی، روحانی) کو حاصل کرنے کا بنیادی اصول ادب و احترام ہی ہے۔ جب تک آپ کتاب کا ادب نہیں کریں گے، استاد کا ادب نہیں کریں گے، سکول، کالج کے Rules and Regulations کا ادب نہیں کریں گے، ان کو Respect نہیں دیں گے، تب تک آپ کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ مجھے یاد ہے جب ہم بہت چھوٹے تھے۔ شاید کلاس ون یا ٹو میں پڑھتے تھے۔ اس وقت اگر کتاب زمین پر گر جاتی تو بڑے بزرگ ہم سے کہتے تھے کہ کتاب کو زمین سے اٹھا کر پہلے چومو پھر اس کو رکھو۔ درحقیقت کتاب کو چومنے سے کچھ نہیں ہوتا، لیکن یہ دراصل ان بزرگوں کا ہمیں ادب کا قرینہ سکھانے کا انداز تھا۔ چونکہ کتاب سے ہمیں علم ملتا ہے اس لیے اسے احترام دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح ہمارے بزرگ ٹیچر کا بے پناہ ادب کرواتے تھے۔

روحانیت میں بھی جتنے صاحبانِ علم گزرے ہیں ان سب کا کہنا یہ تھا کہ اگر انسان کچھ نہ سیکھے، کچھ نہ کرے، صرف باادب ہو جائے تو سب کچھ پا سکتا ہے۔

ایک بار میرے مرشد صاحب بہت موڈ میں بیٹھے تھے۔ گفتگو کے دوران Suddenly بڑے جوش میں فرمایا "میاں امتحنوں کا کیا ہے۔ فتحیں تو ان میلے کپڑوں کے ڈھیر سے بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ (ان کے میلے کپڑے ایک کونے میں رکھے تھے، ان کی طرف اشارہ کیا۔) بات تو یہ ہے کہ انسان کو علم حاصل ہو۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لیے تم ہمارا نام ہی جپتے جاؤ۔" پھر فوراً کہنے لگے "تم ہمارا نام بھی کیوں جپو، ہم سے بس پیار کیے جاؤ منزل پر پہنچ جاؤ گے۔"

چونکہ اس وقت میرے ذہن پر مغربی تعلیم کا غلبہ تھا اس لیے اس بات نے بڑا Upset کیا کیوں کہ ہم سمجھتے تھے کہ دل میں غیر اللہ کی محبت کیسے پائی جا سکتی ہے۔ دل میں تو ایک ہی محبت رہ سکتی ہے۔ رب تعالیٰ کی محبت یا غیر اللہ کی محبت۔ دو محبتیں کبھی بھی ایک ساتھ دل میں نہیں رہ سکتیں اور ایسے میں مرشد صاحب فرما رہے تھے کہ تم ہمارا نام ہی جپتے جاؤ۔ میں نے دل میں سوچا یہ تو شرک ہے۔ میں ایک غیر اللہ کا نام کیسے جپنا شروع کر دوں۔ ان کے نام کی تسبیح کیسے پڑھ لوں۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کی کمی ہوتی ہے اور علم کی یہ کمی بہت سے رنگ دکھاتی ہے۔ ہم اپنی کم علمی کی وجہ سے چیزوں کو سطحی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی گہرائی کا اندازہ ہی نہیں کر پاتے۔ اس کم علمی کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارے دماغ میں یہ خیال اور یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ میں بھی کم علم تھا اس لیے میں نے سمجھا کہ مرشد صاحب نے مجھے شرک کا سبق دے دیا ہے کہ ان کے نام کی تسبیح پڑھوں۔ یہ تو مجھے اللہ کی محبت سے ہٹا کر اپنی محبت کی طرف لگا رہے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انکشاف ہوا کہ انہوں نے تو بہت گہری بات کی تھی۔ میں اس بات کو قدم بہ قدم Read کرتے ہوئے اوپر جا

رہا تھا۔ درحقیقت اس بات کو اوپر سے نیچے کی طرف Read کرنا چاہیے تھا۔ اوپر والے Step کو Read کرتے ہوئے جب میں نیچے والے Step پر آتا تو اس بات کی ابتدا ہو جاتی کہ جس انسان کا میں اور آپ احترام اور ادب کرتے ہیں اور اسے اپنے آپ سے بڑا اور Superior جانتے ہیں، اس کے لیے ہمارے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔

Out of that love, respect and affection ہم اس انسان کو Idealise کرنے لگتے ہیں۔ جب ہم کسی کو Idealise کرتے ہیں تو اس کے انداز اور طور طریقوں کی نقل کرتے ہیں اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے لگتے ہیں۔ اگر وہ شخص صحیح منزل کی طرف جا رہا ہے تو آپ بھی صحیح منزل پر پہنچ جائیں گے۔ مثال کے طور پر اگر مجھے کراچی جانا ہے تو میں کسی ایسے شخص کے Footprints کو Follow کرنا شروع کر دوں گا جو کراچی گیا ہوا ہے تو میں خود بخود بغیر راستہ جانے، بغیر کسی Effort کے کراچی جا پہنچوں گا۔ اگر وہ شخص جسے میں Idealise کر رہا ہوں وہ صاحبِ علم اور اللہ کا مقرب ہے تو اس کے طور طریقوں کو Copy کرنے کے بعد میں Automatically رب تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہو جاؤں گا۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ فرض کریں میں کسی فقیر کو Idealise کرتا ہوں۔ فقیر اور درویش بہت متواضع ہوتے ہیں۔ (متواضع سے مراد یہ نہیں ہے کہ جب آپ فقیر سے ملنے جائیں گے تو وہ دنیا بھر کی نعمتیں آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دے گا۔ تواضع سے مراد پذیرائی ہے۔ وہ آپ کو بڑی خوشی دلی سے Welcome کرتا ہے۔ آپ کو اتنی محبت اور عزت دیتا ہے اور اتنی اپنائیت سے ملتا ہے کہ گویا آپ سے زیادہ اس کو کوئی عزیز ہی نہیں اور آپ سے زیادہ دنیا میں اس کے لیے کوئی قابلِ احترام نہیں ہے۔) فقیر متواضع ہونے کے ساتھ ساتھ بہت Humble بھی ہوتا ہے۔ وہ آپ کے سامنے بچھ بچھ جائے گا۔ اگر آپ کسی فقیر کو Idealise کرتے ہیں تو آپ اس کے طور طریقوں کو نقل کریں گے۔ اس کی تمام خوبیوں اور اندازِ مہمان نوازی کو اپنائیں گے۔ غرض یہ کہ زندگی کے تمام معاملات میں آپ اس فقیر کو Copy کرنے لگیں گے۔ وہ فقیر تو پہلے ہی اپنے آپ کو آپ ﷺ کی سنت کے رنگ میں رنگ چکا ہوتا ہے۔ یوں آپ بہت آسانی سے سنت کو Copy کرنے لگیں گے۔ جب آپ نے سنت کو اپنا لیا تو پھر رب تعالیٰ کے بھی قریب ہو گئے۔ یوں فقیر یا مرشد سے محبت آپ کو رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ تک لے جانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جو مرشد صاحب مجھے سمجھا رہے تھے۔

مثال کے طور پر فقیر بہت سخی ہوتا ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ سب کے لیے حاضر ہے۔ اگر آپ کسی فقیر کو Idealise کرتے ہیں تو آپ بھی سخی ہو جائیں گے اور سخی رب تعالیٰ کو بہت عزیز ہوتا ہے۔ درویش آدمی کبھی جھوٹ نہیں بولتا، فریب نہیں کرتا اور صاف گوئی سے کام لیتا ہے۔ Straightforward اور Upright ہوتا ہے۔ یہی تمام خوبیاں آپ میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس طرح آپ رب تعالیٰ کے بھی قریب ہو گئے اور خلقِ خدا میں بھی بڑے عزیز ہو جائیں گے۔ ہر آدمی آپ کی عزت کرنے لگے گا۔ مرشد

صاحب کے ان جملوں میں حکمت یہی تھی کہ چپ چاپ ہم سے محبت کرتے جاؤ، اپنی منزل کو پہنچ جاؤ گے۔

فقیر بہت باادب ہوتا ہے۔ جس کسی سے ایک لفظ بھی سیکھ لے ساری عمر اس کا احترام کرتا ہے۔ اگر آپ گرو سے علم لینے کے لیے نکلے ہیں اور آپ کی خواہش ہے کہ علم آپ کو بڑی تیزی سے ملے تو آپ اپنے دل کو آئینے کی طرح چمکا کر رکھیے۔ کسی شخص کے خلاف کوئی کینہ، کدورت، کوئی نفرت آپ کے دل میں نہ رہ جائے۔

یاد رکھیے! جب کسی شخص کے لیے آپ کے دل کے اندر کوئی کینہ، بغض، کدورت، نفرت، دشمنی، مخالفت یا رنجش رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ وہاں سے نکل جاتا ہے اور علم بھی وہاں نہیں رہتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے دل کو آئینے کی مانند چمکا کر رکھا جائے۔ اپنے اندر یہ عادت Develop کر لیجیے کہ دوسرے آدمی کے قصور کرنے سے پہلے ہی اس کا قصور معاف کر دیجیے۔ یہ جملہ آپ کو شاید تھوڑا سا بے وقوفی والا لگے گا (It may sound stupid) دراصل میں سمجھانا یہ چاہتا ہوں کہ جب کسی شخص سے کوئی غلطی ہوتی ہے، کوئی قصور یا کوتاہی ہوتی ہے تو بجائے یہ سوچنے کے کہ اس آدمی نے میرے ساتھ یہ دھوکا کر دیا، مجھے دکھ دیا، تکلیف دی، دغا دیا، میری جڑیں کاٹ دیں، میرے خلاف سازش کر دی، جونہی آپ کے علم میں یہ بات آتی ہے تو فی الفور اپنے آپ کو یہ سمجھا دیں کہ کوئی بات نہیں وہ بے چارہ بھی تو میری طرح انسان ہے۔ میرے اندر تو لاکھوں خامیاں اور کوتاہیاں ہیں، کیا ہوا اگر اس میں ایک کوتاہی ہے۔ کیا ہوا جو بحیثیت انسان اس سے ایک غلطی ہو گئی۔

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب سے ایک آٹھ سالہ بچے (یہ بچہ آگے چل کر خود بھی صاحب علم ہوا) نے سوال پوچھا "ایک مسلمان اور کافر میں کیا فرق ہے؟" مولانا اشرف علی تھانوی چونکہ صحیح معنوں میں صاحب علم تھے اس لیے انھوں نے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق جواب دیا۔ انھوں نے عالمانہ گفتگو کے بجائے نہایت آسان لفظوں میں مومن اور کافر کا فرق سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹا! ایک مومن اور کافر میں بس اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا کہ ایک اچھے اور بُرے انسان میں۔ بُرا آدمی جب کسی کو نیکی کرتے دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ اس میں ضرور اس کا کوئی ذاتی مفاد چھپا ہے۔ اس کے برعکس اچھا آدمی جب کسی بُرے آدمی کو گناہ یا غلط کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ فلاں آدمی میں یہ عیب ہے یا اس نے فلاں گناہ کیا ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ بے چارے سے غلطی ہو گئی۔"

جب کوئی انسان آپ کو ستائے، آپ کو دکھ دے تو بجائے یہ کہنے کے کہ اس نے میرے ساتھ بہت بُرا کیا، میں تو ہمیشہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا رہا، اس کے ساتھ بڑی نیکی کیا کرتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کیا گناہ کیا تھا جو پلٹ کے اس نے میرے ساتھ اتنا بُرا کیا۔ آپ فوراً اپنے دل کو سمجھائیں کہ وہ بے چارہ بھی تو انسان ہے۔ آخر لوگ مجھے بھی تو برداشت کرتے ہیں۔ میرے اندر کتنی کوتاہیاں اور خامیاں ہیں۔ ایک کوتاہی اس سے ہو گئی تو کیا ہوا۔ یوں آپ کا دل پُرسکون ہو جائے گا۔ اس کو معاف کر دینے سے آپ کا دل

صاف ہو جائے گا۔ اس لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ دوسروں کو غلطی کرنے سے پہلے معاف کر دیں تاکہ آپ کے دل میں اس حوالے سے کوئی دکھ یا ملال نہ رہے۔ جب کوئی دکھ اور ملال ہی نہیں ہوگا تو شکوے اور شکایتیں بھی پیدا نہیں ہوں گی۔ آپ کا دل ہمیشہ آئینے کی طرح صاف رہے گا اور اس میں ہر ایک کے لیے صرف پیار اور خلوص ہوگا۔ ایسے دل میں علم بڑی جلدی گھر کرتا ہے۔ ایسے دل میں رب تعالیٰ رہنے لگتا ہے۔

جو جملہ مرشد صاحب نے فرمایا تھا ''ہم سے پیار کرتے جاؤ خود ہی منزل کو پہنچ جاؤ گے'' وہ تو بہت کمال کا جملہ تھا۔

It was gold in worth.

لیکن میں اپنی کم فہمی کی وجہ سے اس کی گہرائی تک نہ پہنچ سکا اور یہی سمجھا کہ مجھے شرک کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

گفتگو کے آغاز میں 'با ادب ہونے' کا ذکر ہو رہا تھا۔ با ادب ایسے مت ہوئیے کہ اس کا اظہار آپ صرف ظاہری طور پر کرنے لگیں۔ یاد رکھیے! جو کچھ آپ کا دل اور دماغ سوچتا ہے، وہ چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے چہرے سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا لیکن ان کی آنکھیں بتا دیتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی آنکھیں بھی نہیں بتا پاتیں لیکن Body Langauge کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ وہ ظاہر کر دیتی ہے کہ آپ کس قدر با ادب ہیں۔ اگر آپ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے دل سے ادب کرنے کا قرینہ سیکھیے۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے

''جو لوگوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں۔''

(ترمذی شریف، حدیث نمبر 1955)

اس لیے جب تک ہم اپنے استاد، اپنے مرشد کا احترام کرنا نہیں سیکھ جاتے، ان کے لیے با ادب نہیں ہو جاتے ہم رب تعالیٰ کے لیے کیسے با ادب ہوں گے!

ظاہری ادب تو محض ایک Ritual ہے جس کی ادائیگی میں ہمارا دل ساتھ نہیں دے رہا ہوتا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے مسجد میں کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں لیکن ان کا دل ان کا ساتھ نہیں دے رہا ہوتا۔ آپ سب تو نیک لوگ ہیں۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں کہ جب میں نماز پڑھتا ہوں تو دفتر کا حساب کتاب جوڑ رہا ہوتا ہوں یا دفتر کی کوئی Problem سوچ رہا ہوتا ہوں۔ میرے جسم کی اٹھک بیٹھک جاری رہتی ہے لیکن ذہنی طور پر میں کسی اور ہی طرف ہوتا ہوں۔ میرا جسم ایک خاص Drill میں سے گزر رہا ہوتا ہے اور دنیاوی مسائل مجھے گھیرے ہوتے ہیں۔ جس رب تعالیٰ کی نماز پڑھ رہا ہوتا ہوں اسی کے سامنے میں ذہنی طور پر غائب ہوتا ہوں۔ جس پروردگار کے سامنے میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہوں اسی کے سامنے مکمل توجہ اور دھیان کے ساتھ میں کبھی حاضر نہیں ہو پایا۔

آپ جیسے نیک لوگ جب نماز پڑھتے ہیں تو اسی یکسوئی کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ گویا رب تعالیٰ کے

حضور کھڑے اُسے دیکھ رہے ہوں۔ اصل میں یہی نماز ہے جس کے ایک ایک رُکن کو انسان Enjoy کرتا ہے۔ انسان اُس وقت بہت با ادب ہوتا ہے جب اُس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہے اور رب تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ اسی لیے ایک سچے مومن حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ میرے جسم سے تیر اُس وقت نکالن جب میں حالتِ نماز میں ہوں اور واقعی اس دوران جب تیر اُن کے جسم میں سے نکالا گیا تو انھیں اُس کا پتا تک نہ چلا۔ رب کے بندے کی نماز ایسی ہوتی ہے۔

اگر آپ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایسے لوگوں کو idealise کر لیجیے علم کا وہ مقام آپ کو مل جائے گا۔ لیکن پہلے یہ بھی طے کر لیں کہ آپ کو علم کے کس مقام پر جانا ہے۔ وہ مقام رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے ضرور عنایت فرمائے گا۔

علم کے حصول کی خواہش سے پہلے ادب کا قرینہ سیکھ لیجیے، سب کچھ پالیں گے۔

تسمیہ

جناب عکرمہؓ سے روایت ہے کہ رب تعالیٰ نے جب لوح و قلم تخلیق کیے اور قلم کو حکم دیا کہ لوح محفوظ پر تحریر کردے تو اس حکم کی تعمیل میں قلم سے جو اولین کلمات نکلے وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم تھے۔ یہ لوح محفوظ پر لکھی جانے والی اولین تحریر تھی۔ اس کے بعد بحکم رب تعالیٰ لوح محفوظ پر ازل سے ابد تک کے تمام واقعات محفوظ کر دیے گئے۔

عطاء کی ایک روایت کے مطابق لوح محفوظ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم تحریر کرنے سے پہلے بہت تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ لیکن جونہی قلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو لوح محفوظ پر تحریر کرنا شروع کیا ہوائیں چلنا بند ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عزت کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس شے پر میرا نام پڑھا جائے گا اس میں برکت ہوگی۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے والا جنت میں داخل ہوگا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے اثرات میں سے ایک اثر جو میں نے خود بھی Experience کیا، یہ تھا کہ جو اسے کثرت سے پڑھتا ہو یا اس کا عامل ہو وہ شخص اگر کہیں ٹھوکا دے تو چلتی ہوئی چیزیں تھم جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب بسم اللہ الرحمن الرحیم لوح محفوظ پر تحریر کیا گیا تھا تو چلتی ہوائیں تھم گئی تھیں۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا گیا تو زمین پر سب سے پہلے ان پر بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل فرمائی گئی۔ اس لیے حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری امت میں جو لوگ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے رہیں گے ان پر ہمیشہ سلامتی رہے گی۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام منجنیق کے پلڑے میں بیٹھے تھے اور آگ دہک رہی تھی تو وہاں ابراہیم علیہ السلام پر بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوئی۔ انھوں نے اسے تلاوت کیا تو اللہ کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم اٹھا لی گئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم حضرت سلیمان علیہ السلام پر اتاری گئی تو سب فرشتے پکار اٹھے کہ آج آپ کی حکومت مکمل ہو گئی لیکن پھر یہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے بھی اٹھا

دی گئی۔

ایک روایت کے مطابق یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی اتاری گئی۔ اس کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں سے مقابلہ کر پائے لیکن یہ روایت زیادہ مستند نہیں ہے۔

بعد میں بسم اللہ الرحمن الرحیم آپ ﷺ پر نازل فرمائی گئی۔ آپ ﷺ کی چونکہ کئی حیثیتیں ہیں، آپ ﷺ کی کئی Distinctions ہیں جن میں سب سے بڑی Distinction یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کئی معجزات عطا فرمائے۔ آپ ﷺ کو ایسے معجزات عطا ہوئے جو زندہ معجزات ہیں۔ دوسرے پیغمبروں کو جو معجزات عطا ہوئے وہ ان کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد ختم ہو گئے لیکن آپ ﷺ کے کئی معجزات ایسے ہیں جو آج تک قائم اور زندہ ہیں۔ جیسے قرآن پاک بذاتِ خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اسی طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم آپ ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد بھی قائم و دائم ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو بہت سادہ ہے اور اس میں کوئی مشقت بھی Involve نہیں۔ روزانہ عشاء کی نماز کے بعد ایک تسبیح بسم اللہ الرحمن الرحیم کی پڑھ لیا کریں۔ اس میں ناغہ نہ آنے دیں۔ رفتہ رفتہ اس کے اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک گزارش کروں کہ یہ رویہ نہ رکھیں کہ پہلے دن ایک تسبیح پڑھنے کے بعد یہ دیکھنا شروع کر دیں کہ اسے پڑھنے کے بعد کون سی دیوار گرتی ہے اور کون سا دوڑتا ہوا آدمی رُک جاتا ہے۔ کیوں کہ ہماری سرشت میں شامل ہے کہ ہم دو نمازیں پڑھنے کے بعد سوچنے لگتے ہیں کہ ہمیں ولایت ملی یا نہیں۔ یہ استقامت کریں کہ اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے ہیں یا نہیں۔ یہ رب تعالیٰ پر چھوڑ دیں کہ وہ آپ کو کیا عطا کرتا ہے۔ اپنی رحمت کے صدقے آپ کو کیا کچھ عطا فرماتا ہے۔ یقیناً اس کے اثرات آپ کو ملنا شروع ہو جائیں گے۔ یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ اس وظیفے کے اثرات کے شوق میں ہم صرف عشاء کی نماز نہ ادا کرتے رہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ پابندی سے پانچ وقت کی نماز پڑھیے اور اس کے ساتھ ساتھ دو تین چیزوں سے قطعی طور پر پرہیز کیجیے۔ ان کے قریب سے بھی نہ گزریے۔ ایک تو کسی کی غیبت نہ کریں۔ کسی کے عیبوں سے پردہ نہ اٹھائیں بلکہ پردہ ڈال دیں۔ دوسرا یہ کہ کسی بھی شخص کے بارے میں اپنے دل میں کوئی کینہ، بغض، حسد یا گلہ شکوہ نہ رکھیں۔ دل کو آئینے کی طرح بالکل پاک صاف رکھیں۔ خاص طور پر کسی سے انتقام لینا تو دور کی بات دل میں انتقام لینے کا سوچنا بھی نہیں۔ جونہی دل میں ایسا کوئی خیال آئے فوراً لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھیے اور اس خیال سے یہ سوچ کر جان چھڑا لیجیے کہ انتقام لینا سنت کے خلاف ہے۔ فوراً خود سے عہد کریں کہ بدلہ لینا تو درکنار میں ان کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔ اگر آپ ان تین چیزوں سے پرہیز کر لیں تو مجھے رب تعالیٰ کی رحمتوں پر پورا بھروسا ہے کہ آپ کو اس کے بہت انعامات ملیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کا دوسرا طریقہ عمل اور وظیفے کی شکل اختیار کر جائے گا اور اس میں بے تحاشا پابندیاں ہوں گی۔ اگر یہ وظیفہ آپ کی جسم اور روح کی کیمسٹری کو Suit کرتا ہے تو اسے روزانہ عشاء کے بعد 786 مرتبہ پڑھیں اور بغیر کسی سے گفتگو کیے سو جائیں خواہ دس منٹ کے لیے ہی سوئیں۔ اس کے بعد اٹھ کر بے شک اپنے روزمرہ کے معمولات سرانجام دیں لیکن اس کے پڑھنے کے بعد کسی سے بھی گفتگو نہیں کرنی اور سونا ضروری ہے۔ چالیس روز تک یہ وظیفہ کر لینے کے بعد یہ مت سمجھیے گا کہ اب آپ ساری عمر اس کا پھل بیٹھ کر کھائیں گے۔ اس کے اثرات وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتے جائیں گے۔ ان اثرات کو برقرار رکھنے کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ اسے چالیس روز کے بعد 70 بار روزانہ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس وظیفے کے دوران کھانے پینے کا پرہیز بھی ہے۔ ایک تو آپ Beef (بڑا گوشت) مت کھائیے۔ دوسرے ایسی مچھلی جس سے Smell آتی ہو۔ اس کے علاوہ کچا لہسن، پیاز، سفید مولی نہیں کھا سکتے۔ (Radish کھا سکتے ہیں کیوں کہ اس کی Smell نہیں ہوتی) شراب، سور کا گوشت اور دیگر ممنوعہ اشیاء سے اجتناب ضروری ہے۔ غیبت سے اجتناب، دل کو آئینے کی مانند صاف رکھنا اور انتقام سے دور رہنا، ان تینوں چیزوں پر عمل درآمد بھی ضروری ہے۔ چالیس روز کے بعد آپ کو رب تعالیٰ کی رحمت سے اس وظیفے کے اثرات ملنا شروع ہو جائیں گے۔

یہاں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس وظیفے کو ضرور پڑھیے لیکن صرف یہ سمجھ کر کہ رب تعالیٰ کی اتاری ہوئی ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن کسی فائدے کے حصول کا لالچ اپنے ذہن میں مت پالیے گا کیوں کہ میرے نزدیک یہ کوئی زیادہ مستحسن عمل نہیں ہے کہ رب تعالیٰ کا کلام کسی دنیاوی مفاد کے لیے استعمال کیا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اسے محض رب تعالیٰ کا کلام سمجھ کر محبت سے پڑھیں۔ رب کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح آپ کو بن مانگے اس کے فوائد مل جائیں گے کیوں کہ بقول حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو رزق آپ کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے وہ تو ہر حال میں آپ کو ملے گا۔ اس کو کوئی روک نہیں سکتا لیکن اس رزق کے حصول کا طریقہ کار آپ کا عمل طے کرے گا کہ آپ اسے حلال طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں یا حرام طریقے سے۔ اسی طرح اگر اس نیت سے کلام الٰہی پڑھا گیا کہ اس کے پڑھنے سے رب تعالیٰ راضی ہو گا تو دنیاوی فوائد تو آپ کو حاصل ہوں گے ہی (کیوں کہ رب تعالیٰ بہت وضع دار اور حیا والا ہے۔ وہ کسی کا ادھار یا حق بھی نہیں رکھتا۔) اس کے ساتھ ساتھ آپ کا نام رب تعالیٰ کے دوستوں کی فہرست میں بھی آ جائے گا۔ وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو اپنے قریب کرے گا۔ لیکن اگر اس وظیفے کو پڑھنے کے پیش نظر کسی دنیاوی فوائد کا حصول ہے تو بھی یاد رکھیے کہ رب تعالیٰ بھی کسی کا ادھار نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی کی مزدوری اپنے ذمہ رکھتا ہے۔ وہ چن حساب یوں آپ سے برابر کر دے گا کہ دنیاوی فائدے کے سوا پھر آپ کو کسی بھی شے کے حصول کی تمنا ترک کرنا ہو گی۔ پھر آپ اللہ تعالیٰ کی قربت اور دوستی کی امید مت رکھیے گا۔

اگر رب تعالیٰ کی قربت اور رضا چاہتے ہیں تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کا وظیفہ پڑھتے ہوئے نیت

یہی رکھیں کہ یہ میرے رب کا بہت بابرکت کلام ہے اور اس کو پڑھنے سے رب مجھ سے راضی ہو جائے گا۔

شیطان زندگی میں تین بار پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ایک اس وقت جب وہ ملعون قرار دیا گیا اور اپنے تکبر کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا۔ دوم، اس وقت جب آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے۔ شیطان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ ﷺ جس تعلیم کو پھیلائیں گے اس میں شیطان کی کامیابی زیرو ہے۔ اسے اپنی شکست صاف دکھائی دی۔ اس لیے وہ آپ ﷺ کی پیدائش پر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ تیسری بار اس وقت رویا جب سورۂ فاتحہ نازل کی گئی کیونکہ اس سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی ہوئی تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے فضائل میں سے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اس نے شیطان کو رونے پر مجبور کر دیا تھا لہٰذا آپ اسے شیطان کو شکست دینے کے لیے پڑھیں۔ اس نیت سے یہ وظیفہ کر کے دیکھیں کہ کیسے کیسے اثرات اور انعامات آپ کے حصے میں آتے ہیں۔

سوال: وظیفے کے دوران جن تین چیزوں (لہسن، پیاز، مولی) کو کھانے کی پابندی ہے، یہ کچی منع ہیں یا پکی ہوئی بھی؟

جواب: یہ چیزیں کچی منع ہیں۔ یہ حلال ہیں لیکن اس وظیفے میں اس کی ممانعت صرف اس وجہ سے ہے کہ ان چیزوں کی Smell سے فرشتے دور بھاگتے ہیں۔ جب آپ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ورد کریں گے تو رب تعالیٰ کی رحمت سے امید یہی ہے کہ پہلے ہی دن اس کلام کے فرشتے اور موکلات آپ کے اردگرد جمع ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اگر آپ کے منہ سے لہسن، پیاز یا مولی وغیرہ کی Smell آ رہی ہو تو یہ فرشتے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں سے پڑھائی کے دوران ذرا پرہیز کریں۔

یہ حلال چیزیں ہیں اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ حلال چیزوں کو حرام قرار دے۔ جس کو رب تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہو اس کو حرام قرار دیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں نے بھی ان چیزوں کو کھانے سے منع نہیں کیا بلکہ دوران وظیفہ ان کو کھانے سے پرہیز کرنے کا کہا ہے۔ اگر آپ یہ کلام نہیں پڑھ رہے تو جیسے چاہیں، انھیں کھائیں۔

اگر یہ چیزیں کچی ہیں یا پکی ہوئی میں بھی Smell ہے تو مت کھائیے۔ اگر Smell نہیں ہے تو کھا سکتے ہیں۔ جیسے اگر کچے پیاز کی Smell کسی بھی طریقے سے ختم کر دی جائے تو آپ اسے کھا سکتے ہیں۔

سوال: 786 مرتبہ والا بسم اللہ الرحمن الرحیم کا جو ورد ہے اس کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھنا ہے اور پھر سو جانا ہے۔ کیا عشاء کی نماز کے فوراً بعد پڑھ کے سو جانا ہے یا سونے سے پہلے پڑھنا ہے؟

جواب: اگر آپ عشاء کی نماز کے بعد تلاوت قرآن پاک کرتے ہیں اور دوسری تسبیحات پڑھتے ہیں تو ان سب معمولات سے فارغ ہو کر آخر میں بسم اللہ الرحمن الرحیم والا وظیفہ کر لیں اور اسے پڑھنے کے فوراً بعد بستر پر جا کر سو جائیے۔ کسی سے گفتگو نہ کیجیے۔ خواہ پانچ منٹ کی نیند ہی۔ سونا ضروری ہے۔ اس کے بعد

بیدار ہو کر جو تی چاہے کیجیے۔

سوال: کیا اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بھی بسم اللہ الرحمن الرحیم کا حصہ ہے؟

جواب: یہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا حصہ نہیں ہے۔

سوال: 40 روز تک بسم اللہ الرحمن الرحیم والا وظیفہ کرنا اور کھانے پینے میں پرہیز کرنا مشکل امر ہے۔ مجھی تو بغیر Smell کے ملتی ہی نہیں۔ کوئی آسان وظیفہ بتا دیجیے جس کے ساتھ دیگر معمولات زندگی بھی چلتے رہیں۔

جواب: میں تو ہمیشہ اپنی زندگی کے معاملات میں درپیش وقت اور معمولات کی ادائیگی کے لیے آپ ﷺ کی زندگی میں جھانک لیتا ہوں۔ یوں میں آپ کو بھی سنت رسول ﷺ کی ہی مثال دیتا ہوں کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ نے جو عمل فرمایا، آپ بھی وہی کرلیں۔ آپ کی زندگی بڑی سادہ اور آسان ہو جائے گی۔ آپ ﷺ نے اپنے چوبیس گھنٹوں کے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ دن کا ایک حصہ آپ ﷺ صحابہ کرام، بیرونی وفود سے ملاقات اور امور مملکت چلانے میں صرف فرماتے تھے۔ دوسرا حصہ آپ ﷺ نے اپنی ازدواجی زندگی کے لیے وقف کر رکھا تھا، جس میں آپ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے کام میں ہاتھ بٹاتے، ان کو وقت دیتے اور ان کی دل جوئی کرتے۔ تیسرا حصہ آپ ﷺ نے اپنے آرام اور عبادات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔

آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے تمام Aspects کو بھی ایک دوسرے میں گڈمڈ نہ ہونے دیا۔ علیحدہ علیحدہ Compartment میں ہر چیز کو رکھ کر نہایت احسن طریقے سے چلاتے رہے۔ اگر ہم آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرلیں کہ ہمارے وقت کا جو حصہ کاروبار کے لیے مختص ہے اس میں پوری دل جمعی سے اپنا کاروبار، ملازمت یا دیگر دنیاوی فرائض سرانجام دیں۔ ماسوائے اس دوران آنے والی تمام فرض نمازوں کے ہم اپنا تمام وقت ایمان داری سے اپنی کاروباری ذمہ داریاں پوری کرنے میں صرف کر دیں۔ یوں وقت کی بھی بچت ہو جائے گی اور کام بھی اکٹھا نہیں ہوگا اور آپ کا ذہن بھی کام کے بوجھ سے آزاد رہے گا۔

سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے وقت کا دوسرا حصہ اگر ہم اپنی Family کے لیے مخصوص کر دیں تو ہماری ازدواجی زندگی اور Family life اچھی ہو جائے گی۔

چوبیس گھنٹوں میں تیسرا حصہ ہم سنت کو Follow کرتے ہوئے اپنی عبادات اور آرام کے لیے مختص کر دیں۔ یوں عبادات کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا اور ہمیں آرام کے لیے بھی وقت مل جائے گا۔

786 بار بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنا اتنا دشوار نہیں۔ اس میں آدھ پا سوا پہر وقت لگتے ہیں۔ (یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔) اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی عبادات میں کوئی خلل نہ ہو تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ علیحدہ کمرے میں عبادات کا کوئی بندوبست کرلیں۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ایسا کمرہ Ext ہے جہاں رات کو کوئی نہیں ہوتا۔ آپ اس کا ایک کونا عبادات کے لیے استعمال کر لیجیے۔ نماز کے بعد

وظیفہ پڑھیں اور پھر وہیں جا نماز پر کچھ دیر کے لیے سو جائیں۔ یہ سنت بھی ہے۔ آپ ﷺ جا نماز پر لیٹ جایا کرتے تھے۔

پانچ یا 10 منٹ کی نیند کے بعد بیدار ہو کر اللہ اللہ کرنا شروع کر دیں یا جو کام بھی کرنا چاہتے ہیں، کر لیجیے۔
باقی رہ گئی بات کہ Smell والی چیزوں سے کیسے اجتناب کیا جائے تو آپ مچھلی Tender نہ کھائیے بلکہ Well done کھا لیجیے۔ اگر انگریز کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا آدمی Tender کھائے گا تو وہ ویسے ہی مکروہ ہے کیوں کہ اس میں سے خون نکل رہا ہوتا ہے۔ Medium done میں بھی Blood stains نظر آ رہے ہوتے ہیں اس لیے آپ Well done کھا لیجیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

سوال: (الف) کلمات کو خاص اعداد میں پڑھنے کی مصلحت کیا ہے؟ کیوں کہ اس میں خطرہ یہ ہے کہ توجہ مفہوم کی بجائے اعداد پر رہ جائے گی۔

(ب) بعض لوگ کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو 19 بار پڑھنے کا بھی وظیفہ ہے۔

جواب: بسم اللہ الرحمن الرحیم کے 19 حروف ہیں لیکن علم الاعداد کے مطابق اس کی Numerical Value 786 بنتی ہے۔ جو لوگ 19 مرتبہ یہ وظیفہ پڑھنے کو کہتے ہیں وہ حروف کی نسبت سے ایسا کہتے ہیں۔

دوسری بات آپ نے فرمائی کہ توجہ Counting پر رہتی ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ آج کل Mechanical Counters ملتے ہیں جو تسبیح کے طور پر عام استعمال ہو رہے ہیں۔ اس میں سہولت یہ ہے کہ انسان پڑھتا چلا جاتا ہے۔ نہ دل میں گنتا ہے نہ ذہن میں گنتا ہے اور نہ یہ فکر ہوتی ہے کہ کتنا پڑھ لیے اور کتنا باقی ہے۔ لہٰذا آپ پڑھتے رہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے کبھی سولہ منٹ لگ جاتے تھے تو کبھی سترہ منٹ میں یہ تعداد پوری ہو جاتی تھی۔ یوں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وظیفہ اتنی دیر میں مکمل ہو جائے گا۔ پھر خود بخود اندر سے آواز آتی ہے کہ مکمل ہو گئی تعداد۔ پڑھتے پڑھتے Counter پر ایک نظر دوڑائی اور گنتی دیکھ لی۔ عموماً دل سے جو آواز آتی ہے کہ وظیفہ مکمل ہو گیا وہ درست ہوتی ہے۔ اگر کبھی دو چار بار زیادہ بھی پڑھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں بلکہ اچھا ہے۔ ہم تو یہی کرتے ہیں۔ میری کچھ پڑھائی دس ہزار سے اوپر کی ہے۔ جب دس ہزار پورا ہو جاتا ہے تو خود بخود اندر سے آواز آتی ہے کہ تعداد مکمل ہو گئی۔ رک کر دیکھتا ہوں تو کسی دن 80 زیادہ ہو جاتا ہے تو کسی دن 110 مرتبہ زیادہ پڑھ چکا ہوتا ہوں۔ ایک مخصوص تعداد روزانہ اس لیے نہیں پڑھتا کہ وہ Fix ہو جائے گی اور زیادہ اس خیال سے پڑھتا ہوں کہ کہیں میں Omit کر گیا ہوں یا درمیان میں کہیں ایک بار مجھ سے Counter کی Key زیادہ Press ہو گئی ہے تو احتیاط کے طور پر میں سو پچاس زیادہ پڑھ لیتا ہوں۔ زیادہ پڑھنے کا نقصان نہیں ہے لیکن کم پڑھنے کا نقصان یہ ہے کہ تعداد Consider ہو جائے گا لہٰذا آپ یہ کر سکتے ہیں کہ 786 کی بجائے کسی دن 790، کسی دن 795 یا 800 پڑھ لیں۔

ذہن کو آزاد چھوڑ دیں اور Counter کو گننے دیں۔ ایک مخصوص دورانیے کے بعد آپ کو گنتی پوری ہونے کا اندازہ خود بخود ہو جائے گا۔

سوال: اگر ناغہ آجائے تو Zero سے وظیفہ Start کرنا ہوگا۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ناغہ آجائے تو ایسی صورت میں بھی دوبارہ پڑھنا ہوگا؟ کیا اس وظیفے کی تمام لوگوں کو اجازت ہے؟

جواب: یہ وظیفہ کوئی بھی پڑھ سکتا ہے مگر تمام شرائط کی پابندی ضروری ہے۔ نماز پابندی سے پڑھیں۔ کسی کی غیبت نہ کریں، کسی کی عیب جوئی نہ کریں بلکہ On the contrary ہر ایک کی پردہ پوشی کیجیے۔ کسی کے لیے بھی دل میں کینہ، کدورت، شکوہ یا شکایت پیدا نہ ہونے دیں۔ دل کو بالکل آئینے کی طرح شفاف رکھیے۔ انتقام تو دور کی بات ہے انتقام کے بارے میں سوچنے کا بھی نہیں۔ ان چیزوں پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ Otherwise کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

فقیر اور درویش کہتے ہیں کہ کوئی بھی کام کرنا ہو درود شریف اس کا لازمی حصہ ہے۔ درود شریف پڑھے بغیر وہ کام کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھی کہ فقیر جب قرآن پاک پڑھنے لگتے ہیں تو درود شریف خود بخود ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ جب تک فقیر قرآن پاک کا غلاف (Cover) اتار رہا ہوتا ہے تب تک درود شریف پڑھتا رہتا ہے لہٰذا آپ بھی جب بسم اللہ الرحمن الرحیم والا وظیفہ کریں تو اسے درود شریف سے شروع کیجیے گا۔

رہی بات ناغہ کی تو یہ جتنے بھی وظائف، تسبیحات اور عملیات ہیں، ان سب کی حیثیت Snake and ladder game کی سی ہے۔ آپ روزانہ وظیفہ پڑھتے جاتے ہیں۔ جہاں ایک ناغہ بھی آیا آپ Zero پر چلے گئے۔ آپ End کے قریب پہنچ گئے ہیں لیکن ناغہ ہو جانے کی صورت میں از سر نو Counting شروع کریں گے۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ انسان پڑھائی کا اس طرح عادی ہو جاتا ہے جیسے کوئی انسان نشے کا عادی ہو جاتا ہے۔ مجھے بڑے شاہ صاحب نے ایک پڑھائی بتائی جس کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ اس کا ایک دور دس سال اور ایک ماہ پر مشتمل ہے۔ جب بڑے شاہ صاحب نے مجھے وہ پڑھائی بتائی تو مجھے لگا کہ یہ تو بڑا مشکل کام ہے اور پھر اس کو پڑھنے کا وقت بڑا عجیب و غریب ہے۔ خاص طور پر نوکری پیشہ انسان کے لیے اس پڑھائی کو Manage کرنا بہت دشوار ہے۔ پھر پابندی یہ بھی ہے کہ ناغہ نہیں ہونے دینا۔ پہلے دن جب میں نے ظہر کی نماز کے بعد اسے پڑھنا شروع کیا تو مغرب کی اذان کے وقت کہیں جا کر وہ تعداد پوری ہوئی۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ اللہ کے کرم سے زبان میں روانی آتی گئی اور دورانیہ مختصر ہوتا گیا۔ اب تقریباً ایک گھنٹے میں وہ پڑھائی مکمل ہو جاتی ہے۔ جو قابلِ قبول وقت ہے کیوں کہ Lunch break بھی ایک ہی گھنٹے کی ہوتی ہے۔

اب دوسرا مرحلہ بھی خاصا دشوار تھا کہ بغیر ناغے کے دس سال اور ایک ماہ کا وقت مکمل کرنا ہے۔ میں تو Tours پر بہت جاتا ہوں اور کچھ Conferences ایسی ہوتی ہیں جن میں بہت Senior لوگ ہوتے ہیں اور وہاں غائب ہونا گناہِ کبیرہ کے مترادف ہے۔ لیکن یہاں بھی رب تعالیٰ نے مدد فرمائی اور سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن دس سال پورے ہوتے ہوتے مجھے اس پڑھائی کا ایسا نشہ لگا کہ جو جی میں نے دیکھا کہ اب تین دن کے

بعد اس سال اور ایک مہینہ پورا ہو جائے گا اور اس وظیفے کی تعداد الگ سے کر کے ایک چوتھائی رہ جائے گی تو بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا کہ یہ تعداد تو کچھ بھی نہیں رہ جائے گی۔ اس کو تو میں دس منٹ میں ختم کر لوں گا لہٰذا ایسا کرتا ہوں ایک ناغہ کر کے پڑھائی Zero سے دوبارہ Start کر لیتا ہوں۔

یہ پڑھائی 1978ء میں مجھے بڑے شاہ صاحب نے دی تھی لیکن میں نے ابھی تک وہ 10 برس پورے نہیں ہونے دیے۔ جب بھی دور مکمل ہونے والا ہوتا ہے میں ایک ناغہ کر کے دوبارہ Zero سے پڑھائی شروع کر دیتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان پڑھائی انجوائے کرنے لگتا ہے اور اسے اس سے محبت ہو جاتی ہے۔

جہاں تک خواتین کے لیے مجبوری کی صورت میں ناغہ کی بات ہے تو کچھ چیزیں بہت سادہ ہیں۔ قصر نماز کیا ہے؟ رب تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ایک سہولت اور رعایت ہے اور جس چیز کو رب تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اسے کوئی شخص حرام قرار نہیں دے سکتا اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی یا تحریف کر سکتا ہے۔ اسی طرح جو حق رب تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی اولاد کو عطا فرمایا ہے کسی کو اختیار نہیں کہ رب تعالیٰ کے عطا کردہ حق کو آپ سے چھین لے۔ اسی طرح یہ رعایت بھی رب تعالیٰ کی عنایت کردہ ہے اس لیے کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ جو رعایت رب تعالیٰ نے آپ کو دی ہے اُس دن تو یہ وظیفہ Valid نہیں ہوگا۔ یہ رعایت تو رب تعالیٰ نے آپ کو دی ہے۔ انسان کون ہوتا ہے بولنے والا۔

سوال: لہسن پیاز کے بغیر تو کھانا نہیں بنایا جا سکتا۔ ایسے میں کیا کیا جائے؟

جواب: جس طرح پیاز کو نمک لگا کر دھونے سے اگر اس کی Smell ختم ہو جاتی ہے تو آپ اسے کھا سکتے ہیں۔ اسی طرح جب ہنڈیا میں لہسن یا پیاز ڈالا جاتا ہے تو پکنے کے بعد اس کی Smell ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔

تقدیر یا تدبیر

سوال: جب اللہ کے حکم کے بغیر ایک پتا تک نہیں ہل سکتا اور ہر شخص کی Destiny پہلے سے Determined ہے تو ایسے میں جو شخص چوری یا قتل کر رہا ہے تو کیا وہ اس کی Destiny ہے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ رب تعالیٰ مالک کل ہے اور اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔ یہ بھی درست ہے کہ Destiny پہلے سے طے ہے لیکن وہ Destiny یہ نہیں ہے کہ یہ شخص مجرم ہوگا یا پاک باز اور نیک انسان ہوگا۔ اگر یہ Destiny ہوتی اور اللہ کے حکم کے بغیر پتا نہ ہلنے سے مراد وہی ہوتی جو ہمارا نوجوان طبقہ یا دوسرے لوگ سمجھ رہے ہیں تو رب تعالیٰ وہ کام کبھی نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ہمارے لیے صحیح راستہ نہ صرف متعین کیا بلکہ بار بار اپنے انبیائے کرام کے ذریعے بھی ہمیں راہ ہدایت دکھائی۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجے اور نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آپ ﷺ پر ختم ہو گیا۔ آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد یہ ذمہ داری علما پر ڈال دی گئی کہ وہ رب تعالیٰ کے پیغام کو پھیلاتے رہیں۔ اس کو لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہونے دیں اور اس پر گرد نہ جمنے دیں۔ یہ پیغام قیامت تک کے لیے کافی ہے۔

اگر Destiny پہلے سے ہی مقرر تھی تو رب تعالیٰ کو سیدھا راستہ متعین کرنے کے بعد بار بار اپنے رسول، نبی یا پیغمبر بھیج کر لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر رب تعالیٰ نے ہی سب کچھ طے کرنا ہوتا اور ہمارے اعمال کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ تو سیدھا سیدھا پکڑ کر بندوں کو جنت یا دوزخ میں ڈال دیتا جب کہ اس کے برعکس رب تعالیٰ نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ یہ سیدھا راستہ ہے۔ اس پر چلو اس کے انعامات بہت ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اگر کسی بھی شخص کی بطور مجرم (معاذ اللہ) Destiny پہلے سے مقرر ہوتی اور اگر وہ اپنی Destiny کے مطابق جرم کرتا پھر تو گویا اس نے وہ کام کیا جس کے لیے اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ پھر اسے سزا کاہے کی ملے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا کہ جو میرے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ گیا اس

کے لیے مرتا ہے۔

رب تعالیٰ نے کسی انسان کی Destiny (تقدیر) اس طرح سے مقرر نہیں کی کہ کوئی شخص مجرم ہوگا یا پاک باز۔۔۔ یہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اعمال سے اپنی Destiny مقرر کرے۔

رب تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ رب تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور وہ انصاف کرتا ہے۔ جس طرح ایک آفیسر کا نمبر Two بھی بے اختیار نہیں ہوتا، اسے Authority دی جاتی ہے۔ اپنے نائب کو اتھارٹی دینے کے باوجود آفیسر یہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے کہ جب چاہے اس سے وہ اتھارٹی Withdraw کر لے۔ قادرِ مطلق رب تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ قادرِ مطلق رب نے انسان کو بڑی حد تک بنیادی طور پر قادر بنایا ہے۔ اس نے انسان کو تین آزادیاں دی ہیں:

1۔ سوچ کی آزادی (Freedom of Thought)

2۔ فیصلے کی آزادی (Freedom of Decision)

3۔ عمل کی آزادی (Freedom of Action)

ہم جو چاہیں سوچیں، فیصلہ کریں اور جس راستے پر چاہیں چل پڑیں۔ ہمیں کوئی فرشتہ آ کر اس سوچ، فیصلے اور عمل سے نہیں روکے گا۔ رب تعالیٰ ہمیں روزمرہ زندگی کے معمولات کے بارے میں Warnings دیتا ہے، تنبیہ کرتا ہے، اشارے دیتا ہے کہ رک جاؤ۔ وہ ہمارا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ رب تعالیٰ ہماری اس آزادی میں خلل نہیں ڈالتا۔ اس نے ہمیں تین آزادیاں عطا فرمائیں کہ جو چاہے کرو لیکن ساتھ ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ اگر میرے بتائے ہوئے راستے پر نہ چلے تو تمہیں لوٹ کر میرے پاس ہی آنا ہے۔ وہاں یہ سزائیں تمہیں دی جائیں گی۔

اب یہ جو دلیل لائی جاتی ہے کہ اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ ہم میں سے اکثر افراد کے گھر کئی کئی ملازم ہیں۔ آپ گھر کے سربراہ ہیں لیکن جب آپ کا ملازم بے پروائی سے کام کرتے ہوئے آپ کی کراکری توڑ دیتا ہے تو کیا اس میں آپ کا کوئی Concern شامل ہوتا ہے؟ کیا آپ کی Authority ختم ہو گئی ہوتی ہے؟ اور جب آپ کا ڈرائیور جو آپ کا ماتحت اور آپ کے حکم کا پابند ہے آپ کی گاڑی گھر سے لے کر چلا جاتا ہے اور سڑک پر ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی کہیں مار دیتا ہے تو کیا اس میں آپ کا کوئی Concern شامل ہوتا ہے؟ کیا آپ کی Authority کم ہو گئی ہوتی ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ اس سب کے باوجود آپ اپنے گھر کے سربراہ ہی رہیں گے۔ آپ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا۔ آپ کا حکم ہی آخری حکم ہوگا۔ ڈرائیور نے سڑک پر گاڑی مار دی۔ اس نے آپ کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے۔ آپ کی ہدایات کی نافرمانی کی ہے جس کی وہ سزا پائے گا۔ یہ بہت چھوٹا سا Canvas

ہے۔ اسے بڑے Canvas پر لے جائیں۔ آپ ایک ملک میں رہتے ہیں۔ بطور شہری آپ اپنی رائے یا ووٹ سے ملک کے وزیر اعظم کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر آپ اسی ملک میں رہتے ہوئے کوئی جرم کرتے ہیں تو وہی حاکم یا وزیر اعظم آپ کو سزا دیتا ہے۔ وہ آپ کو چوری کرنے یا کسی غلط کام کرنے سے آپ کو نہیں روکتا۔ لیکن اس نے عملی قوانین وضع کر دیے ہیں کہ آپ فلاں کام کر سکتے ہیں اور فلاں کام نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ان قوانین کی خلاف ورزی کریں گے تو سزا مل جائے گی۔ آپ اپنی مرضی سے غلط کام تو کر لیتے ہیں لیکن Authority وزیر اعظم ہی کی رہتی ہے جو ایک حکومت کا Chief Executive ہے۔

بالکل اسی طرح رب تعالیٰ کا معاملہ ہے۔ یہ کائنات رب تعالیٰ کی ہے۔ وہ مالک ہے۔ مرضی بھی اسی کی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اس نے ہمیں آزادیاں دیں اور ہمیں سیدھا راستہ بھی بتا دیا۔ اوامر و نواہی کی تفصیلات بھی ہمیں دے دیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس کے احکامات کی خلاف ورزی کی صورت میں ہم سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ لیکن اگر ہم غلط کام کرتے ہیں تو اس وجہ سے رب تعالیٰ کی Authority کم یا ختم نہیں ہوگی۔

غلط کام کرنے کے باوجود یہ دلیل درست ہے کہ وہ مالک کل ہے اور اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا اور اسی کی مرضی سے سب ہوتا ہے اور درست نہیں ہے۔ ہاں اگر ہم کوئی ایسا کام کرنے کی کوشش کریں جو اللہ تعالیٰ کی کائنات کے نظام میں رکاوٹ پیدا کر دے وہاں پھر رب تعالیٰ اپنی Veto power استعمال کرتا ہے۔ اگر ہم کوئی ایسا کام کرنے کی کوشش کریں گے کوئی ایسی خواہش کریں گے یا کوئی ایسی دعا کرنے کی کوشش کریں گے جس سے اس کی کائنات کے نظام کو چلانے میں خلل واقع ہو یا کائنات کا Delicate balance (توازن) Out ہوتا ہو تو وہ آپ کی کوشش اور دعا قبول نہیں کرے گا۔ آپ کی اس دعا کی جگہ کوئی اور دعا قبول کر لے گا۔ وہ آپ کی کوئی ایسی خواہش پوری نہیں ہونے دے گا۔ جس طرح آپ کی والدہ آپ کے بچپن میں آپ کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں اور آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن جب بھی آپ آگ کو پکڑنے کی کوشش کرتے تو وہ کبھی بھی آپ کو ایسا نہیں کرنے دیتی تھیں۔ اسی طرح آپ کی جو خواہش آپ کے لیے نقصان دہ ہو یا کائنات کے نظام میں خلل کا سبب ہو رب تعالیٰ وہاں اپنی Veto power استعمال کرتا ہے اور آپ کی اس خواہش کو پورا نہیں کرتا۔

جب ہم کسی فقیر یا درویش سے اپنے لیے کوئی ایسی دعا کرنے کی درخواست کرتے ہیں جو خلاف فطرت ہو تو وہ آپ کو سمجھائے گا یا کم از کم وہاں خاموشی اختیار کرے گا اور آپ کی بات کو درمیان میں ادھورا کر کوئی اور بات شروع کر دے گا یا یوں کہہ دے گا "اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ وہ کرم کرے گا۔"

سوال: کیا رزق کمانے کی کوئی حد بھی ہے؟ یا پھر اسے بڑھانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے؟

جواب: اگر شرعی نقطہ نظر سے دیکھیں تو رزق کمانے کی حدود مقرر نہیں ہیں۔ آپ کسی درجے کی محنت کریں اور اس محنت کے نتیجے میں جتنی آمدنی حاصل کریں اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ یہ آپ اپنے ضمیر سے اور

Concept کی بات ہے۔ میرے عقیدے کے مطابق انسان کو بھرپور محنت و کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ حلال طریقے سے زیادہ سے زیادہ رزق کما سکے۔ اس رزق میں سے اپنی Family کو بھی طرح سے Look after کرنے، اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کرنے کے بعد جو رقم بچ جائے اس سے اللہ تعالیٰ کے دوسرے بندوں کی خدمت کر دینی چاہیے۔ کھلے دل سے آنکھیں بند کر کے بغیر یہ سوچے کہ سامنے آنے والا شخص آپ کا دوست ہے یا دشمن بلا امتیاز جہاں تک ممکن ہو آپ سب کی خدمت کریں۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ جس قسم کے Materialistic دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس Materialistic Age میں اگر کوئی مسلمان بھائی میرے پاس آتا ہے کہ اس کی فلاں ضرورت رکی ہوئی ہے اور وہ اسے پورا کرنا چاہتا ہے۔ ایسے میں اگر میں خود ہی Barest minimum پر ہوں گا تو اس کی مدد کیسے کر پاؤں گا۔ اگر میرے پاس اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہی رقم نہیں ہے تو میں اپنے ضرورت مند بھائی کی خدمت نہیں کر سکوں گا۔ اگر میں خود مالی لحاظ سے خوشحال نہیں ہوں تو اپنے کسی بھائی، پڑوسی، دوست یا کسی ضرورت مند کی مدد کیسے کروں گا؟

مسلمان شاید تمام عمر مدینہ منورہ میں یہودیوں کے رحم و کرم پر رہتے اگر حضرت عثمان غنیؓ Financially affluent نہ ہوتے۔ اگر وہ مسلمانوں کے لیے کنواں نہ خریدتے تو شاید مسلمان عمر بھر یہودیوں کے کنویں سے پانی بھرتے رہتے۔

یہ کہنا یا سمجھنا کہ مال و زر کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کو ہاتھ لگانے سے چھوت کی بیماری لگ جاتی ہے، درست نہیں ہے۔ مال و زر بہت کام کی چیز ہے۔ بس اس میں اتنی سی احتیاط لازم ہے کہ یہ آپ کے دل میں جگہ نہ بنائے۔ اسے دل میں جگہ نہ دیں اور نہ ہی اس سے محبت پالیں۔ نہ ہی اسے جمع کر کے اپنی ذات تک محدود رکھیں۔ جتنا بھی رزق اور مال و زر ہاتھ آئے اپنے اہل خانہ اور اپنی ضروریات کے بعد بچ جانے والا رزق دوسروں کی ضروریات پر خرچ کر دیجیے۔ جہاں مال و زر کی محبت دل میں بس گئی وہاں معاملات خراب ہو گئے۔

سوال: بعض ممالک جیسے ایتھوپیا وغیرہ میں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ کیا یہ بھوک عذاب کے طور پر نازل ہوئی ہے؟

جواب: یہ معاملات قدرے مختلف ہیں۔ ان کا تعلق نظام کائنات کو چلانے کے ساتھ منسلک ہے۔ ان ممالک میں بھوک کے بارے میں آپ کی بات درست ہے۔ اس میں رب تعالیٰ کی اپنی کوئی مصلحت ہے کہ اجتماعی طور پر لوگ بھوک کا شکار ہو رہے ہیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے جو میں بات کر رہا تھا وہ انفرادی بھوک پر بات ہو رہی تھی لیکن یہاں بات اجتماعیت کی ہے۔ اس کا Standard مختلف ہے۔ اس میں رب تعالیٰ کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ میں اس کو سزا یا عذاب جیسے الفاظ نہیں دے سکتا۔ میں ایسے الفاظ اپنی زبان سے اس لیے ادا نہیں کر سکتا کیوں کہ ایک خوف طاری رہتا ہے مجھ پر کہ مجھ سے بڑھ کر گناہ گار کون ہے؟ لیکن پھر بھی رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے مجھے معاف کیے ہوئے

ہے اور میری بجائے اپنے عذاب سے ابھی تک نہیں نکلی۔ میں کسی دوسرے بندے کا ذکر اس سلسلے میں کیسے کروں کیوں کہ میرا تو اپنا دامن ابھی تک نہیں بھرا، میں کسی اور کو کیا کہوں۔ میں تو خود کنگال ہوں۔ فقیر تو صرف اپنی بات کر سکتا ہے۔

سوال: اگر میں مشکل میں ہوں تو کیا مجھے کسی سے قرض لے لینا چاہیے؟ یا کوئی شخص اگر خود آ کر مجھے قرض دے دے تو کیا اسے قبول کر لینا چاہیے؟

جواب: اگر بھائی سے مدد لے کر آپ کی مشکل آسان ہو جاتی ہے تو اس مدد کو قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی شخص خود آپ کے پاس چل کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائی میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آپ ان دنوں مشکلات کا شکار ہیں۔ میرے پاس یہ کچھ فالتو رقم پڑی ہوئی ہے یا چیزیں ہیں یہ آپ لے لیجیے ان سے آپ اپنا مشکل وقت گزار سکتے ہیں۔ تو آپ اس Offer کو قبول کر لیجیے لیکن اس نیت کے ساتھ کہ جونہی آپ کے معاملات ذرا Set ہوتے ہیں آپ اس قرض کو واپس کر دیں گے۔ لیکن اگر اس شخص نے بطور قرض نہیں بلکہ بطور تحفہ آپ کی مدد کی ہے تو پھر آپ اسی انداز میں کسی مشکل میں گرفتار شخص کی خدمت کر دیجیے گا۔ یوں چراغ سے چراغ جلاتے جائیے۔

سوال: ملک میں ملازمت کے مواقع بہت محدود ہیں۔ ایسے میں اگر معلوم ہو جائے کہ جس ادارے میں ہم ملازمت کرتے ہیں اس کا کاروبار Unfair ہے تو یہ جاننے کے بعد انسان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟

جواب: آپ کی پہلی بات سے شاید میں اتفاق نہ کروں کہ ملک میں جاب کی Opportunities (مواقع) محدود ہیں۔ ہم لوگ مہینے میں دو تین بار "ضرورت سٹاف" کے لیے اشتہارات دیتے ہیں۔ Companies میں Management کا کہنا ہے کہ ان کو کوئی کام کا آدمی نہیں ملتا۔ (اور حقیقت بھی یہی ہے کہ واقعی نہیں ملتا۔) دوسری طرف لوگ روتے ہیں کہ انھیں Job نہیں ملتی۔ بحیثیت Professional میرا تھوڑا بہت تجربہ ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے میری رائے یہ ہوتی ہے کہ پاکستان کے اندر کام کے لوگ کم ہیں۔ جب بھی آپ گھریلو ملازم ڈھونڈنے جائیں گے تو دس آدمیوں میں سے بمشکل ایک کام کا آدمی آپ کو ملے گا۔ جو گھریلو ملازم Efficient ہوگا وہ تنخواہ اس قدر مانگتا ہے کہ بعض اوقات آدمی اسے Afford نہیں کر پاتا۔ جو لوگ ڈرائیور رکھتے ہیں ان کو اس بات کا تجربہ اچھی طرح سے ہوگا کہ اول تو کام کا ڈرائیور نہیں ملے گا اور اگر خوش قسمتی سے اچھا ڈرائیور آپ کو مل گیا تو وہ بیس پچیس ہزار تنخواہ سے کم پر راضی نہیں ہوگا۔ Plus آپ سے رہائش، کھانا پینا، کپڑے وغیرہ مانگے گا۔ یوں تقریباً پینتیس ہزار میں وہ آپ کو پڑے گا۔

کمی Job opportunities کی نہیں ہے بلکہ کمی اس بات کی ہے کہ ہم اپنی Professional skills کو Improve نہیں کرتے جس کی وجہ سے کوئی اچھا ادارہ ہمیں لینے کو تیار نہیں۔ کسی بھی مسئلے کو جب آپ ترتیب سے حل نہیں کریں گے وہ حل نہیں ہوگا۔ ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں جو کچھ پڑھا تھا عملی زندگی میں اسے سودمند پایا۔ ایک بات یہ بھی ہم نے پڑھی تھی کہ پہلے اپنے Problem کو Identify کر

پہلے یہ جان لیجیے کہ اصل مسئلہ ہے کیا؟ (میں موضوع سے قدرے ہٹ رہا ہوں لیکن شاید یہ بات آپ کے کام آجائے۔) مسئلہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کے Root cause کو Identify کر لیجیے۔ Root cause کی شناخت کے بعد Responsibilities کو Fix کر لیجیے کہ کس انسان کی غلطی کی وجہ سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ اس کے بعد Correct remedy تلاش کر لیجیے اور جب آپ Corrective measures لے لیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن مسئلہ حل ہو جانے کے باوجود اگلا قدم یہ ہے کہ آپ Preventive measures لے لیجیے تا کہ آئندہ غلطی کا امکان نہ رہے۔

یہ جو ہم Opportunities کی کمی اور بے روزگاری کا گلہ کرتے ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ دیگر معاملات کی طرح اسے بھی ہم Systematic طریقے سے نہیں سوچتے۔ ایک طرف عوام کا گلہ ہے کہ نوکریاں نہیں ملتیں تو دوسری طرف Employers کا شکوہ کہ اچھے Employees نہیں مل رہے۔ دونوں طرف مسائل ہیں۔ ان کے حل کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اصل مسئلہ کی شناخت کر لی جائے۔ میری رائے میں جب تک ہم Professional skills کو Improve نہیں کر لیتے اور ہماری Approach پروفیشنل نہیں ہو جاتی۔ تب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

اب رہ گئی آپ کی دوسری بات کہ کچھ کمپنیاں یا ادارے اپنے کاروبار میں Unfair طریقے استعمال کر رہے ہیں۔ جب چاروں طرف ایک خاص قسم کا چلن فیشن بن گیا ہو تو آپ کہاں جا کر جائز طریقے سے رزق کمانے والی کمپنی تلاش کریں گے؟ اس کا آسان حل تو یہ ہے کہ بے کار نہ بیٹھیں۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی حد تک پوری ایمان داری اور دیانت داری سے کام کرتے رہیں۔ آپ اپنی Responsibilities کو مکمل دیانت داری سے نبھاتے جائیں۔ اپنی حد تک کوئی غلط کام نہ کریں۔ مختصر یہ کہ ایمان داری کے برعکس کام کرنے والوں کے لیے جگہ خالی مت کریں۔ آپ اپنی حد تک ایمان دار رہیں۔ کم سے کم آپ کی صورت اس ملک کو ایک ایمان دار شخص مل جائے گا۔ سچائی کا جھنڈا ہاتھ سے مت گرنے دیں۔ بس آپ اپنے حصے کی شمع جلائے رکھیے۔

سوال (الف) کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کا رزق، عمر، مذہب اور اعمال اُس کے دنیا میں آنے سے قبل ہی لوحِ محفوظ پر تحریر کیے جا چکے ہوتے ہیں۔ پھر جزا اور سزا سے ہمارا کیا تعلق؟

(ب) جب کسی کام کا نتیجہ ہماری مرضی کے برعکس نکلتا ہے تو ہم بے دلی سے کہتے ہیں جو رب کی مرضی۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: بدقسمتی سے ہم نے اپنے مفاد کے لیے ان چیزوں کو غلط رنگ دے دیا۔ ان کا مطلب وہ نہیں جو ہم سمجھتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے انسان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ یا نمبر تو (Two) بنا کر بھیجا۔ جس طرح دنیا میں یہ دستور ہے کہ کسی Department کا نمبر 2 ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ (Head of the Department) کی پالیسی پر چلنے کا پابند ہوتا ہے لیکن وہ بے اختیار بالکل نہیں ہوتا۔ Department کا

Head اپنے نمبر 2 کو کچھ اختیارات ازخود عطا کرتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب اور نمبر 2 بنایا تو اُسے تین قسم کے اختیارات سے نوازا۔

اللہ نے انسان کو سوچنے، فیصلہ کرنے اور عمل کرنے کی آزادی عطا کی لیکن ساتھ ہی کچھ حدود بھی مقرر کر دیں اور اوامر و نواہی کی پیروی کے مطابق سزا و جزا کا تصور دے دیا۔

اگر سب چیزیں معین اور پہلے سے تحریر شدہ ہیں پھر تو ہر خلاف ورزی پر کوئی نہ کوئی فرشتہ میرے پاس آ جانا چاہیے کہ تم یہاں حدود سے تجاوز کر رہے ہو لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

اگر اللہ ہمیں توفیق دے اور ہم برائی کے کام چھوڑ کر نیکی کے کاموں کی جانب راغب ہو جائیں تب بھی کوئی فرشتہ آ کر ہمیں شاباش نہیں دے گا۔

دراصل اللہ نے ہمیں تین قسم کی آزادی اور اختیارات دے کر یہ بھی بتا دیا کہ ہماری حدود کیا ہیں؟ اگر میں اللہ کی بتائی ہوئی حدود کے اندر رہ کر کام کروں گا، اس کے احکامات کی پیروی کروں گا تو اجر پاؤں گا۔ اس کے منع کردہ کاموں میں حصہ لوں گا تو مجھے سزا ملے گی۔

تقدیر دو طرح کی ہے:

1۔ تقدیر معین

2۔ تقدیر معلق

تقدیر معین حد ٹوٹل تقدیر کا بمشکل پانچ فی صد ہے۔ باقی 95 فی صد تقدیر معلق ہے جو ہمارے اپنے اختیار میں ہے کہ ہم جیسے چاہیں اُسے لکھوا لیں۔ ہم اس سلسلے میں اپنے اختیار کو جس انداز میں استعمال کریں گے اسی کی بنیاد پر ہمیں سزا یا جزا ملے گی۔

موت تقدیر معین کا حصہ ہے۔ موت کا وقت، طریقہ اور جگہ ۔۔۔۔۔ یہ تینوں چیزیں مقرر ہیں۔

آپ کا یہ سوال کہ جب ہمارے کسی کام کا نتیجہ ہماری مرضی کے خلاف نکلتا ہے تو ہم بے دلی سے کہتے ہیں "جو اللہ کی مرضی"۔ دراصل یہ ہمارے رویے ہیں۔ اللہ مسلمانوں سے اس سے بڑھ کر توقع رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم جب بھی کوئی کام کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اللہ کی عطا کردہ تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر کے بہترین حکمت عملی ترتیب دیں۔ اس کے بعد اس حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور جسمانی طاقت کا بھرپور استعمال کریں۔ پھر اللہ سے دعا کریں "یا باری تعالیٰ! تو نے جو بھی ذہنی اور جسمانی قوتیں عطا فرمائی تھیں میں نے ان سے حتی الوسع کام لیا اور انسانی حد تک کوشش کر لی ہے۔ تو بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا بہتر اور کیا برا ہے۔ تو مجھے اس کا وہ نتیجہ عطا فرما جو میرے حق میں بہترین ہو"۔

اس دعا کے بعد صدق دل سے اپنی کوشش کا انجام رب تعالیٰ پر چھوڑ دیں اور اس کی طرف سے جو بھی فیصلہ آئے وہ خوش دلی سے قبول کر لیں۔

اس بات کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال دیتا ہوں۔ فرض کریں میرے ذہن کے مطابق ایک جاب بہت اچھی ہے۔ میں اس کے لیے Apply کرتا ہوں۔ Test کے لیے بھرپور محنت کرتا ہوں۔ اس میں پاس ہو جانے کے بعد مکمل تیاری کے ساتھ Well-dressed ہو کر انٹرویو دینے چلا جاتا ہوں۔ پوچھے گئے سوالات کے اپنی قابلیت کے مطابق دل جمعی سے جواب دیتا ہوں۔ باہر آ کر دعا کرتا ہوں "یا باری تعالیٰ! روزگار کا وسیلہ پیدا کرنا تیرا کام اور اسے تلاش کرنا میرا کام ہے۔ میں نے اپنا کام اپنی قابلیت کے مطابق بہترین انداز میں کر لیا ہے۔ اب تو میری اس کوشش کا وہ نتیجہ مجھے عطا فرما دے جو میرے حق میں بہترین ہو۔"

کوشش اور دعا کرنے کے بعد میں بے فکر ہو جاؤں اور اس انٹرویو کا جو بھی Result آئے اسے خوشی خوشی قبول کر لوں۔ جاب مل جائے تو اللہ کا شکر ادا کروں۔ جاب نہ ملے تو بھی مطمئن رہوں کہ ایسا ہونا ہی میرے حق میں بہتر تھا کیوں کہ میرا رب ہر چیز مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اللہ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کو پسند کرتا ہے کہ حتی الوسع کوشش اور محنت کے بعد دعا کی جائے اور پھر نتیجہ اللہ پہ چھوڑ دیا جائے۔ جو بھی فیصلہ رب تعالیٰ کی طرف سے آئے اسے دل سے قبول کر لیں نہ کہ اس انداز میں کہ انگور کھٹے ہیں۔

سوال: کیا رزق کا تعلق تقدیر سے ہے؟

جواب: یو کے میں نوجوانوں نے مجھ سے پوچھا کہ جب رازق رب تعالیٰ ہے اور اس نے ہر حال میں ہمیں رزق فراہم کرنا ہے تو جو رزق ہماری تقدیر میں لکھا جا چکا وہ تو ہمیں ہر صورت مل کر ہی رہے گا۔ پھر ہم تگ و دو کیوں کریں۔

میں نے عرض کیا کہ یو کے ایک ویلفیئر اسٹیٹ ہے۔ اس کی حکومت اپنے باشندوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اگر ایک آدمی کام نہیں کرتا تو حکومت اسے رہنے کے لیے ٹھکانا، علاج معالجے کی سہولتیں اور بے روزگاری الاؤنس دیتی ہے لیکن یہ سب کچھ Limited ہوتا ہے۔ آپ کو ایک Studio Flat اور 45 پونڈ ماہانہ الاؤنس میں گزارا کرنا ہوگا۔ اگر آپ پرآسائش اور مزے کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو آپ کو محنت اور کوشش کرنا ہوگی۔ وہ رزق جو سب کو بہم پہنچانے کا رب تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے وہ ان Minimum needs کو پورا کرنے والا رزق ہے۔ لیکن اگر ہم اس سے اونچے درجے کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں محنت کرنا ہوگی۔ قرآن پاک میں واضح کر دیا گیا "انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے۔"

سوال: چیونٹی، چوہا اور انسان رزق جمع کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: رب تعالیٰ نے ہر جان دار کے اندر ایک جبلت رکھی ہے۔ کچھ جان دار موسم سرما میں اپنے بل میں Hibernation میں چلے جاتے ہیں۔ اس عرصے میں وہ بہت کم کیلوریز Consume کرتے ہیں۔ یوں وہ موسم سرما سوتے سوتے گزار دیتے ہیں۔ موسم بہار میں وہ بلوں سے باہر آ جاتے ہیں اور شکار کر کے گزارہ کرتے ہیں اور یوں اپنی Lost energies کو Restore کر لیتے ہیں اور Fats اور Proteins اپنے

اندر جمع کر لیتے ہیں۔

اسی طرح کچھ جان دار موسمِ سرما میں Hibernation میں تو نہیں جاتے لیکن Inactive ہو جاتے ہیں۔ موسمِ سرما میں زندہ رہنے کے لیے وہ اپنے بل میں کچھ سامان جمع کر لیتے ہیں۔

کچھ جان دار Active تو رہتے ہیں لیکن بہت کم۔ وہ بھی اپنے لیے سامان جمع کر لیتے ہیں۔ یہ سب عمل جان دار اپنی جبلت کے تحت کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں اُن کی عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ رہنے کا سلیقہ اسی جبلت کے تحت سکھایا۔ چیونٹی اور چوہا اسی جبلت کے تحت رزق اکٹھا کرتے ہیں جب کہ انسان جبلت کے ساتھ ساتھ عقل سے بھی کام لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ آڑے وقت کی ضروریات کے پیشِ نظر پیسہ جمع کر لوں۔ جانور اور انسان میں ایک ہی فرق ہے کہ جانور محض جبلت جب کہ انسان جبلت کے ساتھ ساتھ عقل سے بھی کام لیتا ہے۔

رُوحانیت اور رَوّیے

کچھ لوگ رُوحانیت کے حصول کی جستجو میں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ جن کو اللہ نے توفیق بخشی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جن لوگوں پر اس سے بھی زیادہ اللہ کی رحمت ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دوستی کے متلاشی رہتے ہیں۔ یہ تینوں چیزیں سوائے اتفاق صرف اور صرف نیکی سے حاصل ہوتی ہیں۔

عبادات اور نیکی دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ عبادات کے نتیجے میں انسان کو پارسائی تو مل جاتی ہے اور نیکی کی طرف جانا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے لیکن عبادات کی وجہ سے رب نہیں ملتا۔ رب صرف نیکی سے ملتا ہے اور نیکی کی آسان ترین اور مختصر ترین Definition یہ ہے کہ انسان اپنے تمام حقوق، اپنی تمام خواہشات، اپنا آرام، اپنی ضروریات، دوسروں کی ضروریات، خواہشات اور ان کے آرام کے لیے قربان کر دے۔ اگر قربان نہ کر سکے تو کم از کم Prefer ضرور کرے۔ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح ضرور دے۔ یہ نیکی ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور احتیاط لازم ہے کہ کسی طور بھی کسی کا حق ہمارے ذمہ نہ رہ جائے۔ وہ لوگ جن کے حقوق ہمارے ذمہ ہیں، ہم وہ حقوق پوری تندہی اور دیانت داری سے ادا کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز کی ہم احتیاط کر لیں کہ کسی کا حق نہ ماریں۔

موجودہ دور میں انسان بہت حد تک مادہ پرست ہو گیا ہے۔ اگرچہ ہم میں سے کوئی بھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرے گا اور نہ ہی ہمیں احساس ہو گا کہ ہم کس قدر مادہ پرست ہو چکے ہیں۔ حالانکہ مسلمان اور مادہ پرستی دو متضاد چیزیں تھیں۔ اگر آپ کو مسجد میں کسی نمازی کے بہت قریب بیٹھنے کا اتفاق ہو اور وہ نمازی ذرا بلند آواز میں دعا مانگ رہا ہو تو اس دعا کو غور سے سنیں۔ رب تعالیٰ سے وہ دنیاوی ضروریات مانگتا ہوا آپ کو سنائی دے گا۔ "یا اللہ! مجھے ترقی دے دے۔ یا اللہ! میرا افسر میری پسند کی جگہ پر کرا دے۔ یا اللہ! میرا رزق وسیع ہو جائے۔ میرا کاروبار چل جائے۔ یا اللہ! میرا بچہ سدھر جائے۔" اس قبیل کی سب دعائیں مانگی جا رہی ہوتی ہیں۔ اگر کبھی کسی سے آپ کہیں کہ صاحب یہ سب کیا ہے۔ تو وہ کبھی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ اس کے نزدیک دنیا اہم ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہے گا۔ "نہیں۔ یہ دنیا تو چار دن کی ہے۔ اس نے تو ختم ہو جانا ہے۔ اصل

زندگی تو آخرت کی ہے۔'' لیکن عجیب بات ہے کہ اس چار روزہ زندگی کا سب سامان اسے چاہیے۔ یہ سب سامان وہ مانگتا بھی ہے رب تعالیٰ سے لیکن دائمی زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتا۔

مسلمان یہ کہتا ضرور ہے کہ اللہ مہربان ہے۔ وہ معاف فرمانے والا ہے۔ رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ عذاب بھی دینے والا ہے لیکن اس کے باوجود وہ نہ کبھی اس سے رحم مانگے گا نہ کبھی اس کی محبت مانگے گا۔ انسان مانگتا وہی کچھ ہے جس چیز کی اہمیت اس کی نظر میں زیادہ ہوتی ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی نے ہمارے اندر مادہ پرستی بہت زیادہ ابھار دی ہے۔ ہم ہر چیز کو صرف اور صرف اسی حوالے سے ناپتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی کا حق نہ ماریے تو ہمارا ذہن فوراً کسی کے مال وزر کی طرف جاتا ہے کہ کسی کا قرض ہمارے ذمہ نہ رہ جائے۔ کسی کی ہم چوری نہ کر لیں۔ یقیناً یہ بھی دوسروں کا حق مارنے والی ہی بات ہے لیکن کچھ دیگر معاملات بھی ہیں جن کی طرف ہماری توجہ نہیں جاتی۔ جس کی وجہ سے ہم دوسرے مسلمان بھائیوں اور انسانوں کا حق مارتے رہتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ اس پر بھی سزا اور پوچھ گچھ ہوگی اور اسی انداز میں ہوگی جس انداز میں کسی کا روپیہ پیسہ بغیر اس کی اجازت کے کھا لیا جائے یا کسی کی جائداد پر قبضہ کر لیا جائے تو ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم صبح سے شام تک وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ہم کسی کی غیبت کر رہے ہوتے ہیں تو کسی کی عیب جوئی میں مگن ہوتے ہیں۔ یوں اس کی عزت پر دھبا لگا رہے ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے ایک حدیث کے مطابق ایک مسلمان کی عزت دوسرے پر حرام ہے۔ کسی کی غیبت کرنا، عیب جوئی کرنا بھی حق مارنے کے برابر ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ پوچھ گچھ ہوگی۔

آپ ﷺ نے ایک بار صحابہ کرام سے فرمایا کہ انسان کے حساب کتاب کے تین دفتر ہیں۔ ایک دفتر وہ ہے جس میں لکھے ہوئے حساب کتاب کو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے معاف فرما دے گا۔ دوسرا دفتر وہ ہے جس میں لکھے گئے حساب کتاب کو رب تعالیٰ معاوضہ لے کر معاف فرما دے گا اور ایک دفتر وہ ہے جس میں لکھے ہوئے حساب کتاب کو رب تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ اس میں شرک کے متعلق انسان کے اعمال لکھے جائیں گے جسے کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جائے گا۔

وہ دفتر جس میں لکھے ہوئے اعمال کو رب تعالیٰ معاوضہ لے کر معاف فرمائے گا وہ دفتر حقوق العباد سے متعلق ہے اور معاوضہ اس صورت میں نہیں ہے کہ رب تعالیٰ اس کی آپ سے کوئی قیمت وصول کرے گا بلکہ ہم میں سے جس آدمی نے کسی کا حق مارا یا کسی پر ظلم کیا ہوگا وہ آدمی سامنے آئے گا اور اللہ کے حضور اپنا Claim (دعویٰ) پیش کرے گا تو ہمارے نامہ اعمال کی نیکیاں اس ظلم کے بدلے اس انسان کو دے دی جائیں گی جس کا ہم نے حق مارا ہوگا ——— اسی طرح لوگ اپنا نامہ اعمال یا Claim لاتے رہیں گے اور ہماری نیکیاں لے کر جاتے جائیں گے۔ جب ہماری نیکیوں کی تعداد ختم ہو جائے گی اور پھر بھی کوئی دعویٰ دار موجود ہوگا تو رب تعالیٰ اس دعویٰ دار کی برائیوں کو ہمارے نامہ اعمال میں ڈال دے گا۔ یوں اس کی برائیاں کم ہو جائیں گی اور ہمارے نامہ اعمال کی برائیاں بڑھ جائیں گی۔ اس طرح دوسروں کے کیے کی سزا یہ آدمی صرف ان کا حق

زندگی تو آخرت کی ہے۔" لیکن عجیب بات ہے کہ اس چار روزہ زندگی کا سب سامان اسے چاہیے۔ یہ سب سامان وہ مانگتا بھی ہے رب تعالیٰ سے لیکن دائمی زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتا۔

مسلمان یہ کہتا ضرور ہے کہ اللہ مہربان ہے۔ وہ معاف فرمانے والا ہے۔ رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ عذاب بھی دینے والا ہے لیکن اس کے باوجود وہ نہ کبھی اس سے رحم مانگے گا نہ کبھی اس کی محبت مانگے گا۔ انسان مانگتا وہی ہے جس چیز کی اہمیت اس کی نظر میں زیادہ ہوتی ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی نے ہمارے اندر مادہ پرستی بہت زیادہ بھر دی ہے۔ ہم ہر چیز کو صرف اور صرف اسی حوالے سے دیکھتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی کا حق نہ ماریے تو ہمارا ذہن فوراً کسی کے مال و زر کی طرف جاتا ہے کہ کسی کا قرض ہمارے ذمہ نہ رہ جائے۔ کسی کی ہم چوری نہ کر لیں۔ یقیناً یہ بھی دوسروں کا حق مارنے والی ہی بات ہے لیکن کچھ دیگر معاملات بھی ہیں جن کی طرف ہماری توجہ نہیں جاتی۔ جس کی وجہ سے ہم دوسرے مسلمان بھائیوں اور انسانوں کا حق مارتے رہتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ اس پر بھی سزا اور پوچھ گچھ ہوگی اور اسی انداز میں ہوگی جس انداز میں کسی کا روپیہ پیسہ بغیر اس کی اجازت کے کھا لیا جائے یا کسی کی جائیداد پر قبضہ کر لیا جائے تو ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم صبح سے شام تک وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ہم کسی کی غیبت کر رہے ہوتے ہیں تو کسی کی عیب جوئی میں مگن ہوتے ہیں۔ یوں اس کی عزت پر دھبا لگا رہے ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے ایک حدیث کے مطابق ایک مسلمان کی عزت دوسرے پر حرام ہے۔ کسی کی غیبت کرنا، عیب جوئی کرنا بھی حق مارنے کے برابر ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ پوچھ گچھ ہوگی۔

آپ ﷺ نے ایک بار صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ انسان کے حساب کتاب کے تین دفتر ہیں۔ ایک دفتر وہ ہے جس میں لکھے ہوئے حساب کتاب کو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے معاف فرما دے گا۔ دوسرا دفتر وہ ہے جس میں لکھے گئے حساب کتاب کو رب تعالیٰ معاوضہ لے کر معاف فرما دے گا اور ایک دفتر وہ ہے جس میں لکھے ہوئے حساب کتاب کو رب تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ اس میں شرک کے متعلق انسان کے اعمال لکھے جائیں گے جسے کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جائے گا۔

وہ دفتر جس میں لکھے ہوئے اعمال کو رب تعالیٰ معاوضہ لے کر معاف فرما دے گا وہ دفتر حقوق العباد سے متعلق ہے اور معاوضہ اس صورت میں نہیں ہے کہ رب تعالیٰ اس کی آپ سے کوئی قیمت وصول کرے گا بلکہ ہم میں سے جس آدمی نے کسی کا حق مارا یا کسی پر ظلم کیا ہو گا وہ آدمی سامنے آئے گا اور اللہ کے حضور اپنا Claim (دعویٰ) پیش کرے گا تو ہمارے نامۂ اعمال کی نیکیاں اس ظلم کے بدلے اس انسان کو دے دی جائیں گی جس کا ہم نے حق مارا ہوگا۔ اسی طرح لوگ اپنا نامۂ اعمال یا Claim لاتے رہیں گے اور ہماری نیکیاں لے کر جاتے جائیں گے۔ جب ہماری نیکیوں کی تعداد ختم ہو جائے گی اور پھر بھی کوئی دعویٰ دار موجود ہوگا تو رب تعالیٰ اس دعویٰ دار کی برائیوں کو ہمارے نامۂ اعمال میں ڈال دے گا۔ یوں اس کی برائیاں کم ہو جائیں گی اور ہمارے نامۂ اعمال کی برائیاں بڑھ جائیں گی۔ اس طرح دوسروں کے کیے کی سزا آدمی صرف ان کا حق

مارنے کی وجہ سے بھگتے گا۔ ایسے اعمال جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے معاف فرما دے گا وہ حقوق اللہ سے متعلق ہیں۔

اگر ہم روحانیت کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں تو ہمیں دوسروں کا حق مارنے سے اجتناب کرنا ہوگا۔ کسی کو قصور کرنے سے پہلے ہی یوں معاف کرنا ہوگا کہ لوگوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کر کے انھیں مسکرا کر ٹال دینا سیکھنا ہوگا۔

ہماری زندگی کے چار حصے ہیں اور ہم چار ہی ماسک اپنے چہرے پر لگاتے ہیں۔ فقیر ایک وقت میں چار ماسک چہرے پر رکھتا ہے۔ جب وہ کام کاج کے لیے جاتا ہے تو جونہی وہ Office میں قدم رکھتا ہے تو بہت Rude administrator (سخت مزاج منتظم) بن جاتا ہے۔ وہ دفتری معاملات میں کسی کی ہلکی سی کوتاہی بھی برداشت نہیں کرتا۔ Rather he makes sure کہ جس آدمی نے غلطی کی ہے اسے اس غلطی کی سزا ضرور ملنی چاہیے اور جس آدمی نے اچھا کام کیا ہے اسے اس کا Reward ضرور ملنا چاہیے۔ فقیر اس معاملے میں تمیز اور تفریق روا نہیں رکھتا کہ کون اس کا دوست اور کون اس کا دشمن ہے اور کون اس کا رشتے دار ہے۔ وہ کسی کو سزا یا انعام دیتے وقت ذاتی پسند یا ناپسند کو مد نظر نہیں رکھتا۔ وہ آنکھوں پر پٹی باندھ لیتا ہے اور پوری ایمان داری کے ساتھ سزا دیتا ہے۔ اگر ہم بھی اپنے آفس، گھر یا کاروباری مقام پر یہی رویہ رکھیں تو ہمیں بہترین کامیابی نصیب ہوگی۔

اس کی بہترین مثال حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام دورِ حکومت میں Management کے اسی Golden principle (سنہرے اصول) پر عمل کیا۔ کوئی شخص خواہ کتنے بڑے مقام و مرتبے کا حامل تھا، اگر اس نے کوتاہی یا غلطی کی تو حضرت عمر فاروقؓ نے اسے پوری قوت سے سزا دی۔ خود اپنے ہی بیٹے کو دُرّے مارے۔ بیٹے پر بھی وہی سزا اسی طرح لاگو ہوئی جس طرح تمام لوگوں پر ہوتی تھی۔ اسی طرح جن لوگوں نے اچھے کام کیے ان کو دل کھول کر اس کا انعام عطا کیا۔ ایک فقیر جب Rude administrator (سخت مزاج منتظم) بنتا ہے تو اس کی اپنی ذات ختم ہو جاتی ہے۔

دوسرا ماسک فقیر اس وقت پہنتا ہے جب وہ دفتر سے باہر قدم نکالتا ہے۔ وہی ماتحت جس کو اس نے بڑی بے رحمی سے سزا دی ہوتی ہے اسے دیکھتا ہے کہ وہ گھر کا سامان اٹھائے جا رہا ہے اور اس سے چلا نہیں جا رہا۔ یہ فقیر جا کر اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا ہے اور اسے گھر تک چھوڑ کر آتا ہے۔ اسی ماتحت کے ساتھ Buddyism اور Comradism چلتا ہے۔ یہاں وہ آفیسر کی بجائے Cooperative, Helpful اور Considerate ہوتا ہے۔ یہ رویہ اس کا اپنے سارے دوستوں، رفقائے کار، ماتحتوں اور Seniors کے لیے ہوتا ہے۔ جونہی وہ فقیر گھر میں داخل ہوتا ہے تو بہت فرماں بردار بیٹا، Loving husband اور بہت Loving father کا ماسک لگا لیتا ہے۔ فقیر کا تیسرا ماسک تمام گھریلو رشتوں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ گھر میں اپنے ساتھ رہنے والے دوسرے افراد کے لیے ایسا سایہ دار درخت بن جاتا ہے جس کے نیچے آ کر یہ تمام رشتے

سکون اور سکھ محسوس کرتے ہیں۔

فقیر کا چوتھا مالک بحیثیت دوست اور رشتہ دار کے ہے۔ تمام دوستوں کے لیے وہ بہت اچھا انسان ہوتا ہے اور رشتہ داروں کے لیے وہ باعثِ رحمت رہے گا۔

جب تک فقیر یہ چار مالک اپنے چہرے پر نہیں لگا لیتا وہ کامیاب فقیر نہیں ہوتا۔ جب تک وہ دُنیا میں رہے گا تو دُنیاوی کام اس احسن انداز میں سرانجام دے گا کہ وہ دُنیاداروں سے زیادہ دُنیادار دکھائی دے گا۔ وہاں اس کے اندر آپ کو فقیری کی جھلک دور تک دکھائی نہیں دے گی اور جب وہ دین داری پر آئے گا تو دین داروں سے کہیں زیادہ دین دار دکھائی دے گا۔ کیوں کہ وہ ہر چیز کو Separate compartment میں رکھ کر چلاتا ہے۔ اس کی دُنیاداری بھی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہوتی ہے۔

جب تک ہم حق کو پہچاننا شروع نہیں کریں گے، دوسروں کے privileges اور Rights کو نہیں جانیں گے ہم رُوحانیت کی راہ پر نہیں چل سکتے۔

لوگ اکثر فخریہ انداز میں کہتے ہیں "صاحب! میں تو انصاف پر چلتا ہوں۔" رُوحانیت میں انصاف بہت کم تر درجہ ہے۔ فقیر کے ہاں انصاف Dealings (معاملات) کی Lowest degree ہے۔ انصاف Starting point ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہمارے تمام معاملات مبنی بر انصاف ہوں۔

This is the minimum requirement from the Muslims.

اور ہم اس کم از کم Requirement کو پورا کر کے فخر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ انصاف سے بہتر درجہ ایثار کا ہے جس میں انسان دوسروں کے ساتھ کیے گئے تمام معاملات کی Base انصاف ہی کو بناتا ہے لیکن جب وہ عمل کرتا ہے تو اس میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔ اپنے حقوق کو چھوڑ کر دوسرے کے ترازو میں ڈال دیتا ہے۔ یوں اس کے حقوق بھی دوسرے کے پلڑے میں چلے جاتے ہیں۔ یہ ایثار ہے۔

اگر ہم نے ایک کاروبار شروع کیا ہے اور اس میں منافع پچاس پچاس کی بنیاد پر طے کیا ہے۔ سو روپے منافع آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ پچاس روپے آپ کے اور پچاس روپے میرے۔ یہ انصاف ہے۔ لیکن اگر ہم منافع تقسیم کرتے ہوئے اپنے بزنس پارٹنر کو پچاس کے بجائے ستر روپے دے دیں تو یہ ایثار ہے۔ ایثار سے بھی اعلیٰ درجہ قربانی کا ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ چل یار کوئی بات نہیں میں اس روپے میں گزارہ کر لوں گا۔ کیا ہوا مجھے تھوڑا Tight ہی ہو جائے گا۔ خود سے یہ ساری گفتگو کرنے کے بعد وہ اپنے بزنس پارٹنر کے پاس جا کر کہتا ہے کہ از روئے معاہدہ پچاس روپے منافع پر تو آپ کا حق ہے۔ یہ لے لیجیے۔ درحقیقت میرے پاس پہلے سے کچھ رقم پڑی ہے اور میری کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ پیسے میرے پاس بے کار پڑے رہیں گے۔ میری طرف سے یہ پچاس روپے تحفے کے طور پر آپ لے لیجیے۔

اب حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت آپ کو بھی ان پیسوں کی اشد ضرورت ہے لیکن آپ اپنے آپ کو Tight کر کے اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر وہ رقم اپنے ضرورت مند بزنس پارٹنر کو دے دیتے ہیں اور اپنی

ضروریات پر صبر کرتے ہیں۔ یہ قربانی ہے۔ فقیر بہت خاموشی سے قربانی کی راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی کو اس قربانی کا احساس تک نہ ہو۔

اس ضمن میں یہ بھی عرض کروں کہ فقیر آدمی ہمیشہ حلال کی روٹی کھاتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں بہت محتاط ہوتا ہے۔ اسی لیے اہلِ فقر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کے گھر جا کر کھانا نہیں کھاتے۔ اگر فقیر کسی کی دعوت قبول کرے گا تو اس سے پہلے یہ یقین کرے گا کہ اس کا رزق حلال ہے۔ کیوں کہ جو لقمہ ہمارے حلق سے نیچے اترا ہے جب وہ ہمارا جزو بدن بنے گا تو اس کے اثرات ہمارے اعمال پر ضرور آئیں گے۔ اگر ہم نے حرام کھایا تو ہمارا نفس اتنا ہی پھل پھول جائے گا اور اسی قدر طاقتور ہو جائے گا۔ یہ طاقتور نفس ہماری نیکی کی Urge پر قابو پائے گا اور ہم غلط راہوں پر چل نکلیں گے۔ اگر ہمارا لقمہ حلال کا ہے تو دن بدن ہمارے گناہوں میں کمی واقع ہوتی جائے گی۔ اس لیے کمائی کے بارے میں بہت محتاط رہیں۔

اگر آپ کو روحانیت کی راہ پر چلنا ہے تو حلال کھانا کھائیں۔ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائیں۔ لیکن یہ نہیں کہ انسان شور مچائے کہ صاحب میں تو کسی کے ہاں جا کر کھانا نہیں کھاتا کہ نہ جانے اس کی کمائی حلال ہے یا حرام۔ یہ نہایت غیر مناسب رویہ ہے۔ کسی جگہ نہ جانے کے سو بہانے ہوتے ہیں۔ آپ دعوت دینے والے شخص کو اپنے ہاں مدعو کر لیجیے۔ یہ کہہ کر Avoid کر لیجیے کہ صاحب میں آپ کی طرف آؤں گا تو ایک گھنٹہ آنے اور ایک گھنٹہ جانے میں لگ جائے گا۔ پھر وہاں بیٹھنا بھی پڑے گا۔ اتنی دیر جو لوگ میرے پاس آتے رہتے ہیں ان کا نقصان ہوگا۔ آپ کیوں نہیں تشریف لے آتے میرے پاس۔ مقصد تو اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانا ہے۔ یہاں میرے پاس بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔ لیجیے ٹل گیا معاملہ۔ دوسروں کو اپنے ہاں کھانا کھلا دیجیے۔

جتنے بھی بزرگ گزرے ہیں وہ لقمہ حلال کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ روحانیت کی راہ میں آپ بھی اس بات کا دھیان رکھیں کہ حلق سے نیچے اترنے والا لقمہ ہر صورت میں حلال ہو، حرام کا نہ ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ روحانیت کی راہ مشکل ہے۔ یہ راہ تو بہت آسان ہے۔ بس محتاط ہو کر اس راہ پر چلنے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے تو دنیا کو کانٹوں کی راہ گزر کہا گیا ہے۔ کسی کا حق مارنا، اپنی کمائی میں غیر محتاط ہونا ـــــ یہ کانٹے ہی تو ہیں۔

اگر آپ اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں تو ہر ہر قدم پر آپ کو احتیاط کرنا ہوگی۔ چونکہ ہم معاشرتی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہماری Social Values اس قدر Overwhelming ہیں کہ اکثر ہمیں اللہ تعالیٰ کے احکامات سے غافل کر دیتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہن بھائیوں نے مذاق میں بھی کوئی بات کر دی تو ہم ان سے ناراض ہو جاتے ہیں اور دل میں گلہ شکوہ پال بیٹھتے ہیں۔ وہ گلہ شکوہ جو ایک بار دل میں آ گیا وہ دل میں سیاہی پھیلانے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ دل کا نور ختم ہو جاتا ہے۔ جب دل میں کینہ اور بغض اپنی جگہ بنا لے تو ہم موقع ملتے ہی اپنے بہن بھائیوں سے گلہ شکوہ کرنے لگتے

ہیں جو کہ سنت کے خلاف ہے۔

فقیر کے ہاں تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ جہاں کوئی ایسی بات ہوئی ایک قہقہہ لگایا اور بات کو فراموش کر دیا۔ سارے گلے شکوے ایک قہقہے میں اُڑا دیے۔ اگر آپ رُوحانیت کی راہ پر چلنے کے خواہش مند ہیں تو لوگوں کی تیخ وشیریں باتوں کو مسکرا کر ٹال جائیں۔ یہ کینہ اکثر اس راہ میں مانع ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، دوستوں یا بہن بھائیوں سے تین دن سے زیادہ ناراض رہے یا قطع تعلق کرے۔

ایک ہم ہیں کہ ناراض ہو کر بیٹھ جاتے ہیں تو مہینوں اور سالوں تک پھر کسی کی خبر نہیں لیتے۔ یہ ہماری کس قسم کی رُوحانیت ہے؟ یہ ہماری اللہ تعالیٰ سے کس قسم کی چاہ ہے جو ہمیں آپ ﷺ کے علم کے خلاف عمل کرنے پر اُکساتی ہے؟

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو ہم اپنی لاعلمی کی وجہ سے Innocence میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ہم شکوہ کرتے ہیں کہ سب کچھ کرتا ہوں رُوحانیت پھر بھی حاصل نہیں ہوتی۔ دراصل یہ چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں ہیں جو ہمیں اس راہ پر آگے نہیں جانے دیتیں۔ اگر ہم ان کوتاہیوں پر قابو پالیں تو زندگی آسان ہو جائے گی۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک محفل میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آیا اور بغیر کسی وجہ کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بے تحاشا بُرا بھلا کہنے لگا۔ سب صحابہ کرامؓ کو بہت غصہ آیا کہ یہ شخص بلاوجہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سب کچھ بہت خاموشی اور تحمل سے سن رہے تھے اور آپ ﷺ یہ سب کچھ دیکھ کر مسکراتے جا رہے تھے۔ جب اس شخص کا نازیبا رویہ حد سے بڑھ گیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی کسی بات کا جواب دے دیا۔ جونہی انھوں نے جواب دینا شروع کیا آپ ﷺ اس محفل سے تشریف لے گئے۔ اگلے دن صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ وہ آدمی تو بہت سخت زیادتی کر رہا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ جب تک وہ خاموش رہے آپ ﷺ مسکراتے رہے لیکن جب انھوں نے جواب دینا شروع کیا تو آپ ﷺ اٹھ کر چلے گئے اور اس وقت آپ ﷺ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات بھی تھے۔" آپ ﷺ نے فرمایا "جب تک ابوبکر صدیقؓ اس شخص کے غصے اور زیادتی کو برداشت کرتا رہا تب تک اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مامور کیا ہوا تھا جو ابوبکر صدیقؓ کے Behalf پر اس شخص کو اُن باتوں کا جواب دے رہا تھا لیکن جب اس نے اُن باتوں کا جواب خود دینا شروع کر دیا تو رب تعالیٰ نے اس فرشتے کو واپس بلا لیا۔ اس لیے میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔"

جب کوئی شخص آپ سے زیادتی کرتا ہے تو اس کو برداشت کیجیے اور رب تعالیٰ کو اس زیادتی کا جواب دینے دیجیے۔ کسی کو بھی خود مت جواب دیجیے۔ بڑی خاموشی سے اس زیادتی کو سہہ جائیں۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آئے گی۔

سوال: آپ نے فقیر کے متعلق Masks کا ذکر کیا۔ اس میں عقیدت مندوں کے لیے Mask کا کہیں ذکر نہیں۔ کیا وہ دوستوں، عزیزوں یا ماتحتوں میں آئیں گے؟

جواب: آپ نے شاید غور نہیں فرمایا، میں نے ایک لفظ استعمال کیا تھا Comradism اور Buddyism عقیدت مند یا مرید اسی زمرے میں آئیں گے۔ فقیر ان کے لیے بہت Helpful اور Considerate ہوتا ہے۔

فقیر اپنے تعلقات اور Comradism میں بہت احتیاط ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات اپنے دوستوں کے ساتھ اس انداز میں رکھتا ہے کہ کسی کو یہ احساس نہیں ہو پاتا کہ فقیر کسی کی Favour کر رہا ہے۔ وہ اتنی خاموشی کے ساتھ اتنا چھپا کر دوسروں کی مدد کرتا ہے کہ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

اس سلسلے میں حضرت داتا گنج بخش ؒ کا فرمان بڑے کمال کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں "فقیر پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کی خدمت اس انداز میں کرے کہ خود خدمت لینے والا یہ سمجھے کہ اس نے فقیر سے خدمت لے کر اس پر احسان کیا ہے۔"

1967ء میں جب میں سوئی گیس میں ملازم تھا اور میری عمر 22 سال تھی تب میں "اردو ڈائجسٹ" بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ تب اس میں ایک سلسلہ شائع ہوتا تھا "روشنی کے مینار" جس میں بہترین مسلمانوں کے واقعات کا تذکرہ ہوتا۔ ایسا ہی ایک واقعہ آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ ایک بہت دولت مند سوداگر نے اپنی بیٹی کی منگنی (Engagement) اپنے ہم پلہ خاندان میں کی۔ بدقسمتی سے کچھ عرصے بعد سوداگر کے مالی حالات خراب ہو گئے اور باوجود کوشش کے اس کا کاروبار دن بدن زوال کا شکار ہوتا گیا حتیٰ کہ اس کے گھر میں فاقے راج کرنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود سوداگر نے کسی نہ کسی طرح اپنا بھرم قائم رکھا اور لڑکے والوں پر بیٹی کی شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اب شادی کے لیے کوئی رقم تو تھی نہیں لہٰذا اس نے اپنے ایک قریبی دوست سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس کے پاس گیا اور کہا کہ میرا تمام کاروبار تباہ ہو گیا ہے۔ میں Bankrupt ہو چکا ہوں۔ بس اپنا بھرم رکھے حالات سدھارنے کی کوششوں میں لگا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے کچھ رقم ادھار درکار ہے۔ میں تمہیں وہ جلدی لوٹا دوں گا۔

دوست نے کہا کہ اتنی بھاری رقم تو میرے پاس موجود نہیں۔ فلاں صاحب بہت نیک انسان ہیں تم انہیں میرا حوالہ دینا وہ تمہیں مطلوبہ رقم دے دیں گے۔ جب تمہارے مالی حالات بہتر ہو جائیں تو وہ رقم تم انہیں لوٹا دینا۔ سوداگر پتا کرتے ہوئے ایڈریس پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک بہت نورانی چہرے والے بزرگ تشریف لائے۔ سوداگر نے سلام اور تعارف کے بعد اپنا مدعا بیان کیا۔ جیسے ہی اس نے مدد کی درخواست کی، خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے والے وہ بزرگ ایک دم سے بھڑک اٹھے کہ میں نے کوئی یتیم خانہ کھول رکھا ہے یا پیسے درختوں پر لگتے ہیں کہ جس کو دیکھو منہ اٹھائے مانگنے چلا آ رہا ہے۔ چلو بھاگ جاؤ یہاں

سے۔ کوئی پیسہ نہیں ہے میرے پاس۔

اب یہ سوداگر شہر کا بہت معزز اور بڑا آدمی تھا۔ اس توہین آمیز رویے پر وہ ششدر رہ گیا۔ واپس دوست کے پاس آیا اور سارا قصہ بیان کیا۔ دوست نے حیرت سے کہا: ''اچھا وہ ایسے آدمی ہیں تو نہیں۔ ذرا ٹھیک سے دوبارہ بتاؤ انھوں نے کیا کہا تھا؟'' سوداگر نے ان بزرگ کے الفاظ من و عن دہرا دیے جس پر دوست نے کہا: ''ایک منٹ رکو۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک ہوا۔ میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد میرے پاس کچھ رقم آ گئی تھی اور اتفاق سے وہ اتنی ہی ہے جتنی تم نے مانگی تھی۔'' سوداگر کا وہ دوست گھر کے اندرونی حصے میں گیا اور رقم لا کر اسے دے دی۔ سوداگر نے اس رقم سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ کچھ عرصے بعد وہ گردشِ ایام سے نکل آیا اور اس کے حالات دوبارہ سے ٹھیک ہو گئے۔ تب وہ قرض کی رقم لوٹانے کے لیے اپنے اسی دوست کے پاس پہنچا تو وہ رو رہا تھا۔ سوداگر نے اس کے آنسوؤں کی وجہ پوچھی۔ وہ بولا: ''تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں قرض لینے کے لیے ایک بزرگ کے پاس بھیجا تھا۔ آج ان بزرگ کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں اسی غم میں رو رہا ہوں۔'' سوداگر نے کہا: ''تمہیں تو رونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے کہ ایک شیطان دنیا سے اٹھ گیا۔ وہ انسان تھوڑی تھا۔'' دوست نے کہا: ''ایسا مت کہو۔ وہ بزرگ تو بہت بڑے انسان تھے۔ ان کا روپیہ پیسہ میرے پاس پڑا رہتا تھا اور ہم دونوں کے درمیان یہ طے تھا کہ اگر وہ اس طرح کے الفاظ کہیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس شخص کو اتنی رقم دے دو۔ یوں ہم نے کچھ Code Words مقرر کر رکھے تھے۔ جب تم ان کے پاس گئے تو وہ تمہاری خودداری سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے جو بھی الفاظ تمہیں کہے وہ دراصل Code words تھے کہ جتنی رقم یہ صاحب مانگتے ہیں، انھیں دے دو۔ یہ میری طرف سے ان کی بیٹی کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ اگر پھر بھی یہ لوٹانا چاہیں تو ان کی مرضی۔ ورنہ میں یہ رقم انھیں معاف کرتا ہوں۔''

ان بزرگ نے یہ طریقہ اس لیے اختیار کر رکھا تھا کہ ان سے مدد لینے والے لوگ گلی یا راہ میں انھیں دیکھ کر شرمندہ نہ ہوں اور خود کو احسان تلے دبا ہوا محسوس نہ کریں۔

پس فقیر اپنے ساتھیوں کے بارے میں اتنا محتاط ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کی خدمت کرتا ہے تو اتنی خاموشی سے کرتا ہے کہ خود خدمت لینے والا اس کو گالیاں دیتا رہتا ہے۔ یہ لوگ جو فقیر کے پاس تشریف لے جاتے ہیں جنھیں آپ عقیدت مند کہتے ہیں میں ان کو Comrades اور Buddies یا پارٹنرز کہتا ہوں اور فقیر کے یہاں ان کی بہت اہمیت ہے۔

سوال: Clarity of concept سے کیا مراد ہے؟

جواب: Clarity of concepts یا Clarity of mind دراصل ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم کوئی چیز پڑھتے یا سنتے ہیں تو اس کے Background اور Context کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں جس سے وہ بات ذہن میں واضح ہوتی چلی جاتی ہے اور یوں

ہمارے Concepts clear ہونے لگتے ہیں۔

سوال: انڈسٹری میں کچھ دے دلا کر کام کرانے کا Concept ہے اور نہ چاہتے کے باوجود انسان کو اس میں Involve ہونا پڑتا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اس میں میری رائے تو بڑی شدید ہے اور اپنی اس ذاتی رائے کی وجہ سے میں نے اپنا کاروبار تباہ کر لینا گوارا کر لیا لیکن اس مجبوری کو نہیں اپنایا۔ جب میں انڈسٹری میں داخل ہوا تو اچھے خاصے Large scale پر ایک Paper Mill اور ایک Textile Mill لگائی جو تباہ ہو گئیں لیکن میں نے ان کاروباری مجبوریوں کو Adopt نہیں کیا اور اس راہ پر نہیں چلا۔ مجھے اس پر کوئی Regret نہیں ہے۔ وہ میرا ذاتی عقیدہ اور میرے اپنے اصول تھے جن پر میں نے کوئی Compromise نہیں کیا۔ اب بھی جاب کر رہا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے پیٹ بھر کر روٹی کھاتا ہوں۔

یہاں عرض کروں کہ پوری دنیا میں سات بڑے Groups ہیں جن میں سے ایک جرمن گروپ بھی ہے Ferrostaal کے نام سے۔ اس کا پاکستان میں بھی ایک آفس ہے۔ اس وقت جو صاحب اس آفس کو چلا رہے تھے وہ Delegate For Pakistan کہلاتے تھے۔ انتہائی عبادت گزار اور روحانی والے انسان تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ فرمایا ''میں آپ کے مرشد صاحب کے حضور حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ان سے Appointment لے دیں۔'' میں نے انھیں اجازت لے دی اور انھیں اپنے ساتھ لے گیا۔ انھیں مرشد صاحب کے پاس بٹھا کر خود باہر نکل آیا تاکہ وہ آزادی سے گفتگو کر لیں۔ وہاں سے فراغت کے بعد جب میں انھیں ان کے ہوٹل Drop کرنے جا رہا تھا تو راستے میں انھوں نے خود ہی فرمانا شروع کر دیا ''میں نے آپ کے مرشد صاحب سے ایک بات پوچھی ہے کہ میں یہاں اصل میں پاکستان آپریشن کا انچارج ہوں۔ اپنے کام کروانے کے لیے مجھے مختلف لوگوں کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔ چونکہ میں عبادت کی راہ پر ہوں تو میرا ضمیر مجھے لعن طعن کرتا ہے۔'' میں نے ان سے کہا ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو بتا دیں کہ بڑے شاہ صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔'' (دراصل میں علمی نقطۂ نظر سے یہ بات جاننا چاہتا تھا۔) وہ کہنے لگے ''بڑے شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ یہ لینا اور دینا دونوں صورتوں میں غلط ہے۔ یہ تو رب تعالیٰ کا واضح فیصلہ ہے۔ چونکہ ہم ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں ہمارے لیے اس کے بغیر معاملات نمٹانا ممکن نہیں رہتا تو جس طرح انسان کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے کہ جس میں شراب دوا کے طور پر پینا ضروری ہو جائے تو اس مریض کی جان بچانے کے لیے اس کی صرف اتنی مقدار استعمال کی جا سکتی ہے جتنی کہ شفایاب ہونے کے لیے ضروری ہو لیکن اس اجازت کو عادت نہ بنایا جائے۔''

اسی طرح فاقہ کشی اور غربت کی وجہ سے اگر انسان موت کے قریب پہنچ جائے تو زندگی بچانے کے لیے گھوڑے کا گوشت کھانے کی اجازت ہے۔ اسی طرح اپنی جان بچانے کے لیے بظاہر زبان سے یہ کہہ دینا کہ میں اپنے ایمان سے پھر گیا، جائز ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی شرط ہے کہ جب جان بچ جائے اور کوئی دوسرا

راستہ مند ہے۔ اگرچہ یہ ناپسندیدہ ہے لیکن Survival کے لیے اس پر Compromise کیا جا سکتا ہے۔

میں نے بڑے شاہ صاحب کا موقف اور اپنی ذاتی رائے دونوں آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔ میں اپنے اُصولوں کا اطلاق اپنی ذات کی حد تک کر سکتا ہوں۔ جو کہ میں نے کیا۔ اس کا رزلٹ بھی آپ کے سامنے ہے۔ میں بڑے آرام سے انڈسٹری سے باہر کر دیا گیا۔ تب میں نے دوبارہ نوکری کر لی۔ کیوں کہ Job کے معاملات اور طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں انسان پہلے سے یہ طے کر لیتا ہے کہ صاحب میں فلاں معاملات میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی فلاں معاملہ جاننا چاہوں گا۔ آپ بھی یہ طریقہ کار اپنا لیجیے۔ بہت سے ناپسندیدہ اُمور سے بچ جائیں گے۔

سوال: ہم اکثر معاملات میں پوشیدہ حکمت اور مصلحت نہیں سمجھ پاتے۔ کوئی بھی عمل کرتے ہوئے کہاں سے راہنمائی حاصل کریں؟

جواب: اس کا ایک آسان ترین حل موجود ہے اور وہ یہ کہ جب بھی ہم کوئی قدم اُٹھانے لگیں تو فوراً نظر دوڑائیں کہ آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اس موقع پر کون سا قدم اُٹھایا۔ اس کو نقل کر لیں، وہ عمل عین قرآن اور اللہ کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔

راہِ عمل اور سودی معاملات

دعا کے دوران دو تین خواتین و حضرات نے مجھ سے کچھ معاملات کی وضاحت کے لیے فرمایا تھا چونکہ ہماری گفتگو کی سبھی نشستیں اسی مقصد کے لیے ہیں کہ کسی طرح اسلام کے بارے میں ہمارے Concepts واضح ہو جائیں اور ہم اسلام کو روزمرہ معاملات سے ہٹ کر کوئی علیحدہ چیز نہ سمجھیں۔ ہم اپنے روزمرہ معاملات کو کیسے لے کر چلتے ہیں؟؟ اگر رب تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے ہیں تو پھر سمجھیے کہ ہم اسلام کی راہ پر ہیں۔

ہر نشست میں میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح آسان سے آسان تر راستہ بتا کر آپ کو عمل کی طرف لایا جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس نیت سے تشریف لاتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہماری آپس کی گفتگو کا بہترین فائدہ یہی ہو سکتا ہے کہ کسی طرح ہمارے Concepts clear ہو جائیں اور ہمیں پتا چل جائے کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے تاکہ ہم رب تعالیٰ کی بندگی بہتر انداز میں کر سکیں۔

روحانیت اور تصوف میں انسان کچھ نہیں کرتا ماسوائے کہ اپنی زندگی کو احکامات الٰہی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ابھی ایک صاحب میرے ساتھ گاڑی میں Travel کر رہے تھے۔ اُن کے Business کے حوالے سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے اُن سے عرض کیا ''اگر آپ کے Marketing کے لوگ سچائی پر چلیں اور Customer کو تمام چیزیں نہایت سچائی اور صاف گوئی کے ساتھ بتا دیں اور ایک Fix قیمت کی بنیاد پر کام کریں کہ جو قیمت گاہک کو بتائیں، وہی وصول کریں۔ اس میں اگرچہ کمپنی کو شروع میں تو دقتیں آئیں گی، Sale کم ہو جائے گی لیکن Gradually بلکہ دوبارہ سے Pick up کر جائے گی اور یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔''

جو لوگ رب تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں اُن کو بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ فقیر روحانیت میں ڈوبتا ہے اور روحانیت کے حصول کے سلسلے میں اپنی زندگی کو قرآن اور سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ انعام کے طور پر رب تعالیٰ اُس پر اپنی رحمت فرماتا ہے اور

اسے اپنا قرب عطا فرما دیتا ہے۔

اگر آپ لوگ یہاں علم تصوف کے حصول کے لیے تشریف لاتے ہیں تو یا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلام کے بارے میں ہمارے Concepts clear نہ ہو جائیں۔ اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی کا جائزہ لیں تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ (ماسوائے نیک لوگوں کے) ہماری روزمرہ زندگی کے نناوے فی صد Actions (اعمال) اسلام کی اصل روح اور اصل احکامات سے ہٹ کر ہیں۔ ہم اسلامی احکامات کی پابندی نہیں کرتے اور ہم میں سے اکثریت سے اس لیے ان اسلامی احکامات کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے Concepts clear نہیں ہوتے۔ اسی لیے ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں اور بہت سے معاملات میں Confusion جنم لیتی ہے۔ جیسے ایک خاتون کا سود کے بارے میں سوال تھا ''معمر لوگ یا ایسے حضرات جن کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے وہ عموماً اپنے پیسے کو Defence Certificates یا Fixed Deposit کی صورت میں بینک میں جمع کروا دیتے ہیں اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے گزر بسر کرتے ہیں۔ کیا وہ آمدنی سود شمار ہوگی یا نہیں؟''

دیکھیے! اسلام کے کچھ احکامات ایسے ہیں جن میں کوئی Relaxation نہیں ہے۔ جیسے چوری کے بارے میں حکم ہے کہ ہاتھ کاٹ دیا جائے لیکن ہاتھ کاٹنے کی حد جاری کرنے سے پہلے قاضی پر لازم ہے کہ پہلے وہ جان لے کہ اس شخص نے چوری کیوں کی ہے؟ اگر کسی نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کی کیونکہ اس کے بچے بھوک سے مر رہے تھے اور وہ انھیں اس طرح مرتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ ایسی صورت میں چوری کرنے پر اس کا ہاتھ کاٹنے کی حد جاری نہیں ہوگی۔ ایسے شخص کے لیے مذہب میں Relaxation موجود ہے۔ جس طرح عام حالات میں آپ گھوڑے کا گوشت نہیں کھا سکتے کیونکہ یہ حلال نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی ذریعہ نہ رہ جائے تو جان بچانے کے لیے گھوڑے کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شراب حرام ہے لیکن جان بچانے کے لیے بطور دوا اس کی ایک انتہائی محدود مقدار استعمال کرنے کی اجازت ہے لیکن یہ صرف جان بچانے کے لیے ہے۔ اس کی آڑ لے کر اگر شراب کی خرید و فروخت بھی حلال جانے تو یہ زیادتی ہے۔

ان تمام امور میں کچھ نہ کچھ گنجائش موجود ہے لیکن عجیب بات ہے کہ سود کے سلسلے میں اس قسم کی کوئی Relaxation موجود نہیں ہے۔ سوال میں جس صورت حال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا آسان حل یہ ہے کہ جب آمدنی کا کسی قسم کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو گورنمنٹ کے ایسے اداروں میں اپنی رقم Invest کر لی جائے جہاں Fixed profit نہیں ملتا بلکہ وہاں نفع نقصان کی بنیاد پر سرمایہ کاری ہوتی ہے اور آپ کو اپنی سرمایہ کاری کی نسبت سے نفع یا نقصان میں حصہ دار بننا پڑتا ہے۔ گورنمنٹ کی ان سکیموں میں پیسہ لگانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ آپ کا پیسہ ڈوبنے کا خدشہ کم سے کم ہوگا۔ Defence یا Fixed Deposit Certificate میں چونکہ ایک مخصوص مدت کے لیے رقم جمع کروائی جاتی ہے اور اس کے منافع کی شرح شروع ہی میں طے کر دی جاتی ہے اور یہ منافع Guaranteed ہے اس لیے سود میں شمار ہوتا ہے۔ ایسی آمدنی کو

اپنی ذات پر یا کسی بھی لحاظ سے خرچ کرنا جائز نہیں۔

ایک اور چیز جو میں خالصتاً فقیری اور درویشی نقطۂ نگاہ سے عرض کرنا چاہوں گا کہ ہر چیز کے فائدے اور نقصانات ہوتے ہیں۔ آپ دوا کھاتے ہیں، ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے دوا کی مقدار زیادہ کھا لی یا دو دن کی دس دن کے بجائے پندرہ دن کھا لی تو اس Overdose کی وجہ سے دوائی فائدے کے بجائے نقصان پہنچانا شروع کر دے گی۔ یہ دوائی کی Down side ہے۔ اس میں قصور دوا یا ڈاکٹر کا نہیں بلکہ غلطی آپ کی کم فہمی اور کم علمی کی ہے۔ اسی طرح وہ تلوار جو آپ کی حفاظت کے لیے بنائی گئی ہے اور جو بڑے کام آتی ہے۔ اگر اسی تلوار کو ذرا سی بے پروائی سے کوئی ہاتھ لگا بیٹھے تو عمر بھر کے لیے ہاتھ سے محروم ہو سکتا ہے۔ یہ تلوار کی Down side ہے۔ بالکل اسی طرح ذکر اذکار اور دعا میں بھی ایک اندیشہ باقی رہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا فرض کیا ہے اور کسی Particular معاملے میں رب تعالیٰ کے احکامات کیا ہیں۔

بہت سے لوگ میرے پاس آ کر کہتے ہیں ”شاہ صاحب! میرا آٹھ نو سال کا بچہ میری بات نہیں مانتا۔ دعا کر دیجیے کہ وہ میرا کہنا ماننا شروع کر دے یا میرے جسم میں دردیں ہو رہی ہیں، دَم کر دیجیے یا میں نے بجلی کے میٹر کی Application دی ہوئی ہے۔ دعا کر دیجیے کہ اس کا Demand Notice جاری ہو جائے۔“

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہم تن آسانی دیکھیں یا درپیش مسئلہ میں رب تعالیٰ کا حکم دیکھیں کہ صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے رب کیا فرماتا ہے۔ ساری بات اسی ایک نکتے میں پوشیدہ ہے کہ ہمارے لیے رب تعالیٰ کے حکم کی اہمیت ہے یا پھر اپنی سہولت کی؟

فقیر ہمیشہ رب تعالیٰ کے حکم کو اہمیت و فوقیت دے گا اور رب کے قریب ہو جائے گا۔ رب تعالیٰ سے دوری تو ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ فاصلے خود بڑھا لیتے ہیں اور پھر شکوہ کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی قربت نصیب نہیں ہوتی۔

بچے کی پیدائش پر جو پہلا بہترین تحفہ والدین اُسے دے سکتے ہیں وہ ایک اچھا نام ہے۔ اس کے بعد ان پر فرض ہے کہ وہ اپنے وسائل میں رہتے ہوئے اس کی بہترین تعلیم و تربیت کا بندوبست کریں۔ اگر ہم بچوں کی تعلیم و تربیت محنت سے نہیں کریں گے تو Desired Results حاصل نہیں کر پائیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بچے کی تعلیم و تربیت میں محنت و حکمت دونوں کو کام میں لائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں ”یا اللہ! میرے اندر جو سکت تھی اس کے مطابق میں نے محنت کر لی ہے۔ اب تو میری اس محنت کو قبول فرما لے اور میری اولاد کو نیک اور صالح بنا دے۔“

ایسا نہیں ہے کہ ہم بچے کی تعلیم و تربیت پر توجہ ہی نہ دیں اور جب ناپسندیدہ نتائج آنے لگیں تو بجائے اپنے آپ کو ٹھیک کرنے اور بچے پر محنت کرنے کے ہم دعا کرنے والوں کے پاس دوڑنے لگیں۔ یہ مومن کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ ہمیں بے عملی کی طرف لے جائے گا اور بے عمل سست لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔

اسی طرح ہمارے بہت سے دیگر معاملات ہیں جہاں ہم محنت کرنے کے بجائے دُعا کروانے لگتے ہیں۔ اب بھی دیکھ لیں کہ بجلی کے میٹر کی درخواست دی ہوئی ہے اور دُعا یہ کروا رہے ہیں کہ Demand Notice جلدی Issue ہو جائے۔ میرے نزدیک یہ خواہش کرنا کہ میرا کام پہلے ہو جائے اور دوسروں کا کام بعد میں ہو، غلط اور مومن کی شان کے خلاف ہے۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ جن لوگوں نے ہم سے پہلے Apply کیا ہے اگر Out of turn ہماری باری پہلے آ جائے گی تو ان کی حق تلفی ہوگی۔ جو چیز کسی کا حق مار کر حاصل کی جائے وہ ہمارے لیے مبارک کیسے ہو سکتی ہے!

یہ دو عام مثالیں ہیں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیں۔ مقصد محض یہ تھا کہ اگر ہم اپنے روزمرہ معاملات کو اس انداز سے دیکھ لیا کریں تو خود ہماری اپنی اور دوسروں کی زندگی آسان ہو جائے گی۔ ہم بھرپور محنت و کوشش کے بعد دُعا کریں اور پھر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں اور جو بھی نتیجہ رب تعالیٰ کی طرف سے آئے اسے بخوشی قبول کر لیں۔ یہی مسلمان کی شان ہے۔

آپ ﷺ رب تعالیٰ کے بعد سب سے عظیم ہستی ہیں۔ آپ ﷺ کے اُمتی اولیائے کرام اگر مستجاب الدعوات ہو سکتے ہیں تو ذرا سوچیں کہ آپ ﷺ کی دُعا کی کیا شان ہوگی۔ آپ ﷺ کی آنکھ کا ہلکا سا اشارہ یا ابرو کی ایک ہلکی سی جنبش ہی کافی ہے لیکن آپ ﷺ نے اس کے باوجود بہت سے غزوات لڑے۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ ﷺ صرف دُعا فرما دیتے تو غزوہ بدر کے موقع پر مکہ کی طرف سے آنے والا کفار کا لشکر راستے میں ہی تباہ ہو جاتا؟ کیا یہ دشوار تھا؟ لیکن آپ ﷺ نے اسے دُنیاوی طور پر حل کیا۔ دستیاب وسائل سے کام لے کر کفار کے ساتھ باقاعدہ جنگ کے بعد فتح حاصل کی۔

یہاں ہمیں دو مثالیں ملتی ہیں۔ ایک تو جنگ لڑی۔ جو وسائل حاصل تھے ان کو اکٹھا کیا پھر Physically بہترین Location (میدان بدر) کا انتخاب کیا اور پوری حکمت و دانائی کے ساتھ تین سو تیرہ مجاہدین پر مشتمل Force کو Deploy کیا۔ اس کے بعد ساری رات اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر فتح و نصرت کی دُعا کی۔ یہ ہمارے لیے بہترین مثال ہے۔ اس لیے بجائے اپنے دُنیاوی کاموں کے لیے دُعا کرنے والوں کے پاس بھاگے پھرنے کے، بہتر ہے کہ ہم پہلے عملی کوشش کر لیں۔

ایک اور ظلم جو ہم کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم اپنے معصوم بچوں سے کہتے ہیں کہ جاؤ بیٹا جا کر یہ دُعا کروا آؤ کہ میں پاس ہو جاؤں۔ وہ بچے کچے ذہن کے مالک ہیں۔ ابھی ان کے دماغ میں جو Imprint ہو جائے گا وہ یہ ہے کہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں دُعا کروا لیں گے تو کام ہو جائے گا۔ یوں ہم نے اپنے بچوں کو بے عملی کی راہ دکھا دی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم انہیں سمجھائیں کہ بے شک دُعا کرنا اور کروانا اچھی بات ہے لیکن رب تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ پہلے ہم عملی کوشش کریں اور اس کے بعد دُعا کریں۔

میری آپ سے بھی یہی گزارش ہے کہ مومن کی راہ پکڑیے۔ عمل کی راہ اپنائیے۔ دُنیاوی معاملات میں پہلے عملی طور پر بھرپور Effort کریں پھر دُعا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور کامیابی عطا فرمائے گا۔ عزت بھی

عطا فرمائے گا اور رب سے بڑھ کر سکون عطا فرمائے گا۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ سود کسی طور جائز نہیں۔ کیا کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ کھلوائے جا سکتے ہیں؟

جواب: زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا پڑتا ہے۔ آج کی دنیا میں کاروبار کی نوعیت Local نہیں رہی بلکہ اب کاروبار National اور International level پر منتقل ہو چکا ہے جس کی وجہ سے مختلف Entities کے لیے بینک اکاؤنٹس کھلوائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی مجبوری اپنی جگہ لیکن احکامات خداوندی کی خلاف ورزی کی کسی صورت اجازت نہیں ہے۔

اب ہمیں بینک میں اکاؤنٹ کھلوانا ہے۔ Letter of Credit بھی Maintain کرنا ہے۔ ایک سے دوسرے ملک Payment بھی Transfer کرنی ہے۔ Pay orders بنانے ہیں۔ Bank drafts اور Security of money ایک علیحدہ Issue ہے۔ گھر میں پیسہ پڑا ہو تو لٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ پھر قانون یہ بھی کہتا ہے کہ سارا کاروبار Documented ہو ورنہ ہم قانون کی گرفت میں آ جائیں گے۔

ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بینک میں اکاؤنٹ رکھنا پڑے گا۔ Current Account پر تو کسی قسم کا سود ہے ہی نہیں بلکہ الٹا Service/Bank Charges ادا کرنا پڑتے ہیں۔ رہ گئی Saving Account کی بات تو اس میں ہم بڑی آسانی سے ایک کام کر سکتے ہیں کہ اس اکاؤنٹ پر بینک جو سود ہمیں دیتا ہے اس کے لیے ہم بینک کو لکھ کر دے دیں کہ ہم وہ سود نہیں لینا چاہتے۔ اس میں ایک Provision موجود ہے کہ آپ کو Saving Account with interest چاہیے یا Non-interest Saving Account آپ کھلوانا چاہتے ہیں۔ آپ Non-interest Saving Account کھلوا لیجیے۔ اس طرح سود کا پیسہ آپ کے پیسے میں شامل نہیں ہوگا۔

سوال: کیا سودی رقم صدقہ و خیرات یا کسی کی مدد کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے؟ نیز آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کام کے لیے درخواست دی ہے وہ اپنا نمبر آنے کا انتظار کرے اور دعا کے لیے نہ کہے۔ وہ بے چارہ تو دعا کے لیے کہہ رہا ہے جب کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور شخص رشوت لگا کر اپنی باری پہلے لے آئے گا۔

جواب: ہم اچھے کام کے لیے ایک گندی راہ استعمال کیوں کریں؟ اگر ہماری نظر میں کوئی ایسا انسان ہے جسے واقعی مالی مدد کی ضرورت ہے تو ہم یہ کیوں نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق میں سے اس کا حصہ اس بندے تک پہنچا دیں نہ کہ ہم بینک میں پیسہ جمع کرا کے اس پر سود کمائیں اور وہ حرام چیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسے دے دیں۔ ہم نے جو پیسہ بینک میں جمع کروایا ہے اور جس پر ہم سود لینا چاہتے ہیں ہم اسی پیسے میں سے اس بندے کی خدمت کیوں نہیں کر دیتے؟ جہاں تک میری معلومات ہیں حرام پیسے کی خیرات یا صدقہ اللہ تعالیٰ

کے حضور قابلِ قبول نہیں ہے۔

پھر ذرا یہ بھی تو سوچیں کہ جس سود کو رب تعالیٰ نے آپ کی ذات کے لیے پسند نہیں کیا آپ وہی سود کا پیسہ اُس کی راہ میں خیرات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسی بندگی ہے؟ ہاں البتہ یہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہمیں یہ اندیشہ ہو کہ سود کا پیسہ اسلام کے دشمنوں کے اکاؤنٹ میں چلا جائے گا جس سے وہ طاقت ور ہو کر اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے تو آپ سود کی وہ رقم اپنے ہی ملک کی Non-Muslim Organisation کو دے دیجیے لیکن نیت صدقہ و خیرات کی نہ ہو۔ (لیکن سب سے پہلے ہم کوشش کریں کہ جن بینکوں میں سود کا گزر ہو وہاں بینک اکاؤنٹ رکھا ہی نہ جائے۔)

اگر ہم پاکستان میں رہتے ہوئے اپنے اکاؤنٹ پر Earn ہونے والا سود چھوڑ دیتے ہیں تو Ultimately وہ اسی ملک میں Circulation میں رہتا ہے۔ جو Foreign banks یہاں کام کرتے ہیں اُن میں بھی سودی پیسے کا زیادہ حصہ یہیں رہ جاتا ہے صرف Profit کی صورت پیسہ باہر چلا جاتا ہے۔ سب سے بہتر بات یہی ہے کہ Foreign Account رکھا ہی نہ جائے تاکہ سودی رقم کے حصول کی نوبت ہی نہ آئے۔

اب آپ کا دوسرا سوال۔ جن صاحب نے درخواست جمع کروائی ہے اور وہ دعا کے لیے گزارش کرتے ہیں آپ کے کہنے کے مطابق وہاں دوسرے لوگ پیسہ خرچ کر کے کام جلدی کروا لیتے ہیں جب کہ یہ صاحب تو دعا پر انحصار کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ پورا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ پورے شہر میں ایک شخص کے پاس موم بتی ہے۔ اگر وہ اس غلط فہمی میں موم بتی نہ جلائے کہ اس ننھی سی موم بتی سے اتنے بڑے شہر کا اندھیرا ختم نہیں ہو سکتا اور یوں وہ خود بھی اسی اندھیرے کا حصہ بن جائے تو یہ کوئی قابلِ تحسین سوچ نہیں ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ یہ سوچ لے کہ میری ایک چھوٹی سی موم بتی زیادہ نہیں تو شہر کے دو یا چار سو مربع میٹر علاقے کو تو روشن کر ہی دے گی۔ اتنے Area میں تو کوئی ٹھوکر کھا کر نہیں گرے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس موم بتی کی روشنی سے تحریک پا کر کوئی اور شخص بھی موم بتی جلا لے یا پھر اسے خریدنے کی طرف مائل ہو جائے۔ آپ پہلا قطرہ تو بنیں۔ یہی مشکل کام ہے۔ آپ اپنا دیا تو جلائیں۔ یوں دیئے سے دیا جلتا چلا جائے گا اور پورا شہر تاریکی سے نکل کر روشن ہو جائے گا۔

Systems خراب ہی وہاں ہوتے ہیں جہاں ہم یہ سوچ کر اس سسٹم کی خرابی کا حصہ بن جاتے ہیں کہ ہم اکیلے کیا کر لیں گے یا یہ کہ اگر میں بے ایمانی نہیں کروں گا تو کوئی دوسرا کر لے گا۔ چلو پھر میں بھی ایسا کر لیتا ہوں۔ اگر ہم میں سے ہر آدمی اپنی جگہ راہِ راست پر آ جائے یہ سوچ کر کہ مجھے باقی سب سے کیا غرض۔ مجھے یہ غلط کام نہیں کرنا۔ بھلے ساری دنیا یہ کام کرے میں نہیں کروں گا۔ تو یقین کیجیے وہ لوگ جو ابھی غلط کام کر رہے ہیں وہ ضرور آپ کے ساتھ حق کی راہ پر چلنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ اگر ہر آدمی اپنی اپنی جگہ اپنے فرائض کو سمجھ لے تو System خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ اسلام نے یہ سب ہی تو کہا تھا۔ اسلام نے قلب

بدل ڈالے تھے۔ جس جس نے اسلام قبول کیا وہ کس کس ظلم و ستم سے نہیں گزرا۔ اہلِ قریش کے ہاتھوں کون کون سے مظالم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ایمان اور اسلام پر قائم رہا۔

چونکہ ہمارے Concepts clear نہیں ہیں اس لیے جب ہم ایمان کی بات کرتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ شاید ایمان یا اسلام سے مراد کلمہ شریف ہے۔ اسلام صرف ایک کلمے کا نام نہیں ہے۔ کلمہ طیبہ تو ابتدا ہے اسلام میں داخلے کی۔ یہ اسلام میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ آپ نے کلمہ طیبہ پڑھ کر Lock کھولا اور Enter ہو گئے۔ اس دروازے کے پار پورا شہر آباد ہے۔ رب تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار اور اس کے رسول ﷺ کی رسالت کے اقرار نے تو آپ کے لیے دروازہ کھولا ہے۔ اصل احکامات اس کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ جھگڑا سارا کلمہ شریف کا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ ہم سے چاہتا کیا ہے؟ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ پوری کائنات کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں نے پورے System کو نہ صرف قبول کیا تھا بلکہ اسلام کو لبادے کی مانند اوڑھ لیا تھا۔ جھگڑا تو اس تمام System کا ہے۔ اسلام پورے کا پورا ایک Way of life ہے۔ کلمہ پڑھ کے انھوں نے جو Way of life اپنایا تھا، اسے کسی بھی قسم کی مصیبت، مشکل اور بائیکاٹ کے باوجود نہیں چھوڑا تھا۔ وہاں یہ سوال نہیں اٹھا تھا کہ میں جھوٹ موٹ ہی کہہ دوں کہ میں نے ایمان چھوڑ دیا ہے۔ مجھ کو غلامی سے رہائی دے دی جائے تاکہ میں اور میرے لوا حقین Comfortable ہو جائیں لیکن انھوں نے وہ Way of life ترک نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ اسلام نے دل بدل ڈالے تھے۔ انھوں نے اسلام سیکھا نہیں تھا بلکہ قبول کیا تھا۔ صدقِ دل سے اسلام کو اپنایا تھا۔ وہ آپ ﷺ پر صرف ایمان ہی نہیں لے کر آئے تھے بلکہ انھوں نے آپ ﷺ سے عشق کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بھی قسم کی تکلیف، دکھ یا اذیت انھیں اُن اصولوں اور احکامات سے نہ ہٹا پائی جو اُن کے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے وضع کر دیے تھے۔

ہمارے ہاں لوگ بہت آسانی کے ساتھ روز ہی اللہ تعالیٰ کے ننانوے فی صد احکامات سے روگردانی کر رہے ہوتے ہیں۔ اکثر مقامات پر بہت Conveniently ہم Distract ہو جاتے ہیں۔ اگر وہاں ہم اٹک جائیں کہ ٹھیک ہے میں موروثی مسلمان ہوں لیکن Free will بھی مسلمان ہوں۔

I am a Muslim by choice.

جیسے یہ ضروری ہے کہ استاد کا احترام باپ کی نسبت زیادہ لازم ہے کیوں کہ جو صاحب میرے والد ہیں اس میں میری Choice کا دخل نہیں تھا وہ Nature کا فیصلہ تھا لیکن استاد کو میں By choice چنتا ہوں۔ اسی طرح مذہب ہے۔ مسلمان تو ہم By birth ہیں ہی لیکن ہمیں By choice بھی مسلمان ہونا چاہیے۔ جس روز ہم Muslims by choice ہو گئے، اس روز ہم اسلام کے چھوٹے سے چھوٹے حکم پر عمل کرنے لگیں گے۔

سوال: کسی وسیلے سے دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب: میری گزارش ہے کہ آپ ان چیزوں میں نہ پڑیں۔ میرا اپنا انداز ان معاملات کو دیکھنے کا یہ ہے کہ جو بڑی چیزیں ہیں۔ جن پر رب تعالیٰ نے میری گرفت کرنی ہے، پہلے میں وہ ٹھیک کر لوں۔ اگر میں ان پر عمل نہ کر سکا تو یہ باتیں بے معنی ہیں۔ اگر میں صرف جھوٹ بولنا ہی نہ چھوڑ سکا، غیبت ہی نہیں چھوڑ سکا، لوگوں کا حق مارنا ہی نہیں چھوڑ پایا، ماں باپ کی نافرمانی سے باز نہیں آیا تو میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے کہ میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں جاؤں۔ جو چیزیں اسلام کی بنیاد ہیں اور جو Basic چیزیں رب تعالیٰ ہم سے چاہتا ہے پہلے اُن پر عمل ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ان باریکیوں میں جانا چاہیے۔ پھر بھی اگر یہ آپ کا سوال ہے تو جواب عرض کر دیتا ہوں۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ وسیلہ کسے کہتے ہیں؟ اگر وسیلہ سے مراد ہم یہ لیتے ہیں "یا باری تعالیٰ! اپنے رحیم و کریم ہونے کے صدقے، اپنے نبی اکرم ﷺ کے صدقے یا اپنے فلاں مقرب بندے کے صدقے تو ہم پر رحم فرما۔" چونکہ اس طرح سے دُعا کر کے ہم مانگ اللہ ہی سے رہے ہیں اس لیے یہاں تک تو وسیلہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر وسیلہ سے آپ کی مراد یہ ہے کہ میں کسی مزار پر جا کر صاحب مزار سے یہ کہوں کہ آپ مجھے رزق دے دیں (نعوذ باللہ) یا آپ میری فلاں مشکل کو دور کر دیں (نعوذ باللہ) تو یہ شرک ہے۔ کیوں کہ مشکل کشا صرف اور صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے۔ رب تعالیٰ ہی مددگار ہے۔ کسی بھی غیر اللہ (خواہ وہ کسی بھی مقام پر ہو) سے مدد مانگنا شرک ہے اور ایسا وسیلہ ناجائز ہے۔

سوال: کچھ دُکان دار Local brand کو Repack کر کے Sale کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم Customer کو بتا دیں گے کہ یہ لوکل برانڈ ہے کیوں کہ اسلام میں حکم ہے کہ گاہک کو چیز کی اصلیت بتا کر بیچ سکتے ہیں۔ یہ عمل کس زمرے میں آئے گا؟

جواب: آپ سود کو Profit کا نام دے دیجیے، جوے کا نام دے دیں یا پھر نذرانہ کہہ لیں ...... رہے گا وہ سود ہی۔ اگر ایک شخص نے محنت کی ہے اور اپنے Brand name کو مارکیٹ میں Popular کیا ہے۔ آپ اس کے اسی برانڈ نام کو استعمال کر رہے ہیں۔ اب آپ لاکھ کہیں کہ یہ Local ہے لیکن Indirectly یہ اس برانڈ کو خریدنے والے گاہک کے ساتھ Cheating ہے۔ جو دُکان دار اپنے Customer کے ساتھ یہ کر رہا ہے کہ Brand وہی ہے لیکن Manufacturing پاکستان کی ہے۔ تبھی تو آپ اسے Local کہہ رہے ہیں۔ اس طریقے سے چیز فروخت کرنے میں Cheating کا Element موجود ہے۔ دوسرا پہلو اس میں یہ ہے کہ آپ دوسرے کی محنت کو Cash کروانا چاہتے ہیں۔ جس انسان نے محنت کر کے اپنے برانڈ نام کو Popular کیا ہے آپ اسی کے Brand name کو بیچیں گے تو کسی اور کی محنت کھائیں گے جو سیدھی سی حق تلفی ہے تو ایسا طریقہ درست نہیں ہے۔

سوال: گورنمنٹ کے Saving Certificates تو سود کے زمرے میں آتے ہیں۔ Equipment Insurance اور Health Insurance کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: علما حضرات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ لائف انشورنس اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ گزشتہ دنوں سود کی ایک ایسی Definition کا مجھ پر انکشاف ہوا جو آپ ﷺ نے خود بیان فرمائی ہے اور اتنی جامع ہے کہ سود کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ہر وہ قرض جو کسی طرح کا منافع کھینچ کر لائے سود ہے۔"

(فتح القدیر صفحہ 303)

بدقسمتی سے ہم مسلمان من حیث القوم اس رویے کے عادی ہو گئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر ہر چیز کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر Compensation for devaluation کیا ہے؟ اگر سال کی Devaluation گیارہ فی صد ہے تو Exploitation اور کیا ہے کہ بینک جو سات فی صد Profit دے رہا ہے اسے تو میں سود کہتا ہوں لیکن آپ سے جو گیارہ فی صد لیتا ہوں اسے Compensation for devaluation کا نام دے دیتا ہوں۔

دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد انسان کا قلب تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر میرے پاس فالتو مال و زر ہے اور میرے دوسرے بھائی کو اس کی ضرورت ہے تو میں خاموشی سے یہ اسے دے دوں گا کہ آپ اپنی ضرورت پوری کر لیجیے، بعد میں مجھے لوٹا دیجیے گا۔ اگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے وہ وقت پر مجھے رقم لوٹانے سے قاصر ہو تو میرے ضمیر کو مجھے بتانا چاہیے کہ آپ ﷺ کا حکم ہے کہ قرض میں چھوٹ دو۔ اگر میرا بھائی رقم واپس کرنے کی پوزیشن میں نہیں تو میں اسے وہ رقم معاف کر دوں اور اس کا اجر اپنے رب تعالیٰ سے لوں۔ یہ سب کچھ صرف اسی وقت ممکن ہے جب قلوب بدل جائیں۔

سوال: غیر اسلامی ممالک میں بینکنگ سسٹم میں سود سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: جن غیر اسلامی ممالک میں صرف غیر اسلامی Banking System ہے وہاں ہم سود سے بچنے کے لیے اکاؤنٹ کھلواتے وقت یہ لکھ کر دے دیں کہ

"All profit earned on my account may kindly be transferred to some charity organisation to the satisfaction of my banker."

یوں جب تک آپ کا اکاؤنٹ اس بینک میں رہے گا اور اس پر جو منافع بھی Generate ہو گا وہ کسی Charity organisation کو Transfer ہو گا۔ آپ کو اس کی اطلاع ملتی رہے گی کہ فلاں عرصے کے دوران آپ کے Deposits پر اتنا منافع Generate ہوا اور آپ کی ہدایات پر Profit ایک Charity organisation کو ٹرانسفر کر دیا گیا۔

ہم نے گورنمنٹ سروس کے دوران یہ تجربہ کیا کہ گورنمنٹ ملازمین کا Provident Fund کاٹتا ہے۔ ایک Trust اس فنڈ کو Invest کرتا ہے اور حاصل ہونے والا تمام منافع ممبرز میں Distribute ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی گورنمنٹ ملازم وہ منافع نہیں لینا چاہتا تو وہ متعلقہ محکمے کو لکھ کر دے دیتا ہے کہ Interest-free Provident Fund لوں گا اور صرف اپنا Contribution اور Contribution from government لوں گا۔ اس کے علاوہ کوئی رقم یا کسی قسم کا Profit نہیں لوں گا۔ اس طرح اس کے حصے کا Profits بھی دوسروں پر تقسیم ہو جائے گا۔

سوال: Banking میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بینک والے رقم Invest کریں گے۔ Shareholder بھی Invest کرے گا۔ اس ساری Investment کو Calculate کر لیا جائے گا۔ Loss یا Profit کی صورت میں دونوں کو Suffer کرنا ہوگا۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: یہ سب صرف Theoretically تھا۔ اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب آپ Cases لیتے تھے تو دونوں طرح کے Cases آتے تھے۔ جس انڈسٹری کو بینک والے پیسہ ادھار دے رہے تھے اس پر وہ 20 فی صد سود Charge کر رہے تھے اور جو لوگ ان دنوں اپنے پیسے Saving Account میں جمع کرواتے تھے انھیں ساڑھے چھ فی صد Fixed profit ملتا تھا جب کہ Fixed Account میں اٹھارہ فی صد منافع Fixed تھا۔ جو منافع Fix ہو گیا وہ تو سود کے زمرے میں آ گیا کیوں کہ یہاں سود کی تینوں شرائط پوری ہو جاتی ہیں۔

1۔ اس میں پیسہ لگانے والے کی محنت شامل نہیں ہے۔

2۔ منافع Fixed ہے۔

3۔ loss کا کوئی Element شامل نہیں صرف Profit ملے گا۔

جاپان میں Interest rate zero per cent ہے۔ بہر حال کام تو سود کا ہی ہے۔ ایک فی صد ہو یا سو فی صد۔ زہر ہر صورت میں زہر ہی کہلائے گا خواہ مقدار میں کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ میں اس کو مزید Explain کر دیتا ہوں تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ ایک صاحب نے عربی میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ زیرو ریٹ اور بچت کے ساتھ کھیلے ہیں۔ ربا، ربا اور زنا کے قصے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ سود جس سے اسلام نے منع کیا ہے دراصل وہ ہے جس سے کسی کی Exploitation کی جائے۔ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مثلاً کوئی آدمی مجبور ہے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے مگر اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ وہ آ کر کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے دے دو۔ آپ کہتے ہیں ٹھیک ہے لے جاؤ لیکن مہینے کے بعد اضافی پیسے تم مجھے دو گے۔ یہ Exploitation ہے جو اسلام میں حرام ہے۔ (یہاں صاحب کے مطابق ربا ہے) انہی صاحب کے مطابق اگر ایک آدمی Project کا ... ہے اور اپنی خوشی سے وہ آپ کے پاس آ کر کہتا ہے کہ یہ Project

کے کاغذات ہیں ان کو آپ ضمانت کے طور پر رکھ لیں اور مجھے اتنے پیسے دے دیں۔ میں آپ کو مہینے کے آخر میں 10% Profit دے دیا کروں گا۔ یہ سود کے زمرے میں نہیں آتا۔ یہ سب ان Writer کے خیالات ہیں۔

اگر ہم ایسی موشگافیوں میں جائیں گے تو رب تعالیٰ نے اس کی پیش بندی بڑے خوبصورت انداز میں چودہ سو سال پہلے ہی کر دی تھی کہ تم گناہ نہ کرو لیکن ایسی جگہ پر بھی نہ جاؤ جہاں گناہ ہو رہا ہو۔ اس حکم میں حکمت یہی ہے کہ اگر کوئی انسان روزانہ ایسی جگہ بیٹھتا ہے جہاں برائی اور گناہ کا کام ہوتا ہے یا وہ ایسے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے جو Drink کرتے ہیں۔ پہلے دن تو وہ ان کے ساتھ جا کر بیٹھے گا اور کہے گا کہ میں شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا لیکن دوستوں کے ساتھ بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔ کچھ دن کے بعد احتمال یہ ہو جائے گا کہ کوئی دوست ہی کہہ دے گا کہ یار یہ بوتل تو پکڑانا۔ وہ پھر خود سے کہے گا میں کون سا پی رہا ہوں۔ پاس ہی تو پکڑا رہا ہوں۔ پھر یہ ہوگا کہ چلو دوستوں کے لیے انڈیل دوں۔ یوں یہ سلسلہ دن بدن بڑھتے یہاں تک آ جائے گا کہ وہ پینا شروع کر دے گا۔ یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے۔

کئی بار یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان تھکا ہوا ہوتا ہے، عشاء پڑھ لی، تہجد بھی پڑھ لی۔ درمیان میں کہیں وقفہ آ گیا۔ آدمی کہتا ہے کہ چل یار سوؤں گا نہیں، ذرا سا جائے نماز پر لیٹ جاؤں پھر پانچ منٹ بعد اٹھ کر نماز پڑھ لوں گا۔ انسان Relax ہونے کے لیے ٹانگیں سیدھی کرتا ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے اب ذرا کمر بھی سیدھی کر لوں۔ کمر سیدھی کی، سر کے نیچے بازو رکھا اور خود سے کہا یار ذرا آنکھیں بھی بند کر لیتا ہوں، تھکا ہوا ہوں۔ جب آنکھیں بند ہوئیں تو پھر صبح نو بجے ہی آنکھ کھلی۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ اسی طرح انسان رفتہ رفتہ برائی کی طرف نکل جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انسان برائی کی طرف پہلا قدم ہی نہ اٹھائے۔ برائی سے جس قدر ممکن ہو دور رہے۔

سوال: بڑے Projects اربوں روپے میں لگتے ہیں جن کے لیے Bank یا کسی اور Sponsor کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

جواب: اگر آپ ایسے System میں آ گئے ہیں جہاں مراعات پر کام چل رہا ہے تو آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اس System کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اب اگر آپ کوئی Project شروع کرنا چاہتے ہیں، اس میں Public limited companies ہیں اور ان کے بہت سے Directors بھی ہیں تو اس پروجیکٹ کے شروع ہونے کی صورت میں سب سے بڑا اندیشہ یہ ہے کہ آپ کو سودی کاروبار کا حصہ بننا پڑے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ایسے Projects کو Avoid کر لیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان اپنی ہمت اور استطاعت سے باہر جا کر کام ہی نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنی ہمت و استطاعت کے مطابق کاروبار کرتا ہے لیکن اگر اسے اندیشہ ہو کہ وہ پھنس گیا ہے، وہ کچھ نہیں کر پا رہا تو مجبوری کی حالت میں وہ اتنا پیسہ بینک سے لے لے جتنا کہ گزر بسر ہو اور کوشش کرے کہ وہ جلد سے جلد ادا کر دے۔

سوال: بینک سے Mortgage کر کے جو گھر خریدا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: میں چونکہ مفتی نہیں ہوں اس لیے کوئی فتویٰ صادر نہیں کر سکتا البتہ اپنا Viewpoint دے سکتا ہوں۔

Mortgage کروا کر گھر خریدنے میں دو بنیادی چیزیں ہیں:

1۔ اس میں سود Involve ہے جس پر قطعی فیصلہ موجود ہے کہ سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں اور سود کا لین دین کرنے والا شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔

2۔ دوسری چیز Circumstantial compulsions ہیں۔ اگر ایک انسان اسلامی ملک میں رہائش پذیر ہے اور وہاں اسلام سرکاری اور عوامی مذہب کے طور پر بھی رائج ہے اور قوانین بھی اسلامی ہیں تو وہاں ایسی Compulsions کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن ایک ایسا ملک جہاں غیر اسلامی قوانین رائج ہیں اور اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہیں، وہاں معاملات قدرے تبدیل ہو جائیں گے۔ اس صورت میں بھی مسلمان کے لیے حکم یہی ہے کہ وہ ہر ممکن کوشش کرے کہ سودی لین دین میں شریک نہ ہو اس لیے اگر ہمیں گھر خریدنا ہے تو کوشش کریں اپنی جمع پونجی سے گھر خرید لیں۔ اگر کوئی ایسا طریقہ یا ذریعہ نہیں کہ غیر سودی ذرائع سے گھر خرید سکیں تو پھر انتہائی مجبوری کی حالت میں محض اتنی رقم جو تمام اثاثہ جات کو فروخت کرنے اور دیگر تمام وسائل سے پیسہ اکٹھا کرنے کے بعد بھی Shortfall رہ جائے۔ وہی رقم بطور Mortgage حاصل کریں اور کم سے کم مدت میں اس کی ادائیگی ممکن بنائیں۔ اس مدت میں ہم اپنے اخراجات Squeeze کر کے Mortgage کی رقم ادا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن واضح رہے کہ اس طریقے پر عمل محض اس وقت کیا جائے جب انسان کسی غیر اسلامی ملک کا باشندہ ہو اور اس کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانہ میسر نہ ہو اور انسان اپنے Tangible اور Intangible assets کو فروخت کر کے گھر خریدنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ میرے نزدیک تو Mortgage کی اس کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں۔

ہمارے وہ بھائی جو گھر کرایہ پر دینے کے لیے اسے Mortgage پر خریدتے ہیں وہ جائز نہیں ہے کیوں کہ وہ سر چھپانے کا نہیں بلکہ آمدنی کا ذریعہ بنتا ہے جس میں کسی بھی صورت سود Involve نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: اسلامی بینک سود کو سود نہیں بلکہ Profit کا نام دیتے ہیں۔ کیا یہ اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے؟

جواب: اسلامی بینک کاری پر اسلامی نظریاتی کونسل کا فتویٰ موجود ہے۔ میں کوئی مفتی نہیں ہوں اس لیے محض Academic discussion کے ذریعے کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر سکتا ہوں۔ بینکوں میں لوگوں کے Deposits کو بطور Loan آگے Forward کر دیا جاتا ہے اور اس پر ایک Certain percentage سود (Charge) کر لی جاتی ہے جسے ہم سود کہتے ہیں جو کہ حرام ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک انڈسٹریلسٹ بینک میں جا کر ایک کروڑ Loan کا تقاضا کرتا ہے۔

بینک دس سال کی مدت کے لیے وہ Loan دے دیتا ہے اور سات فی صد سود Charge کرتا ہے۔ آپ ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ اقساط کے ذریعے جو رقم بینک کو ادا کرتے ہیں وہ دو طرح کی ہوگی

پرنسپل اماؤنٹ (Principal Amount) یعنی اصل رقم

سات فی صد سود (7% interest)

فرض کریں کہ انڈسٹریل یونٹ نے آٹھ سال تک رقم بینک میں جمع کرائی حتی کہ محض 20 لاکھ کی رقم واجب الادا رہ گئی۔ اچانک کاروبار یا انڈسٹری بند ہوگئی اور بقایا رقم کی ادائیگی ناممکن ہوگئی۔ ایسے میں بینک اس انڈسٹریل یونٹ کے خلاف عدالت سے ایک Decree لے آئے گا جس میں اس بیس لاکھ کی Recovery ہوگی جسے اس یونٹ کے Assets فروخت کرکے ممکن بنایا جائے گا۔

کچھ بینکوں نے یہ کیا کہ جب آپ نے وہاں جا کر ایک کروڑ کے Loan کی درخواست دی اور انھیں بتایا کہ اس ایک کروڑ سے آپ ایک مشین خریدنا چاہتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہم وہ مشین خرید کر آپ کو کرائے پر دے دیتے ہیں۔ اگر آپ اسے دس سال تک استعمال کرتے ہیں تو اس عرصے میں ہمیں باقاعدگی سے کرایہ دیتے رہیے۔ دس سال بعد یہ مشین آپ کی ملکیت ہو جائے گی لیکن یہ ایک کروڑ کی مشین ہم آپ کو ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپے میں دیں گے۔

یوں آپ نے بینک کے ساتھ معاہدہ کرلیا اور ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپے کی مشین خریدنے پر آمادہ ہو گئے۔ آٹھ سال تک آپ سولہ لاکھ روپے سالانہ کے حساب سے کرایہ ادا کرتے رہے۔ جب صرف 32 لاکھ روپے کی ادائیگی باقی تھی تو اچانک آپ کے یونٹ نے کام کرنا بند کردیا اور آپ بقایا کرایہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ رہے۔ ایسے میں بینک آیا اور یہ کہہ کر مشینری واپس لے لیا کہ یہ تا حال بینک کی ملکیت ہے کیوں کہ ابھی آپ نے اس کا پورا کرایہ یا قیمت ادا نہیں کی۔ یوں مشین بھی گئی اور ایک کروڑ 28 لاکھ روپے سے بھی آپ ہاتھ دھو بیٹھے۔

اگر کسی بینک میں اس انداز میں معاملات طے پاتے ہیں تو یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کوئی عیسائی شخص اپنا نام مائیکل سے تبدیل کرکے محمد انور رکھ لے۔ صرف نام بدل لینے سے وہ مسلمان نہیں ہوگا بلکہ وہ مسلمان اس وقت کہلائے گا جب کلمہ پڑھے گا۔

ولی اللہ کون!

سوال: کیا روحوں کے ساتھ گفتگو کی جا سکتی ہے؟ کیا اُن سے گفتگو کرنا جائز ہے؟

جواب: انتقال کے بعد ارواح عالم برزخ میں قیام کرتی ہیں۔ عالم برزخ کے دو طبقات ہیں۔ ایک طبقے میں اُن لوگوں کی ارواح ہیں جو دنیا میں نیک کام کرتے رہے ہیں جب کہ دوسرے طبقے میں ایسے لوگوں کی ارواح ہیں جو نیکی کے مطلوبہ مقام پر نہیں ہیں۔ اسی طرح بہت سی ارواح کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ زمین کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں۔ کچھ ارواح پر For certain reasons پابندی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے اُن کا زمین کے ساتھ رابطہ ممنوع ہو جاتا ہے۔

وہ ارواح جن کا زمین کے ساتھ رابطہ قائم رہتا ہے اُن کے ساتھ زندہ انسانوں کا رابطہ ممکن ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جو شخص ان ارواح کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے یا گفتگو کرنا چاہتا ہے اس کی اپنی روح کی لطافت اور پاکیزگی ایک خاص مقام پر ہونی چاہیے تبھی وہ رابطہ قائم ہو پائے گا۔ لطافت اور پاکیزگی کا مقام انسان کو خیالات کی Purity اور نیکی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ Purity اُس وقت آئے گی جب انسان کے خیالات میں کینہ، کدورت، حسد شامل نہ ہو۔ جب خیالات میں Purity آ جائے گی تو دل خود بخود صاف ہو جائے گا۔ روح کی لطافت اور پاکیزگی کے لیے Purity بنیادی Requirement ہے۔

دوسری Requirement یہ ہے کہ انسان نیک ہو۔ نیکی کے نتیجے میں روح لطیف ہوگی۔ اُس کی پرواز ایک خاص ڈگری تک بلند ہو جائے گی اور وہ اوپر اُٹھتی چلی جائے گی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ارواح سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ گفتگو ممکن ہو جاتی ہے لیکن یہ مناسب نہیں ہے کہ Publicly ایسے کام کیے جائیں کیوں کہ اس طرح خلق خدا کے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ جس طرح علم نجوم بطور سائنس موجود ہے اسی طرح جادو بھی بطور سائنس اور علم موجود ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی چیزوں کے قریب جانے سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح صاحبان کشف Time and Space سے Beyond ہو جاتے ہیں۔ وہ مختلف کائنات، عالم، زمینوں اور آسمانوں کی سیر کرتے ہیں لیکن وہاں پر بھی کچھ

چیزوں کو عیاں کرنا مناسب نہیں ہے ورنہ بعض اوقات سزا کے طور پر کشف سلب کر لیا جاتا ہے۔ ارواح سے کی جانے والی گفتگو کا سرِ عام تذکرہ مناسب نہیں ہے کیوں کہ بعض اوقات اس گفتگو کے دوران ارواح کے ذاتی راز بھی عیاں ہو جاتے ہیں اور کسی کے راز کو عیاں کرنا تو ویسے بھی بد دیانتی اور گناہ ہے۔

اسی ضمن میں مجھے ایک صاحب یاد آ گئے جو ایک سرکاری بینک میں انتہائی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جب کبھی میں دفتری کام کے سلسلے میں کراچی Tour پر جاتا تھا تب اُن سے بھی ملاقات ہو جایا کرتی۔ شروع میں مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ ہر گفتگو کا رُخ ارواح کی طرف کیوں موڑ لیتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے مجھے ایئرپورٹ سے Pick کیا۔ کہنے لگے کہ کھانے کا وقت ہو رہا ہے، پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ وہ مجھے لے کر کراچی کے ایک Five Star ہوٹل میں چلے گئے۔ جب ہم ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے تو انھوں نے کسی صاحب کو دیکھ کے Wave کیا اور زیرِ لب کہنے لگے "یہ یہاں کیسے آ گئے۔" وہ صاحب دراصل دنیا کی ایک Leading Airline کے جنرل منیجر تھے۔ جب اُن Banker صاحب نے میرا اُن سے تعارف کروایا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک پہلے سے طے شدہ ملاقات تھی۔

[I could clearly make out, it's all arranged.)

باتوں کے دوران وہ Banker کہنے لگے کہ جنرل منیجر صاحب کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ارواح سے گفتگو کر لیتے ہیں۔ تب معلوم یہ ہوا کہ وہ اپنے صاحبزادے کو آٹھ یا دس سال سے معمول کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور اُس کے ذریعے ارواح کو بلا لیتے ہیں اور اُن سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ صاحب ارواح کے قصے سناتے رہے کہ میں نے فلاں فلاں ارواح سے خود باتیں کیں۔ اس نشست میں ہمارے سابقہ وزیرِ اعظم اور صدر کی ارواح سے گفتگو کا قصہ بھی انھوں نے بیان کیا اور بتایا کہ وہ اُن سے کس قسم کی انفارمیشن حاصل کر چکے تھے۔

یہ زیادتی کی بات ہے۔ ارواح سے گفتگو کے چکر میں آپ کو پتا نہیں چلتا کہ آپ کتنے گناہ کما چکے ہیں۔ ارواح سے گفتگو کر کے اُن سے Personal information حاصل کر کے آپ اُسے سرِ عام پھیلا رہے ہیں۔ یہ Dishonesty ہے۔ یہ گناہ ہے جس کا جواب آپ کو اللہ کے حضور دینا ہوگا۔ اس لیے میں سختی سے منع کرتا ہوں۔ اگر کبھی کسی روح سے آپ کا رابطہ قائم ہو جائے تو بجائے اُس سے Personal Information لینے کے آپ اُس سے علم کی گفتگو کریں لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ آپ اس کام میں نہ پڑیں۔ اس سے زیادہ بہتر کام موجود ہیں جو آپ کر سکتے ہیں۔ آپ صاحبِ کشف ہو جایئے اور بزرگانِ دین کی ارواح سے ملاقات کیجیے۔ یقین کیجیے عالمِ کشف میں بہت طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر کشف کے بہت اعلیٰ مقام پر آپ چلے گئے تو پھر پیغمبروں کی ارواح سے ملاقات کیجیے۔ ان سے مل کر انسان کے اندر جو سرخوشی کا عالم ہوتا ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے عجائبات عالم میں ایسی ایسی ناقابلِ بیان چیزیں ہیں جن کی آپ کشف میں سیر کر سکتے ہیں۔ ارواح سے گفتگو کر کے کیا حاصل کر لیں گے آپ ... سوائے گناہوں

کے؟ آپ کا نفس پھلے پھولے گا کہ آپ نے پوشیدہ بات معلوم کر لی ہے لیکن ذرا سوچیں اس بات یا راز کو معلوم کر کے آپ کو کیا فائدہ ہوا؟ وہ اس بے چارے انتقال کر جانے والے کی ذاتی معلومات تھیں۔ وہ آپ کو کیا فائدہ دے سکیں گی؟

یاد رکھیے رب تعالیٰ اپنے بندوں کے عیبوں اور رازوں کو چھپانے والا ہے۔ وہ ہمیں بھی یہی حکم دیتا ہے۔ جب وہ زندہ لوگوں کی عیب پوشی پر اس قدر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم کسی کا راز جان لو تو اس کو چھپا جاؤ تاکہ حشر کے دن میں تمہارے عیبوں کی پردہ پوشی کروں۔ ایسا رب آپ کو ارواح کے راز جان کر سرِ عام افشا کرنے پر کیسے معاف کرے گا؟ وہ تو ہم سے یہاں تک احتیاط چاہتا ہے کہ مرنے والوں کو اچھے الفاظ میں یاد کرو۔ ان کی برائی بیان نہ کرو۔ لہٰذا آپ ارواح سے گفتگو کے کھیل سے باز رہیے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اس کے برعکس اگر آپ نے کشف کے ذریعے آسمانوں کی سیر کر لی یا زمین کی تہوں کو دیکھ لیا تو اللہ تعالیٰ پر آپ کا ایمان پختہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس کی ربوبیت کی شان کی ہلکی سی جھلک آپ کو دکھائی دینے لگتی ہے اور رب تعالیٰ کی عظمت کا یقین ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور وہ ہمارا رب ہے۔ اس کا فائدہ آپ کو دنیا و آخرت میں ہوگا۔

سوال: کیا اپنے بچوں کو قرآن پاک حفظ کرانا چاہیے؟ کیا درسِ قرآن کا اہتمام کرانا مناسب ہے؟

جواب: بلاشبہ قرآن پاک حفظ کرنا بہت بڑا اعزاز ہے اور قرآن پاک کا سمجھنا بہت بڑی سعادت و رحمت ہے لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ہم اپنے بچوں کو جب حافظ بنانا چاہتے ہیں تو اس کے پیچھے ہماری یہ غرض پوشیدہ ہوتی ہے کہ حدیث مبارکہ کے مطابق اس سے ہمیں جنت مل جائے گی۔ یوں اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو حافظ بنا کر ہم نے جنت پکی کرا لی۔ اب جو جی چاہے کرتے رہیں۔ لوگوں کا حق ماریں، جھوٹ بولیں، دغا کریں یا کسی کو فریب دیں، جنت تو پکی ہوگی۔ اب کیا غم ہے؟ یہ درست نہیں ہے۔

ہم رب تعالیٰ کی بندگی یا اس کے احکامات کی پیروی سزا اور جزا سے ماورا ہو کر کیوں نہیں کر لیتے؟ یہ کیوں نہیں سوچ لیتے کہ میرا رب لائقِ عبادت ہے اور یہ اس کا حق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے؟

ایک زمانہ تھا جب ہم ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ تب خال خال کہیں ٹی وی دکھائی دیتا تھا۔ FM radios بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ صرف ریڈیو پاکستان ہوتا تھا۔ مختلف شہروں میں اس کے اسٹیشن تھے۔ تب گرمیوں میں صبح ساڑھے چھے بجے اور سردیوں میں صبح سات بجے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دس منٹ کا ایک ہی مذہبی پروگرام آیا کرتا تھا جس میں پانچ منٹ کی تلاوت کلام پاک ہوتی اور اگلے پانچ منٹ عالم دین شاہ بلیغ الدین اس کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اس پروگرام کے نشر ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ معاشرے میں رشوت لینے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور جو کوئی رشوت لیتا تھا وہ اپنے رشوت لینے کے فعل کو اپنی اولاد سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ رشتہ داروں اور محلے والوں سے بھی اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا

تھا۔ اگر کسی انسان کی اولاد میں سے کوئی بیٹا کردار کے اس اعلیٰ مقام پر نہیں ہوتا تھا جس پر اس کو ہونا چاہیے تھا تو وہ شخص شرم کے مارے اپنی پرانی رہائش گاہ چھوڑ کر چلا جاتا تھا کہ میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ میری اولاد میں سے ایک بیٹا بدکردار نکل آیا ہے۔

آج الحمدللہ کئی چینلز On air ہیں۔ بہت سے FM ریڈیو کام کر رہے ہیں۔ کچھ مذہبی چینلز پر 24 گھنٹے مذہبی پروگرام چلتے رہتے ہیں۔ پھر گلی گلی قرآن پاک کی درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ان تمام مذہبی خدمات کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ آج جو رشوت نہ لینے والا آدمی ہے وہ منہ چھپائے پھرتا ہے کہ میں ایسا کم تر آدمی ہوں اور ایسی کم تر Position پر ہوں کہ رشوت بھی نہیں لے سکتا۔ اگر اولاد میں سے ایک آدھ بچہ غلط نہیں تو بھی منہ چھپائے پھرتا ہے کہ میں کیسے جیوں یہاں سر اٹھا کے؟ آج کے دور میں یہ صورت حال ہو گئی ہے۔

درس قرآن اور حفظ قرآن میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو آج بھی ہمارے لیے اسی طرح باعث رحمت، باعث سعادت اور باعث نجات ہے جیسے پہلے تھا۔ فرق ہم لوگوں میں آیا ہے۔ فرق ہمارے Concepts میں آیا ہے۔ فرق ہماری نیتوں اور ہمارے اعمال میں آیا ہے۔ مذہب نہیں بدلا بلکہ ہمارے جینے کے انداز بدلے ہیں۔ اگر آج ہم درس قرآن Attend کرنے جاتے ہیں تو صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے تاکہ اگر ہم کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو فر فر بول کر دوسروں کو Impress کر سکیں کہ دیکھو ہم مذہب کے بارے میں کتنی Information رکھتے ہیں اور ہم کتنے نیک انسان ہیں۔ افسوس! ہماری ساری کی ساری توجہ ظاہر داری پر ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کے بجائے کہ ڈھیروں ڈھیر علم حاصل کر لیا جائے اور اس پر عمل صفر بھی نہ ہو، بہتر یہ ہے کہ ہم چاہے ایک آیت ہی حفظ کریں لیکن اس پر عمل پوری طرح کر لیں۔ یہ کتاب حق آپ کو صرف رٹا لگانے کے لیے نہیں عطا کی گئی بلکہ عمل کرنے کے لیے اتاری گئی ہے۔ اس پر عمل کرنا باعث نجات ہوگا۔ بچوں کو حافظ قرآن ضرور بنائیے لیکن اس Sense میں نہیں کہ انھیں صرف زبانی قرآن پاک یاد ہو۔ انھیں قرآن پاک پر عمل کرنے والا حافظ بنائیے۔

یہ جو عجیب سا فتور آ گیا ہے ہماری نیتوں اور اعمال میں اور ہم اس غرض اور لالچ میں بچوں کو حافظ قرآن بنانے کی طرف راغب ہیں کہ اس طرح ہمیں جنت مل جائے گی۔ یہ رویہ درست نہیں ہے۔ اگر اس کے بجائے ہم یہ سوچ لیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرنا ہے۔ اس کی بندگی مجھ پر فرض ہے۔ اپنے آقا کا ہر حکم مجھے ماننا ہے تبھی میں اس کا بندہ کہلانے کا حق دار ہوں گا تو اس سے حساب کتاب کے بعد جنت تو یقیناً ملے گی لیکن قیامت کے روز ہماری پیشانی بھی چمک رہی ہوگی اور ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہو گی کہ وہ رب تعالیٰ جو انصاف کی کرسی پر بیٹھا اس وقت حساب کتاب کر رہا ہے ہم اس عظیم رب کے بندے ہیں اور بندے بھی کیسے کہ جنھوں نے اس کے ہر حکم کو جزا اور سزا سے بالاتر ہو کر مانا۔ صرف اس لیے کہ وہ ہمارا رب اور آقا ہے۔ آقا کا ہر حکم ماننا ہم پر فرض ہے۔ آپ حفظ قرآن اور درس قرآن کو ضرور اپنائیے لیکن

اسے صرف Attend نہ کریں بلکہ اپنائیں۔ اس کے پیچھے جذبہ یہی رکھیں کہ احکامات الٰہی سے واقفیت ہو جائے۔ دوسروں کو Impress کرنے کے لیے نہیں یا علم جھاڑنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ آقا نے حکم سنا، سمجھا اور Obey کرنا بندگی ہے۔ اگر حلقہ قرآن اور درس قرآن ہمیں بندگی کی طرف لے جائے تو وہ عین سعادت و نجات ہوگی۔ آپ اپنے اعمال و افعال کو اس درجے پر لے جائیے جس درجے پر ایک مومن اور مسلمان کے اعمال و افعال کو ہونا چاہیے۔

سوال: میری Boss کے پاس کچھ مافوق الفطرت قوتیں ہیں جن سے وہ ہمارے خیالات کو جان لیتی ہیں اور پھر Challenge کرتی ہیں کہ میری آنکھوں کی طرف دیکھو۔ لیکن اس وقت اُن کی آنکھوں کی طرف کوئی بھی دیکھ نہیں پاتا۔ انسان کی آنکھیں کانپنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ولی اللہ کہتی ہیں۔ کیا ولی اللہ ایسے ہوتے ہیں؟

جواب: کچھ لوگوں کے پاس مافوق الفطرت قوتیں ہوتی تو ضرور ہیں لیکن جو اللہ تعالیٰ کے ولی اور درویش ہیں وہ کبھی ایسے Challenges نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ ذاتی معاملات میں سخت ہوتے ہیں۔ ہاں وہ سخت گیر ضرور ہوتے ہیں لیکن حدود اللہ کے سلسلے میں لیکن ذاتی و سماجی معاملات میں وہ سخت گیر نہیں ہوتے بلکہ بہت نرم خو ہوتے ہیں۔ اُن کے دل میں خوف خدا ہوتا ہے۔ فرق صرف ہماری سمجھ اور ہمارے Concepts کا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہر وہ آدمی جو ذرا سی مافوق الفطرت قوت کا اظہار کر دے ہم اسے ولی اللہ مان لیتے ہیں۔

جس طرح دیانت داری کی تعریف یہ نہیں ہے کہ انسان صرف مالی معاملات میں انصاف پر چل رہا ہو۔ بلکہ دیانت داری یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ Parameters کے اندر رہ کر گزارے۔ وہ جس معاملے کو بھی ہاتھ لگائے اُس سے متعلق اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کے اندر رہ کر اُن معاملات کو سرانجام دے۔ اسی طرح ولی اللہ کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اُس کے پاس مافوق الفطرت قوتیں ہوں گی۔

آپ کو بہت اعلیٰ درجے کے ولی اللہ ملیں گے لیکن وہ کبھی آپ کے سامنے کرامت کا اظہار نہیں کریں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے عطا ہونے والی ان قوتوں کو شعبدہ بازی کا ذریعہ نہیں بنائیں گے۔ ایک ولی اللہ اور مداری میں فرق ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہم ان دونوں کو Mix کر جاتے ہیں۔

کرامت کا اظہار تو ویسے بھی سختی سے منع ہے۔ ولی اللہ کی پہچان تو یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت پر پوری طرح کس بستہ ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ مومن اپنے ساتھیوں کے لیے موم کی طرح نرم ہوتا ہے جب کہ کفار کے لیے وہ فولاد سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ جو شخص درحقیقت مومن اور نرم خو ہے، ایسا شخص آپ کو Challenge کیسے Throw کر سکتا ہے؟ وہ آپ کو اپنی آنکھوں سے کیسے ڈرا سکتا ہے۔ جب ہم اپنی باتوں کو معیار بنا لیتے ہیں تو بھٹک جاتے ہیں۔

بندوں سے تعلق رکھنے والے روحوں کی آنکھیں کبھی غور سے دیکھیے۔ وہ آپ کو Challenge

کرتی محسوس ہوں گی لیکن اس کے برعکس حضرت داتا گنج بخش ؒ، حضرت خواجہ غریب نواز ؒ، حضرت بختیار کاکی ؒ اور حضرت نظام الدین اولیاء ؒ یا ان کی مانند جو دوسرے بزرگ ہیں جن کے ولی اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اگر آپ میں سے کسی کو ان کی آنکھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو تو ان آنکھوں میں آپ کو بہت نرماہٹ ملے گی۔ چہرے پر تو جلال ہو سکتا ہے جیسے بابا فرید گنج شکر ؒ صاحب کے چہرے پر بے پناہ جلال ہے اس کے برعکس ان کی آنکھوں میں بہت گہرائی ہے۔ اسی طرح حضرت داتا گنج شکر ؒ کی بنیادی شکل ہے وہ رعب دار ہے لیکن ان کی آنکھوں میں بہت نرمی ہے۔ آنکھیں دل کا عکس ہوتی ہیں۔ یہ سب لوگ (اولیاء اللہ) دل سے بہت مہربان ہوتے ہیں۔ مہربان دل کا عکس ان کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔

جو لوگ خلق خدا کو دھوکا دیتے یا Challenge کرتے ہیں رب تعالیٰ ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔ ایسے لوگ ولی اللہ نہیں ہو سکتے۔ رب تعالیٰ تو ان لوگوں کو اپنا دوست رکھتا ہے جو خلق خدا پر مہربان ہوتے ہیں۔ اس دھوکے میں مت آئیے۔ وہ خاتون ولی اللہ نہیں ہیں۔ ان کے شر سے بچنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ روزانہ جب آپ آفس جانے کے لیے گھر سے نکلیں تو راستے بھر دل میں سورۃ اخلاص کا ورد کرتے رہیں۔ انشاءاللہ آپ کی Boss خاتون آپ سے خوف زدہ ہو جائیں گی۔ (ایک ہی دن پڑھنے کے بعد آپ کو تبدیلی کا احساس ہو جائے گا۔) وہ خاتون آپ کو Avoid کرنا شروع کر دیں گی۔ آپ کی موجودگی میں ان کی آنکھیں سرخ ہوں گی اور نہ ان آنکھوں سے شرارے نکلیں گے۔ کلام الٰہی بالخصوص سورۃ اخلاص میں یہ طاقت ہے کیوں کہ یہ رب تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے۔ آپ جب اس کی وحدانیت و یکتائی کا ورد اور اعلان کرتے ہیں تو جتنی سفلی قوتیں ہیں وہ سب کی سب زیر ہو جاتی ہیں۔ اس میں استثنا کہیں نہیں ہے۔

No exception at all.

غیر مسلموں میں جو لوگ ایسی ما فوق الفطرت قوتوں کے مالک ہیں ان میں سب سے Powerful لوگ یہودیوں میں پائے جاتے ہیں، انھیں راہب کہا جاتا ہے۔ آپ ان سے ملیں تو حیران رہ جائیں گے کہ سفلی طاقتوں میں ان کی پرواز سب سے بلند ہے۔ اگر آپ نے یہ دیکھنا ہے کہ کلام الٰہی کا اعجاز کیا ہے تو میں آپ کو ایک کھلی اجازت دے رہا ہوں کہ سورۃ اخلاص کا ورد کریں اور سفلی طاقتوں کے مالک کسی بھی انسان کے پاس جا کر بیٹھ جائیں اور پھر رب تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ دیکھیں کہ کیسے ان کی سفلی طاقتیں بے اثر ٹھہرتی ہیں۔

ہندو سادھوؤں میں بھی بہت Powerful لوگ گزرے ہیں جو سفلی طاقت رکھتے تھے۔ آپ نے کشف المحجوب میں وہ حصہ بھی پڑھا ہو گا جس میں حضرت داتا گنج بخش ؒ کا کسی سادھو سے واسطہ پڑ گیا تھا لیکن ثابت ہو گیا تھا کہ کلام الٰہی کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ رب تعالیٰ کی طاقت و قوت کے سامنے ساری قوتیں کمزور و باطل ہیں۔ میں آپ سے دوبارہ بھی کہوں گا کہ آپ کی Boss خاتون کوئی ولی اللہ نہیں ہیں۔ ان سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ ان کے پاس جانے سے قبل سورۃ اخلاص کا ورد

جاری رکھیے۔ ان کی تمام منفی قوتیں بے اثر ہو جائیں گی۔

سوال: پاکستان کے موجودہ حالات اور ہمارے معاشرے کے بگاڑ کی اصل وجہ کیا ہے؟

جواب: پاکستان میں جس صورتِ حال کا شکار ہم دن بدن ہوتے جا رہے ہیں وہ بجا طور پر باعثِ تشویش ہے۔ ہمارے دانشور مختلف Channels پر مختلف مسائل پر اظہارِ خیال کر رہے ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ یہ تجزیے دیانت داری سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو علم، سمجھ اور عقل عطا کی ہے اس کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ مسائل کا حل پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ قوم کی اچھی خدمت کر رہے ہیں لیکن میرے نزدیک پاکستان کے موجودہ مسائل آج کی پیداوار نہیں ہیں اور نہ ہی یہ پچھلے چار پانچ عشروں کی پیداوار ہیں۔ اگر ان حالات و مسائل کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو ایک خاص ترتیب سے انھیں دیکھنا شروع کر دیجیے کہ 14 اگست 1947ء میں ہم کیا تھے؟ ہماری Society کیا تھی؟ ہماری Social Values (سماجی رویے) کیا تھیں؟ ہمیں ان سب کو Review کرنا ہوگا۔ آپ ہر پانچ سال کے بعد کے معاملات کو Measure کرتے چلے جائیں اور 14 اگست 1947ء کو Yardstick بنا لیں۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے موجودہ سن تک آ جائیں تو ایک Comparison (تقابل) Work out ہو جائے گا۔

جس طرح ہم اپنے Profession میں Progress کا ایک گراف بنا لیتے ہیں اسی طرح کا گراف بنا لیں۔ اب اس گراف کو دیکھنے کے بعد ایک حیران کن Situation (صورتِ حال) ہمارے سامنے آئے گی کہ ہم ہر پانچ سال بعد بہت بُرے طریقے سے Decline کا شکار ہوئے ہیں۔ ہم ہر معاملے میں بتدریج پیچھے کی طرف آتے گئے ہیں۔

کسی بھی معاشرے کی بنیاد قانون کی پابندی ہے۔ (صرف ٹریفک قوانین نہیں بلکہ ہر قانون کی بات کر رہا ہوں۔) اگر ہم Respect of law کو دیکھیں تو Sharp decline نظر آئے گا۔

ہمارا گراف Constant decline دکھائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے اپنے معاشرے کا نظم و ضبط کا پہلو خود ہی کھو دیا کیوں کہ یہ Respect of law سے آئے گا۔ اسی طرح Value for money یا Value for material بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ Moral values کی نسبت مادی چیزوں کی اہمیت میں تیزی سے اضافہ ہو گیا ہے اور یہی بنیادی وجہ ہے ہمارے Decline اور Dishonesty کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان Materialistic values (مادی اقدار) کے بڑھنے کی بنیادی وجہ کیا رہی ہے؟ میری ذاتی رائے کے مطابق ہر پیدا ہونے والا بچہ اپنے جوان ہونے تک نہ تو استاد سے Moral values (اخلاقی اقدار) سیکھتا ہے اور نہ والدین یہ سبق اسے پڑھاتے ہیں۔ اب معاشرے میں گھر سے لے کر باہر تک ہر نظام میں وہ صرف Materialistic values (مادی اقدار) کی اہمیت ہی دیکھتا ہے۔ Moral values (اخلاقی اقدار) اسے محض کتابوں کی حد تک نظر آئیں گی۔ عملی زندگی میں کہیں دکھائی نہیں دیں گی۔ جس کی وجہ سے بچپن سے لے کر جوانی تک اس کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو جائے گی کہ تمام اچھی باتیں صرف

زبانی کرنے کے لیے ہیں اور عملی زندگی میں Dishonest ہونا ایک معمول کی بات ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ فرض کریں میں گاڑی میں اپنی Family کے ساتھ جا رہا ہوں۔ سگنل سرخ ہونے کے باوجود میں گاڑی نہیں روکتا اور اشارہ Cross کر جاتا ہوں۔ اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعے میں نے Indirectly اپنے بچے کو یہ تعلیم دی ہے کہ اشارہ سرخ (Red Signal) بھی ہو تب بھی گاڑی گزار لو۔

اب اگر کل کہیں میرا اصول بن گیا کہ میں اسے قانون کی تھوڑی عزت کرنا سکھا دوں تو مجھے ایک بات ضرور سننے کو ملے گی: "ابو! آپ بھی تو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔"

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا آج اور آنے والا کل بہتر ہو تو پہلے ہمیں Moral values اور Respect دینا ہوگی۔ ہمارے بچے یہ چیز ہم سے دیکھ کر سیکھیں گے۔

اگر میں اپنی Family کے ساتھ محوِ سفر ہوں، ٹریفک قانون کی خلاف ورزی پر پولیس کا کانسٹیبل مجھے روک لیتا ہے تو میں چھوٹتے ہی کہتا ہوں "ہاں بھئی! مجھے کیوں روکا ہے۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں؟" اس کے بعد میں اپنے Wallet سے 100 روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتا ہوں۔ میں اس لمحے یہ بات Realise نہیں کر رہا کہ

What sort of education will imprint on my child!

اسی طرح ہمارا Syllabus پلے گروپ (Playgroup) کے بچوں کو ایک ہی چیز سکھاتا ہے۔ Twinkle Twinkle Little Star اور Baa Baa Black Sheep لیکن وہ قومیں جو باوجود مسلمان نہ ہونے کے آج ترقی یافتہ ہیں اور جن کے عروج پر ہم رشک کرتے ہیں ان کا سلیبس اگر ہم غور سے دیکھیں تو ایک عجیب چیز دکھائی دیتی ہے۔ ان کے Playgroup کی تو بات ہی اور ہے۔ آپ ان کی nursery اور Pre-nursery کی سکول ایجوکیشن دیکھیں تو حیران ہو جائیں گے کہ وہ اپنی مستقبل کی قوم کی تعمیر کس خوبصورت انداز میں کر رہے ہیں۔ وہ بچے کو کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتے۔ ان کی کلاس ٹیچر بچوں کو درخت کے پاس لے جائے گی اور کہے گی "بچو! یہ درخت ہے۔ یہ ہمیں دھوپ سے بچاتا ہے۔ ایک درخت دن میں اتنی آکسیجن پیدا کرتا ہے جتنی 24 بچوں کے سانس لینے کے لیے ضروری ہوتی ہے اور آکسیجن ایک چیز ہے جو ہمارے زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ ہوا میں Moisture چھوڑتا ہے۔ اس سے بادل بنتے ہیں جو بارش برسانے کا سبب بنتے ہیں۔" اس طرح وہ ٹیچر درخت کی تمام خوبیاں گنوائی جائے گی اور آخر میں ایک Concluding sentence (اختتامی جملہ) پر بات ختم کرے گی "یہ درخت ہماری اتنی خدمت کرتا ہے۔ ہم اس کی تمام خدمت کے بدلے میں کم از کم ایک کام تو کر سکتے ہیں کہ ہم اس کی دیکھ بھال کریں اور اسے پانی دیں۔"

اب اس بچے کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ درخت بہت مفید چیز ہے۔ میں نے اس کو کاٹنا نہیں بھلے میرے گھر میں چولہا جلے نہ جلے۔ میرے گھر میں بیٹھنے کے لیے کرسی ہو نہ ہو لیکن میں نے اسے نقصان

نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح وہ ٹیچر بچوں کو Electric pole دکھائے گی اور اس کے فوائد گنوائے گی جس سے بچوں میں Civic Sense پیدا ہوتی چلی جائے گی اور بڑے ہونے تک وہ بچے تہذیب یافتہ انسان بن چکے ہوں گے۔

اس کے برعکس میں اپنے ملک میں دیکھتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی شخص اپنے بچوں کے ساتھ کسی Garden میں جائے۔ درخت تو چھوڑیے کوئی پھول ہی کھلا نظر آ جائے تو ہم فوراً بچے کو دوڑاتے ہیں "بیٹا دیکھو کتنا خوب صورت پھول ہے، جاؤ دوڑ کر توڑ لاؤ۔"

بچہ اپنے باپ کو رات دو بجے ڈراما دیکھ کر گھر واپس آتے دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ سڑک پر دور دور تک کوئی ٹریفک ہے نہ کوئی پولیس۔ جیسے ہی سگنل سرخ ہوا باپ نے گاڑی روک لی اور اشارہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بچہ کہہ بھی رہا ہے "ابو چلیں۔ اس وقت کون دیکھ رہا ہے۔" لیکن باپ کہتا ہے "بیٹا! اشارہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ اسے Obey کیا جائے۔ اس لیے نہیں ہوتا کہ اسے Violate کیا جائے۔" اب یہ بات بچے کے ذہن میں نقش ہو جائے گی کہ مجھے ہر صورت قانون کی پاس داری کرنی ہے۔ کوئی موجود ہو یا نہ ہو مجھے قانون کا احترام کرنا ہے۔

اس کے برعکس اگر ایک بچہ اپنے گھر میں یہ دیکھ رہا ہے کہ باپ کی آمدنی سات آٹھ ہزار روپے ماہانہ ہے۔ گھر میں کئی ایئر کنڈیشنرز بھی ہیں۔ دو ٹیلی فون بھی کام کر رہے ہیں۔ کار بھی Maintain ہو رہی ہے۔ ٹیلی فون پر دوسرے ملکوں میں لمبی لمبی کالز بھی کی جاتی ہیں۔ مہینے کے بعد ایک آدمی آتا ہے جو ہزار روپیہ لے جاتا ہے اور باپ اسی بچے کے ہاتھ وہ رقم دے کر بھجوا رہا ہے کہ جاؤ ٹیلی فون والا آیا ہے، اسے یہ رقم دے آؤ ورنہ وہ بات نہیں کروائے گا۔ ایئر کنڈیشنرز چل رہے ہیں، بجلی صرف ہو رہی ہے لیکن بل صرف ڈیڑھ دو سو روپے آ رہا ہے۔ بجلی کے محکمے کا آدمی ہر مہینے کے اختتام پر آتا ہے اور ایک ہزار روپیہ لے کر چلا جاتا ہے۔ باپ وسائل سے زیادہ زندگی گزار رہا ہے۔ اب وہی بچہ بڑا ہونے تک آہستہ آہستہ ہر چیز کو سمجھنے لگتا ہے۔ جب وہ خود جاب پر جائے گا تو اس کے لیے بڑے سے بڑا جرم کرنا کوئی بات نہیں ہوگی۔ رشوت لینا یا دینا اس کے لیے معمولی سی بات ہوگی کیوں کہ وہ بچپن سے یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر ہی بڑا ہوا ہے۔ اس کے لیے کوئی جرم، جرم نہیں رہ جائے گا۔ گھر میں دیکھ رہا ہے کہ گھر میں باپ موجود ہے، کوئی دوست ملنے آ گیا تو بچے ہی سے کہلوا دیا "جاؤ بیٹا! انکل سے کہو کہ ابو گھر پر نہیں ہیں۔" اس طرح ہم نے بچے کی جھوٹ بولنے کی تربیت کر دی۔ اس نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا اور پردہ ڈالنا بھی سیکھ لیا۔

جب تربیت کا یہ عالم ہوتا ہے ہمارے معاملات کیسے ٹھیک ہوں گے؟ اس لیے میں کہتا ہوں کہ Child education کو درست کر لیا جائے تو ہمارے تمام مسائل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہماری Child education ٹھیک ہو جائے تو امید ہے کہ پچیس سال کے بعد ہمارے یہ معاملات ٹھیک ہونا شروع ہو جائیں گے۔ ایک ایک مسئلہ پر تقریریں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دانش ور حضرات بہت عرصے سے

اپنی سی کوشش کر رہے ہیں لیکن معاملات بجائے سنورنے کے دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ سب حالات اسی وقت ٹھیک ہوں گے جب گھروں کے اندر ہماری اولاد ہماری ہی شکل میں ایمانداری کے نمونے دیکھے گی۔

ہم کبھی ایک محکمے کو تو کبھی دوسرے محکمے کو برا کہتے ہیں۔ کبھی ایک طبقے کو تو کبھی دوسرے طبقے کو برا کہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہم بیوروکریسی پر تمام الزامات دھر رہے تھے۔ آج کسی سروس پر تو کل کسی اور سروس پر ہم یہ الزام دھر رہے ہوں گے۔

یہاں ایک چھوٹا سا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ لوگ ہیں کون؟ یہ سول سرونٹس ہیں یا فوجی، کوئی جج ہے یا پٹواری۔ یہ سب ہمارا ہی تو حصہ ہیں۔ ہم میں سے کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا بھتیجا، کسی کا باپ یا کسی کا چچا تایا ہیں۔ سب اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ پاکستانی ہی ہیں ناں سب؟ باہر سے تو نہیں آئے یہ لوگ۔ یہ وہی Behave کریں گے جو کچھ انھوں نے اس معاشرے میں دیکھا یا سیکھا ہوگا۔

ادارے اور محکمے اسی معاشرے کے افراد سے مل کر بنتے ہیں۔ سب سے پہلے Child education (بچوں کی تعلیم) کو درست کریں۔ پھر 25 سال بعد آپ کو وہی کچھ ملے گا جو آپ چاہتے ہیں۔ ایک دم سے کچھ نہیں بدلے گا۔ ایسی تعلیم یا معیارِ تعلیم مقرر کریں جو ان بچوں میں Civic Sense کو Develop کر سکے۔ جب یہ Sense ان میں پیدا ہو جائے گی تو پھر ان میں Sense of Responsibility (احساسِ ذمہ داری) پیدا ہو جائے گی۔ آپ گھر میں بھی اپنے رویے درست کریں۔ پھر ہمیں یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ اس حکمران کو اتارو، دوسرے کو لاؤ۔ چائلڈ ایجوکیشن کو درست کر لینے کے بعد کرپشن کا سلسلہ بند ہو جائے گا پھر جو بھی آئے گا ایماندار ہوگا۔

سوال: جو شخص کسی صاحبِ علم سے واقف نہیں وہ تو انجانے میں بغیر کسی سے راہنمائی لیے وظیفہ کرے گا۔ وہ کسی صاحبِ علم کو کیسے تلاش کرے؟

جواب: کسی بھی صاحبِ علم کو پرکھنے کے دو طریقے ہیں

1- لٹمس ٹیسٹ (Litmus Test) جس سے فوری نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔
2- Long-term Test (طویل المیعاد آزمائش)

جب آپ کسی صاحبِ علم کے پاس جاتے ہیں تو اس سے ملاقات کے بعد آپ کو قلبی سکون ملتا ہے۔ اس میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس بندے سے دوبارہ ملا جائے۔ چونکہ رب تعالیٰ کے ذکر سے قلوب اطمینان پاتے ہیں، اس صاحبِ علم سے ملاقات سے ملنے والا سکون دراصل اسی کلامِ الٰہی کا اعجاز ہے جس کا وہ شب و روز ورد کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ صاحبِ علم کبھی نصیحت نہیں کرے گا۔ کسی بھی تبدیلی کے لیے وہ صرف گفتگو کرتا ہے

اور بغیر کسی نصیحت یا سختی کے لوگ نیکی کی طرف راغب ہونے لگتے ہیں۔ وہ کبھی آپ سے نہیں کہتا کہ نماز پڑھو۔ وہ خاموشی سے اٹھے گا اور جا کر نماز ادا کرے گا۔ صاحب علم شور نہیں مچائے گا "لوگو! میں نماز کے لیے جا رہا ہوں، تم بھی اٹھو۔" اگر آپ صاحب علم کے پاس ملاقات کے لیے جاتے رہتے ہیں تو حیران کن طور پر آپ پابند نمازی ہو جائیں گے۔ اسی طرح سے وہ آپ سے کبھی نہیں کہے گا کہ شراب مت پیو، جوا نہ کھیلو لیکن اس کے پاس جانے کے کچھ عرصہ بعد آپ یہ تمام خرافات چھوڑ کر نیکی کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ یہ اس کا دوسرا Test ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں آپ کو حاصل ہو جائیں تو سمجھ جائیں کہ وہ شخص واقعی صاحب علم ہے چاہے وہ اپنی زبان سے اپنے صاحب علم ہونے کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ وہ کبھی اپنے ولی اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ ولایت دو قسم کے جھوٹ کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جو شخص واقعی کچھ ہے وہ کہتا ہے میں تو کچھ نہیں ہوں اور جو شخص کہتا ہے کہ میں بہت کچھ ہوں، یہ بھی جھوٹ ہے اور ان دو قسم کے جھوٹ کے درمیان ولایت پوشیدہ ہوتی ہے۔

جو شخص دعویٰ کر رہا ہے سمجھ جائیے وہ جھوٹا ہے۔ اس کے پاس علم نہیں۔ اس کی مثال میں آپ کو یوں دے سکتا ہوں کہ اگر آپ کسی چھت والے چھوٹے کمرے کے درمیان میں کھڑے ہو جائیں تو آپ کو اپنا قد بہت لمبا محسوس ہوگا۔ حالانکہ قد وہی پانچ فٹ دس یا گیارہ انچ ہوگا لیکن آپ کو وہاں آپ لمبا اور بڑا محسوس ہوگا۔ اسی قد کاٹھ اور جسامت کے ساتھ آپ کبھی فٹ بال گراؤنڈ یا کرکٹ گراؤنڈ کے Centre میں کھڑے ہو جائیں اور ارد گرد نظر دوڑائیں تو آپ خود کو اپنے قد سے بھی چھوٹے نظر آئیں گے کیوں کہ آپ کی نگاہ میں وسعت پیدا ہوگئی ہے اور آپ کی نگاہ دور تک جا رہی ہے۔ گراؤنڈ بہت بڑی ہے اور اس دور تک نگاہ جانے کی Relationship میں آپ کو اپنا قد چھوٹا نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی صحرا کے درمیان میں جا کھڑے ہوں تو آپ اپنے آپ کو بالکل ایک نقطے کی طرح محسوس کرنے لگیں گے۔ آپ خود کو بہت چھوٹے محسوس ہوں گے کیوں کہ صحرا میں نگاہ کی وسعت بہت بڑھ گئی ہے۔

یہ جو Human eyesight ہے۔ اگر آپ زمین پر کھڑے ہیں تو Horizon Line (جہاں افق زمین سے ملا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسے اردو میں خط استوا اور انگریزی میں Horizon Line کہتے ہیں۔) ساڑھے سات میل دور دکھائی دے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر آپ کی آنکھ ساڑھے سات میل دور تک دیکھ سکتی ہے۔ اگر آپ سمندر میں ہوں تو افق سترہ میل دور دکھائی دے گا اور اگر آپ ہوائی جہاز پر سفر کر رہے ہوں تو Horizon Line ساڑھے اکتالیس میل دور دکھائی دے گی۔ اب Horizon Line تو Move نہیں کر رہی۔ اس کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ وہ تو یوں وجود میں آتی ہے کہ جہاں آپ کی آنکھ کے دیکھنے کی Limit یا نگاہ کی وسعت ختم ہوتی ہے وہاں آپ کو یہ Horizon Line محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح کسی شخص کو جتنا علم عطا ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی اس کی نگاہ میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی

ہے۔جس قدر نگاہ کی وسعت زیادہ ہو گی اسی قدر Mental Horizon بڑھے گا اور ادراک میں اضافہ ہو جائے گا۔جس قدر علم کی وسعت کا ادراک ہو گا اُسی قدر اپنی ذات چھوٹی دکھائی دے گی۔اس لیے جو جتنا بڑا صاحب علم ہو گا وہ اپنے آپ کو اتنا ہی چھوٹا محسوس کرے گا اور خود کو اُتنا ہی چھوٹا کہے گا۔اور جتنی Shallow اس کی نگاہ کی وسعت ہو گی وہ اپنے آپ کو اتنا ہی بڑا دیکھتا ہے۔جیسے ہم چھوٹے کمرے میں خود کو بڑا محسوس کرتے ہیں۔

اگر کسی صاحب علم کو دعویٰ کرتے سنیں تو سمجھ جائیں کہ وہ Shallow ہے اور جس قدر آپ کسی کو Down to earth پائیں سمجھ لیں کہ وہ صاحب علم ہے۔بس ایسے ہی صاحب علم سے مشورہ کریجیے۔وہ آپ کو بتا دے گا کہ یہ پڑھیے اور یہ نہ پڑھیے۔وہ وظیفہ آپ کے لیے صحیح رہے گا۔

دُنیا اور رُوحانیت

ایک زمانہ تھا جب یہ سنتے تھے کہ دُنیا اور رُوحانیت کو اکٹھے لے کر چلنا بڑا دشوار کام ہے۔ یہ سن کر ہم دل ہی دل میں مذاق اُڑایا کرتے اور اگر مہذب طریقے سے کہا جائے تو ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ یہ جو گفتگو کا فن ہے اس میں انسان مشکل سے مشکل بات بھی بڑے خوب صورت انداز میں کہہ جاتا ہے۔ ایک مشہور اور بڑے شاعر نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ جنرل ضیاء صاحب کبھی کبھی صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو بلا لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے شاعروں کو مدعو کیا ہوا تھا۔ قطار میں سب کا یکے بعد دیگرے تعارف ہو رہا تھا۔ جب ایک بزرگ شاعر کے پاس صدر صاحب آئے۔ ان سے تعارف ہوا۔ صدر صاحب نے ازراہِ اخلاق کہا "کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" شاعر کہنے لگے "جی اللہ کا بہت احسان ہے۔" جب صدر صاحب اگلے شاعر کی طرف ہاتھ ملانے کے لیے بڑھنے لگے تو وہ شاعر کہنے لگے "جو میں نے عرض کیا ہے۔ وہ عقیدتاً اور مروتاً ہے ورنہ صورتِ حال اس سے خاصی مختلف ہے۔"

اسی طرح میں بھی یہ عرض کر رہا ہوں کہ کسی زمانے میں جب یہ کہا جاتا کہ دُنیا اور رُوحانیت کو اکٹھے لے کر چلنا دشوار ہے تو ہم دل میں مذاق اُڑاتے تھے کہ بھلا اس میں کیا دشواری ہو سکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عنایت کر دی کہ بڑے شاہ صاحب جیسا مہربان انسان مل گیا۔ میں جب ان کے پاس بھی بیٹھا ہوتا تو دل ہی دل میں کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا۔ ہمیں ہر وقت دل میں کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادت پڑ جائے تو خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی ہم سے مخاطب نہ ہو اور نہ ہی ہمیں کسی سے کوئی بات کرنا پڑے کیوں کہ رب تعالیٰ کے ساتھ دل ہی دل میں رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور اس رابطے میں لوگوں سے گفتگو کی وجہ سے جب خلل آتا ہے تو وہ طبیعت پر بہت گراں گزرتا ہے۔ اس لیے انسان کو تنہائی اچھی لگنے لگتی ہے۔

پہلے جب میں Tours پر جاتا تھا تو ڈرائیور کو پیچھے بٹھا لیا کرتا تھا اور گاڑی خود Drive کیا کرتا۔ پھر ڈرائیور کو یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ تم گھر کی Duty کرو میں اکیلے ہی ٹور پر جایا کروں گا۔ چونکہ سفر میں تنہا ہوتا تھا تو بڑے اطمینان کے ساتھ کچھ پڑھتا رہتا تھا یا پھر قاری شیخ ایوب صاحب کی شب قدر میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کی گئی قرات مجھے پسند تھی، وہ سنتا رہتا تھا۔ یہ پرانی بات ہے۔ ان ہی دنوں جی ٹی روڈ کو جرانوالہ سے پہلے راولپنڈی بائی پاس کے نام سے ایک نئی سڑک بنی۔ اس کا ابھی افتتاح نہیں ہوا تھا۔ ہم نے سوچا

روڈ بن تو گئی ہے ذرا دیکھتے چلیں کہ کہاں جا کر نکلتی ہے۔ تو اسلام آباد جاتے جاتے گاڑی ادھر کو موڑ لی۔ اس زمانے میں اس سڑک کو تعمیر ہوئے ابھی دو یا تین دن ہوئے تھے۔ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ بس کھیت ہی کھیت تھے۔ ایک Point پر جا کر مجھے ایک قطعہ ارضی بہت پسند آیا۔ وہاں تا حد نظر آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ میں نے گاڑی سڑک سے نیچے اتار لی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی آدمی مل جائے۔ کافی دور کھیتوں میں دو آدمی کھڑے تھے۔ میں ان کی طرف چلا گیا اور پوچھا "بھائی یہ زمین کن صاحب کی ہے؟" انھوں نے جواب دیا "کہیے یہ ہماری زمین ہے۔" میں نے کہا "آپ جس جگہ کھڑے ہیں وہاں سے مجھے دو کنال زمین دے سکتے ہیں؟" وہ پوچھنے لگے "یہاں کھیتوں کے عین درمیان میں ہی کیوں؟" میں نے بجائے کوئی بہانہ بنانے کے بے وقوفوں کی طرح سیدھے انداز میں کہہ دیا "کرنا کیا ہے جی! یہاں چھوٹا سا دو کمرے کا ٹھکانہ بنا کر اللہ اللہ کریں گے۔" انھوں نے بڑے غور سے میرا حلیہ دیکھا۔ پھر سڑک کے کنارے کھڑی گاڑی کو دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کی طرف کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد کہنے لگے "اگر اس مقصد کے لیے آپ کو یہ مختصر سی زمین چاہیے تو آپ Payment کیوں کرتے ہیں۔ آپ ایسے ہی لے لیجیے۔ اسی بہانے ہمیں بھی کچھ ثواب مل جائے گا۔" اب میں بڑا خوش تھا کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کروں گا اور رب تعالیٰ کی رحمت دیکھو کہ اس نیک مقصد کے لیے زمین بھی مفت دلوا دی۔ میں بڑا خوش خوش واپس لاہور آیا اور اسی خوشی میں بڑے شاہ صاحب سے عرض کیا "حضور! آپ کو ایک جگہ لے کر چلوں گا۔ وہاں میں نے زمین حاصل کر لی ہے۔" انھوں نے کہا۔ "اچھا! کدھر؟" میں نے ان کو جگہ کا کچھ General Idea دے دیا۔ پوچھنے لگے "وہاں کیا کرو گے؟" میں نے کہا "جی بیٹھ کر تنہائی میں اللہ اللہ کریں گے۔" اب میرا خیال تھا کہ وہ بڑا Appreciate کریں گے کہ واہ اچھا شاگرد نکلا میرا۔ لیکن میری توقع کے برعکس مجھے جوتے پڑ گئے۔ کہنے لگے "یہ کیا کرنے لگے ہو تم؟ یہ کون سی بہادری ہے کہ تم ایک کونے میں جا کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اللہ اللہ کرو۔ یہ تو کوئی بھی کر لے گا۔ کمال تو یہ ہے کہ دنیا میں پوری طرح رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلو۔" اس وقت میں نے کہا "حضور! یہ کون سا دشوار کام ہے یہ بھی کر لیتے ہیں۔" لیکن اب آ کے اندازہ ہونے لگا ہے کہ پہلے جو لوگ فرما گئے کہ ایک ہاتھ میں دنیا اور ایک ہاتھ میں دین رکھ کر جینا اور پھر اس طرح جینا کہ دونوں یکساں رہیں، ان میں کمی یا زیادتی نہ آنے پائے اور ان کا توازن نہ بگڑے۔ یہ واقعی نا ممکن حد تک مشکل کام ہے۔

سوال: شیطانی ہم زاد سے کیا مراد ہے؟ اس کی تخلیق کی وجہ کیا ہے؟

جواب: جس طرح نفسیات اور دیگر دنیاوی علوم و معاملات میں اثبات کی بہت اہمیت ہے بلکہ Psychology میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ اثبات پر ہی صحت مند اور تعمیری چیزیں قائم ہیں۔ وہ اثبات خواہ انسان کے Attitudes میں ہو یا اس کی سوچ میں۔ اسی طرح Positive criticism (مثبت تنقید) سے مراد وہ تنقید ہے جو اس نقطہ نظر سے کی جائے کہ معاملات درست ہو جائیں۔ Psychology میں اثبات کی بے پناہ اہمیت ہے۔ جو لوگ کسی قسم کی Psychic problem (نفسیاتی مسئلہ) کا شکار ہوں ان کے سائیکاٹرسٹ انھیں اثبات کی ہی مشقیں کراتے ہیں۔ ذکر میں بھی دو ضربیں ہیں جو دل پر لگائی جاتی ہیں۔ اثبات کی ضرب اور نفی کی ضرب۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں جب بھی کوئی Forceful بات

کی ہے تو اس کی ابتدا نفی سے کی تھی کہ کفر سے اسلام میں داخلہ بھی نفی سے ہے۔ کلمہ طیبہ کی ابتدا 'لا' سے ہے۔ انسان پہلے اپنی تمام تر سابقہ چیزوں کی نفی کرتا ہے پھر اقرار کرتا ہے نئی چیزوں کا جو بہر حال مثبت ہیں۔ اسی طرح جب ہم کلمہ شریف پڑھتے ہیں تو اپنے گزشتہ تمام معتقدات کی 'لا' کہتے ہوئے نفی کرتے ہیں۔ "نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ" یہ کہنے کے ساتھ ہی نفی ہو گئی ان تمام پتھر کے بتوں کی، ان تمام فکری بتوں کی اور ان تمام سوچ کے بتوں کی جو ہم اپنے دل و دماغ میں سجا کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی تمام جگہ صرف اور صرف وحدہٗ لاشریک نے لے لی۔

اگر صرف پتھر کے بتوں کی نفی مقصود ہوتی تو انسان صرف کلمہ پڑھتا اور بات ختم ہو جاتی۔ ایک پورا Way of life انسان کو نہ دیا جاتا۔ لیکن مسلمان سے مومن تک پہنچنے کے لیے اپنے پرانے عقائد اور پرانے Way of life کو بھلا کر ایک نیا عقیدہ اور ایک نیا Way of life اپنانا پڑتا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ لوگ میری بات سے اتفاق نہ کریں۔ وہ آپ کا حق ہے۔ لیکن میری سوچ کے مطابق پتھر کے بتوں کی نفی اور وحدہٗ لاشریک اور آپ ﷺ کی رسالت کے اقرار سے انسان مسلمان تو ہو جائے گا لیکن مومن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی سوچ کے بتوں اور فکری بتوں کی بھی نفی کریں اور جب آپ اپنی سوچ اور اپنی فکر کو اللہ تعالیٰ کے ماتحت لے آئے تو خود بخود مومن ہو گئے۔

یہ ذکر اذکار کیا ہیں؟ یہ بھی تو نفی ہیں۔ اللہ کے لیے انسان کی اپنی سوچ کی نفی۔

تصوف میں ہم دل پر ضرب لگاتے ہیں۔ نفی کی ضرب پہلے لگاتے ہیں پھر اثبات کی ضرب لگاتے ہیں۔ آپ نے خانقاہی نظام میں دیکھا ہوگا۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ خانقاہی نظام در اصل ہے کیا۔ ایک زمانے میں جب اسلامی دنیا میں جبر بڑھ گیا تھا۔ جبر اس sense میں کہ مخلوق سوچیں اور اسلام کی راہوں میں جب اختلافات بڑھ گئے، علمائے کرام پر کھلے عام سچ اور حق بات کہنے پر پابندی لگ گئی تھی کہ حق بات کہنے کی پاداش میں انھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑتے یا انھیں عمر بھر کے لیے زندان میں ڈال دیا جاتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کمزور لوگوں نے حق کا راستہ نہیں چھوڑا۔ یہ اُن کا بہت بڑا کریڈٹ تھا۔ میں نے لفظ "کمزور لوگ" اس لیے استعمال کیا ہے کہ کلمہ حق علی الاعلان کہنے کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کی روح کو زندہ رکھنے کے لیے لوگوں کی تربیت شروع کر دی۔ انھوں نے درس و تدریس اور Training کا ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا۔ یہ خانقاہی نظام کی ابتدا تھی۔ جہاں علم پڑھایا اور سکھایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ Practical training بھی ہوتی تھی۔ پھر وہاں حق پر چلنے والے لوگ تیار کیے جاتے۔ یوں محدود پیمانے پر یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

گزرتے زمانے کے ساتھ یہ خانقاہی نظام بدلتا چلا گیا حتیٰ کہ یہ تصوف کا گڑھ بن گیا۔ یہاں ایسی منطقیں کروائی جانے لگیں جن کا تعلق روحانیت سے ہوتا تھا۔ یہ فطرت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے اپنی اصل شکل کھو دیتی ہے۔ یہ خانقاہی نظام جب اپنی اصل شکل میں رائج تھا تب وہاں ایک حلقہ بنایا جاتا اور باواز بلند ذکر کیا جاتا۔ ابھی بھی کہیں کہیں یہ چیز آپ کو دیکھنے کو ملے گی۔ استاد ذکر کا آغاز کرتا ہے اور

باقی موجود سب لوگ اس کو Follow کرتے ہیں۔ یہ ذکر کلمہ طیبہ کے پہلے حصے لا الٰہ الا اللہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ لا الٰہ نفی کی ضرب ہے جب کہ الا اللہ اثبات کی ضرب ہے۔ یہ دونوں ضربیں دل پر لگائی جاتی ہیں۔ لا کہتے ہیں تو سانس Inhale کرتے ہیں وحدہٗ لا شریک الا اللہ Force کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس میں دل پر ضرب لگتی ہے۔ نفی اثبات کی اس ضرب کا نتیجہ بڑا عجیب آتا ہے۔ وہ یہ کہ اس سے دل کمزور ہو جاتا ہے۔ بہت کم لوگ آپ کو بتائیں گے کہ جوں جوں نفی اثبات کی ضرب لگائی جائے ابتدا میں دل نرم ہوگا لیکن آہستہ آہستہ کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ ایک زمانے میں میں نے بھی ایسا کیا لیکن اب یہ ذکر نہیں کرتا۔

اگر کسی کو یہ ضرب لگانے کا شوق ہو تو وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ ہر نماز کے بعد تین مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کی ضرب لگائے۔ اس سے دل کمزور نہیں ہوتا لیکن فائدہ مل جاتا ہے۔ مسلسل یہ ضرب لگانے سے دل سے دنیا کی محبت اور سب مادی چیزوں کی محبت نکل جائے گی۔

نفی اور اثبات کی ضربیں دل سے دنیا کی محبت نکال دیتی ہیں۔ چونکہ Vacuum کہیں نہیں رہ سکتا اس لیے نفی کی ضرب لگانے سے جب دنیاوی آلائشیں دل سے نکل جاتی ہیں تو پھر وہاں رب تعالیٰ بیٹھ جاتا ہے۔ کیوں کہ رب تعالیٰ ان آلائشوں کے ہوتے ہوئے کبھی آپ کے دل میں نہیں بیٹھے گا۔ جب رب تعالیٰ دل میں بسیرا کر لیتا ہے تو یہی وہ مقام ہے جہاں شیطانی ہمزاد اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ پھر نفس قابو میں آ جاتا ہے۔ شیطانی ہمزاد در اصل نفس کی شکل میں ہے اور یہ بڑے بڑے کام دکھاتا ہے۔ اس کی کئی کئی صورتیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ بعض اوقات انسان سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا کشف جاری ہو گیا۔ در حقیقت یہ شیطان بہکا رہا ہوتا ہے کیوں کہ انسان کے اندر رہنے والی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک شخصیت پاکیزہ اور رحمانی ہے۔ جب ہم دنیاوی آلائشوں سے دور ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ اوامر و نواہی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تو ہماری روح میں لطافت اور پاکیزگی آتی ہے۔ اس کی پرواز بڑھتی ہے۔ جوں جوں ہماری روح لطیف ہوگی، پاکیزگی کے بلند مقام پر ہوگی توں توں وہ بلند جہانوں کی سیر کرے گی اور جتنی اس روح کی لطافت کم ہوتی چلی جائے گی اتنی ہی اس کی پرواز پست ہوتی چلی جائے گی۔ جب ہم گناہوں میں ملوث ہوتے چلے جائیں گے تو روح کی لطافت اور پاکیزگی کم ہوتی چلی جائے گی اور اس کی کثافت بڑھتی چلی جائے گی۔ جتنی زیادہ کسی چیز کی کثافت ہوگی اور وزن ہوگا اس کی پرواز اتنی ہی مشکل ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آہستہ آہستہ نفس ہم پر غلبہ پانے لگے گا حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ ہم پوری طرح اپنے نفس کے قابو میں آ جاتے ہیں۔ اس بات کو اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ دھبا لگ جاتا ہے۔ اگر وہ باز آ جائے اور توبہ اور استغفار کرے تو دل صاف کر دیا جاتا ہے۔ دوبارہ وہی گناہ کرے تو دھبا بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔"

(جامع ترمذی الحدیث نمبر 3334)

کس قدر علم کی بات آپ ﷺ نے بیان فرمائی ہے کہ رفتہ رفتہ نفس ہم پر اتنا غلبہ کر لیتا ہے کہ ہم پوری

طرح نفس کے قابو میں آ جاتے ہیں اور شیطان ہم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں ہم سوچتے ہیں کہ ہم سیدھی راہ کی طرف نکل جائیں تو یہ شیطان ہمیں مختلف چیزیں دکھانے لگتا ہے۔ کئی سوچیں آنے لگتی ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ واہ واہ اب تو کشف جاری ہو گیا، ہم پر تو القا شروع ہو گیا۔ حالانکہ وہ القا یا کشف نہیں ہوتا بلکہ یہ شیطان ہوتا ہے جو ہمیں مختلف چیزیں دکھا رہا ہوتا ہے کہ ہم کہیں سیدھی راہ پر نہ نکل جائیں۔

جن دنوں میں 40,42 وظائف صبح و شام کیا کرتا تھا انہی دنوں ایک بار جب میں لیٹا ہوا تھا تو مجھے اچانک دیوار پر ایک آیت لکھی ہوئی نظر آئی۔ ان اللہ علی کل شیء قدیر اور ساتھ ہی آواز آئی کہ یہ آیت پڑھا کرو۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ جونہی میں آنکھیں بند کرتا وہ آیت دکھائی دیتی اور ساتھ ہی اسے پڑھنے کی تلقین ہوتی لیکن میں نے کبھی وہ آیت نہ پڑھی۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب میری بڑے شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہ صورتحال بیان کی۔ تب انہوں نے بتایا کہ دراصل وہ جنات تھے جو تمہیں یہ آیت دکھایا کرتے تھے۔

تصوف کی راہ میں چیزیں کئی رنگ بدل کر آپ کے سامنے آتی ہیں۔ ان کا مقصد آپ کو اس راہ سے ہٹانا ہوتا ہے۔ شیطانی ہمزاد بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس شیطانی ہمزاد کو مارنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دل کو تمام آلائشوں سے پاک کر لیجیے تاکہ اس میں رب تعالیٰ آ جائے۔

جب بھی ہم کوئی ذکر کرتے ہیں اس کی ابتدا زبان سے ہوتی ہے۔ اگر ہم پُرخلوص طریقے سے وہ ذکر جاری رکھیں تو غیر محسوس طریقے سے یہ زبان سے Shift ہو کر دل میں چلا جاتا ہے اور قلب سے ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے رکھے اور ہم خلوصِ قلب سے وہ ذکر کرتے رہیں تو قلب میں اس ذکر کی جگہ قربِ الٰہی سما جاتا ہے۔ جب قلب میں قربِ الٰہی سما جائے اور ہم پھر بھی استطاعت بھر ذکر جاری رکھیں تو وہ ذکر ہمیں رب تعالیٰ تک لے جاتا ہے۔ جس طرح ایک مسلمان سے مومن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان پہلے مسلمان ہو تبھی وہ مومن ہو پائے گا۔ مسلمان سے مومن تک کے سفر کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے۔ جو شخص محنت سے روزی کما کر کھاتا ہے وہ روحانیت کا سفر جلدی طے کر لیتا ہے۔ اس سے اگلی چیز یہ ہے کہ انسان خود محنت کر کے کھائے اور اپنی مشقت کی کمائی دوسروں پر بھی خرچ کرے۔ روحانیت میں یہ چیزیں Booster rocket کا کام کرتی ہیں۔ پھر ایک مقام آتا ہے جہاں انسان روحانیت کے اس مقام پر چلا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے اس مشقت سے ہی بے نیاز کر دیتا ہے۔ پھر اُسے غیب سے کھلاتا ہے۔

اسی طرح ذکر کے معاملے میں ضروری ہے کہ پہلے زبان سے مکمل اخلاص کے ساتھ اللہ کا ذکر شروع کیا جائے پھر قلب سے ذکر کیا جائے تب قربِ الٰہی کی Stage آ جائے گی۔

وظیفہ تسمیہ کی مزید وضاحت

سوال: اسلام میں شرعی حق مہر ساڑھے بتیس (32) روپے ہے۔ اسلام یا شرع اس بارے میں کیا کہتی ہے؟
جواب: اصل میں دو ساڑھے 32 دینار ہے۔ لیکن میری اپنی معلومات کے مطابق اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ حق مہر کتنا باندھا جائے۔

حق مہر ایک Obligatory تحفہ ہے Husband کی طرف سے اپنی Wife کے لیے۔ میں اسے Obligatory اس لیے کہہ رہا ہوں کیوں کہ شوہر پابند ہے کہ وہ نکاح کے بعد اپنی بیوی کو کچھ تحفہ ضرور پیش کرے۔ پیشتر اس کے کہ وہ دونوں اپنی عملی زندگی کا آغاز کریں۔ حق مہر بیوی کا حق ہے اور کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اسے فی الفور ادا کر دیا جائے۔ البتہ اگر Wife خود شوہر سے Request کرے کہ حق مہر مجھے وصول ہو گیا ہے۔ اسے آپ اپنے پاس رکھیے۔ جب مجھے ضرورت ہوگی تو آپ سے لے لوں گی۔ تب شوہر کو چاہیے کہ حق مہر کی وہ رقم امانتاً اپنے پاس رکھ لے اور جب بھی بیوی اس کا تقاضا کرے فوری طور پر اسے ادا کر دے۔ اس صورت میں Payment (ادائیگی) Defer ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں اگر بیوی اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے حق مہر معاف کر دے تو یہ معاف ہو جائے گا۔

میری ذاتی رائے یہی ہے کہ بے شک بیوی اپنا یہ حق دس بار معاف کر دے لیکن یہ پیسہ یا تحفہ اس کی امانت سمجھ کر علیحدہ رکھ لیا جائے اور کسی مناسب موقع پر اس کو دے دیا جائے۔ حق مہر رب تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ ہے لہٰذا اس کو ادا کر دینا ہی مناسب ہے۔

جہاں تک Amount کی بات ہے تو اسلام میں صرف یہ ہے کہ شوہر بغیر کسی مالی دباؤ کے جس قدر رقم Afford کر سکتا ہے وہ بطور حق مہر ادا کر دی جائے۔ اس رقم کا تعین شوہر کی مالی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ وہ یہ رقم بغیر کسی مالی دباؤ کے ادا کر سکے۔ (میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آسانی سے ادا کر سکے بلکہ میں یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ جتنی رقم وہ بغیر مالی دباؤ میں آئے ادا کر سکے، بغیر قرض اٹھائے اور ادھار لیے۔ خواہ

اس کے لیے اسے تھوڑا تنگ ہی ہونا پڑے گا۔

سوال: چالیس دن مکمل ہونے کے بعد 70 مرتبہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی ہے تو کیا یہ وظیفے کی طرح پڑھنی ہوگی یا کچھ گنتی فالتو بھی پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب: وظیفے کی تعداد اور دن مکمل ہو جانے کے بعد اس کو روزانہ 70 مرتبہ صبح اور رات پڑھ لیا جائے۔ شرائط وہی رہیں گی۔ شرائط میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ کوشش کیجیے گا کہ تنہائی میں پڑھ لیں۔ اپنے پاس کوئی خوشبو سا لگا لیں اور رات کو جب وظیفہ پڑھیں تو اس کے بعد کوشش کریں کہ بغیر کسی سے گفتگو کیے یا دنیاوی مصروفیت میں الجھے بے شک دو منٹ کے لیے سو جائیں پھر اس کے بعد بیدار ہو جائیے اور دیگر ضروری کام سرانجام دے لیجیے۔

سوال: کیا دو فریقوں کے درمیان صلح کروانے کے لیے ایک کی غیر موجودگی میں دوسرے فریق کی باتیں سننا بھی گناہ ہے؟ کیا یہ بھی غیبت میں شمار ہوتا ہے؟

جواب: اگر ہم دو ناراض مسلمانوں کے درمیان صلح کروانے کی نیت رکھتے ہیں اور اس میں ہم اپنے Comments شامل نہیں کرتے بلکہ دونوں فریقوں کا موقف علیحدہ علیحدہ سنتے ہیں تاکہ صورتِ حال واضح ہو سکے تو یہ قطعی طور پر غیبت کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

جب تک ہم دونوں پارٹیوں کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع نہیں دیں گے تاکہ ان کے دلوں میں جو ایک دوسرے کے لیے غبار بھر گیا ہے وہ ہمارے سامنے Steam off ہو جائے تب تک فائدہ نہیں ہوگا۔ اس سے ہمیں اصل صورتِ حال کا اندازہ ہو جائے گا اور دونوں فریقوں کی بھی تسلی ہو جائے گی اس سلسلے میں یہ احتیاط کر لی جائے کہ جو کچھ ہم دوسروں سے سنیں وہیں بھلا دیں۔ اس کو کہیں Quote نہ کریں کہ فلاں پارٹیوں یا لوگوں کے درمیان تو یہ معاملہ ہوا تھا کیونکہ ایسا عمل غیبت میں شمار ہوگا۔ فریقین کو Steam off ہونے کا موقع دیں اور ان کا معاملہ کسی اور جگہ Quote نہ کریں بلکہ صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا، غیبت کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

سوال: کیا بسم اللہ الرحمن الرحیم والا وظیفہ چالیس دن مکمل ہو جانے کے بعد Refresher Course کے طور پر کبھی کبھار دوبارہ پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب: الحمدللہ اس وظیفے کی برکات اتنی زیادہ ہیں کہ اگر ہم نے پہلی بار تعداد مکمل پابندیوں کے ساتھ پوری کر لی اور اس کے بعد 70 مرتبہ صبح و شام پڑھتے رہے تو یہ وظیفہ دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اس ضمن میں یہ عرض کردوں کہ کچھ عرصے کے بعد انسان اس پوزیشن میں آ جاتا ہے کہ اس سے اگلے Level کا کوئی کلام پڑھ لیا جائے۔ اگر ایسا کوئی صاحب ہمت ہو جس نے اس کو بھی پورا کر لیا اور میں اس

وقت تک حیات ہوا تو اسے اگلا سبق ضرور دوں گا۔ ان شاء اللہ!

سوال: کیا ضروری ہے کہ کوئی کمرہ وظیفے کرنے کے لیے مختص کر دیا جائے؟ ایسے میں اگر سفر کرنا پڑ جائے تو پھر انسان کیا کرے؟

جواب: کمرے کو مخصوص کرنے کی پابندی کے پیچھے کوئی اور وجہ نہیں سوائے اس کے کہ جب ہم تنہا کمرے میں بیٹھتے ہیں اور وظیفہ کرتے ہیں تو ہماری یکسوئی بہت بڑھ جاتی ہے۔ کسی قسم کی Disturbance نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا Concentration level بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً اپنی Familiar جگہ پر Comfortable محسوس کرتا ہے۔ اس کی Body relax کر جاتی ہے۔ اس کے تمام Limbs تمام Nerves اور تمام Muscles آرام دہ اور پُرسکون کیفیت میں چلے جاتے ہیں۔ جس قدر ہم Relaxed ہوں گے اسی قدر ہماری Concentration بڑھ جائے گی۔ جب ہم پوری توجہ اور دل جمعی سے پڑھائی کریں گے تو اس کے انعامات بھی زیادہ ملیں گے۔ ان دو وجوہات کے پیش نظر میں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر گنجائش ہو اور انسان Afford کر سکتا ہو تو گھر کا کوئی ایک کونا یا کمرہ اپنی عبادات اور وظائف کے لیے مختص کر لیں تاکہ اس دوران Disturbance سے بچا جا سکے اور دوسرے لوگوں کے معمولات میں بھی ہماری وجہ سے فرق نہ آئے۔

ہمیں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ہماری عبادات دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ فرض کریں ایک Common Bedroom ہمارے استعمال میں ہے۔ دوسرا آدمی جو ہمارے ساتھ وہ کمرہ Share کر رہا ہے وہ تھکا ہوا ہے اور آرام کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ صرف اس لیے کمرے میں داخل نہیں ہو رہا کہ وہاں ہم عبادت کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس چیز سے بچنے کے لیے میں علیحدہ کمرے یا جگہ پر زور دے رہا تھا کہ ایسی جگہ منتخب کر لیں جو کم از کم رات کو اہل خانہ کے استعمال میں نہ ہوتی ہو تاکہ آپ بھی وہاں اطمینان اور یکسوئی سے وظائف کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی آپ کی وجہ سے کوئی دقت یا پریشانی نہ ہو۔

اگر ایام وظیفہ میں آپ کو سفر کرنا پڑے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ گاڑی سڑک کے کنارے Park کریں۔ ساری زمین پاک ہوتی ہے تاوقتیکہ ہمیں اس پر کوئی ظاہری گندگی نظر نہ آئے۔ آپ وہاں قصر نماز ادا کریں اور وظیفہ گاڑی چلاتے ہوئے پڑھ لیجیے۔ لیکن اس کام کو Miss نہ کریں۔ کبھی کبھار تو ٹھیک ہے لیکن اس کو معمول نہ بنائیں تاکہ Concentration بہتر رہے۔

سوال: اس وظیفے کے دوران پیاز، لہسن، مچھلی اور مولی کی Smell سے پرہیز ضروری ہے۔ جو لوگ سگرٹ نوشی کرتے ہیں کیا انھیں اس وظیفے کے دوران سگرٹ پینے سے بھی اجتناب کرنا ہو گا؟

جواب: دو چار چیزیں میں نے مثال کے طور پر بتائی تھیں تاکہ بات سمجھ میں آ جائے۔ کوئی بھی ایسی چیز جس کی Smell طبیعت پر ناگوار ہو خواہ حلال ہی کیوں نہ ہو اس سے پرہیز کر لیا جائے۔ رہ گئی بات سگرٹ کی تو تمباکو

تو تھی تو ویسے ہی اسلام میں ناپسندیدہ ہے۔ جو چیزیں اسلام میں ناپسندیدہ یا حرام ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا ہے یہ تو حلال چیزوں کی شکل دے رہا تھا۔

سوال: اگر حق مہر بطور زیورات ادا کیا گیا ہو اور بیوی کا انتقال ہو جائے وہ زیورات شوہر کے قبضے میں ہوں، اُن زیورات کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟

جواب: حق مہر خالصتاً بیوی کا حق ہے۔ اب اُن زیورات کی اصل حقیقت حق مہر کی ہے۔ بیوی کو دیا گیا حق مہر خواہ رقم کی صورت میں ہو یا زیورات کی شکل میں، بیوی کو دیے گئے تمام تحائف اس کے انتقال کے بعد ورثے کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو ورثے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اگر میری ذاتی رائے پوچھیں تو میرا یہ یقین ہے کہ خاوند کا جو کچھ بھی ہے اُس پر اُس کی بیوی کا حق ہے کہ وہ جیسے چاہے اُسے استعمال کرے۔ جس خاتون کو آپ بیوی بنا کر لاتے ہیں اور جس کو درحقیقت آپ نے اپنا Life partner بنایا ہے تو جس طرح اس نے آپ کی تنہائی Share کی ہے اسی طرح آپ کی ہر چیز Share کرنے کا اسے حق ہے۔ اگر شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی کمائی جیسے چاہے استعمال کرے تو بیوی کو بھی یہ حق ہے کہ وہ شوہر کی کمائی اپنی مرضی سے خرچ کر سکتی ہے۔ اگر شوہر اپنی مرضی سے اُسے کوئی جیب خرچ دیتا ہے تو وہ اس بیوی کی ملکیت ہے اور اصولی طور پر شوہر کو نہیں پوچھنا چاہیے کہ بیوی نے وہ رقم کہاں خرچ کی اور کیوں خرچ کی۔ اسی طرح جو تحفہ اسے دیا گیا خواہ وہ کتنی ہی قیمت کا کیوں نہ ہو بیوی چاہے اُسے سمندر میں پھینک دے یا کسی کو اٹھا کر تحفے کو دے دے، اس بارے میں اس سے سوال نہیں کیا جانا چاہیے۔

اگر ایک Life partner قضائے الٰہی سے ساتھ چھوڑ گیا ہے تو میرے نزدیک اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں کا بہترین مصرف یہ ہے کہ ان اشیا کو راہِ خدا میں دے دیا جائے تاکہ یہ اس کے لیے صدقہ جاریہ بن جائیں اور اس کے ثواب میں اضافہ ہوتا رہے کیوں کہ جس خاتون نے ہمارے ساتھ اچھا وقت گزارا ہے، زندگی کے تمام سرد و گرم میں ہمارا ساتھ دیا ہے، اس کا یہ حق بنتا ہے کہ ہم شوہر حضرات اُن کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا کام ضرور کریں جو ان کے انتقال کے بعد ان کے ثواب میں اضافے اور بخشش کا باعث بن جائے۔

میری ذاتی رائے کے مطابق بیوی کے انتقال کے بعد حق مہر کے طور پر اسے دیے گئے زیورات آپ کسی ایسی بچی کو جہیز کے طور پر دے دیں جو مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے والدین کے گھر پر بیٹھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ جہیز اس نیت کے ساتھ اپنی جیب سے اسے بنا کر دے دیجیے کہ اس کا ثواب آپ کی مرحومہ بیوی کی روح کو ملتا رہے۔

سوال: جب کوئی نیک عمل یا وظیفہ شروع کیا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کے ساتھ ہی نفس اور شیطان بھی Activate ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے انسان سستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا تدارک کیسے کیا جائے؟

جواب: مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے خلیفہ نے اس کی بہترین Explanation اپنے شاگردوں کو اس

وقت دی تھی جب اس نے عرض کیا "جناب! میں جب سے اس راہ پر آیا ہوں شیطان مجھے زیادہ ہی زور مارنے لگا ہے۔" آپ نے بہت خوب صورت جواب دیا "پریشان ہونے کے بجائے خوش ہونے کا مقام ہے۔ اگر آج کل شیطان تم پر زیادہ حاوی ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نیکی کی طرف جا رہے ہو۔ کیوں کہ چور اور ڈاکو اس گھر میں آتے ہیں جہاں مال و زر ہوتا ہے۔ کسی مفلس کے گھر چور ڈاکو بھی نہیں جائیں گے۔" ہمارے اندر چونکہ نیکیاں جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں اس لیے شیطان تو زور مارے گا کہ تم نیک راہ کی طرف نہ جاؤ۔ جہاں انسان نیکی کی راہ لگے گا شیطان ضرور آئے گا اور ہر ہر طریقے سے بہکانے کی کوشش کرے گا۔ اس پر میرا Point of view یہ ہے کہ جو چیزیں رب تعالیٰ نے ہماری کوششوں پر چھوڑی ہوئی ہیں وہ ہمیں کوشش ہی سے حل کرنی چاہییں بجائے اس کے کہ ہم ورد اور وظائف کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتے ہوں۔ شیطان سے لڑنا اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذمہ لگا رکھا ہے۔ طریقے بتا دیے ہیں کہ اس طریقے سے شیطان کے ساتھ لڑیں۔ ہمیں اپنے نفس پر خود ہی قابو پانا ہے۔ بس آپ اپنے نفس سے لڑیے۔ شیطان کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیں۔ یہی بہترین طریقہ ہے۔

سوال: جب وظیفے کے 40 دن مکمل ہو جائیں گے اور تعداد کم ہو کر 70 رہ جائے گی تو کیا تب بھی Moral Conditions کو Follow کرنا ہوگا اور کیا کھانے پینے کی پابندی بھی پہلے دن کی طرح قائم رہے گی؟

جواب: کوشش کریں کہ کھانے پینے کی پابندی برقرار رہے۔ ایسی تمام چیزیں جن کو کھانے کے بعد منہ سے Smell آئے ان کو Avoid کیا جانا چاہیے۔ ان سے پرہیز عام حالات میں بھی بہتر ہے کیوں کہ قرآن پاک کے ہر لفظ کے ماتحت فرشتے ہیں اور وہ الفاظ ان فرشتوں کی روحانی غذا بھی ہیں۔ جب ہم کوئی لفظ، کوئی آیت، سورہ یا قرآن کریم کا کوئی حصہ مسلسل پڑھتے ہیں تو جو فرشتے ان الفاظ کے ماتحت ہوتے ہیں وہ ہمارے قریب آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان الفاظ کو بہت ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔

فرشتوں اور ارواح کا معاملہ یہ ہے کہ جس جگہ خوشبو ہو گی وہاں یہ بہت خوشی سے آئیں گے لیکن جہاں Bad smell (ناگوار بو) ہو گی وہاں سے یہ دور بھاگتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ جس کمرے میں عبادت کرتے ہیں وہاں پر خوشبو لگا لیا کریں اور اپنے جسم کو بھی خوشبو ضرور لگا لیا کریں کیوں کہ آپ ﷺ کو خوشبو بہت پسند تھی۔ آپ ﷺ اپنے جسم کو خوشبو لگایا کرتے تھے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو لہسن اور پیاز کھائے وہ ہماری مسجد سے جدا رہے۔"

(صحیح بخاری، احادیث نمبر 817)

اگر ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم والا وظیفہ نہیں پڑھ رہے لیکن چاہتے ہیں کہ ہر وقت رب تعالیٰ کو یاد کریں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ہر وقت باوضو رہیں اور ان تمام چیزوں کو کھانے سے پرہیز کریں جن سے Smell آتی ہے۔ جیسے کچا پیاز، کچا لہسن اور [illegible] بھی Well done نہ ہو۔ ان چیزوں کو کھانے سے نہ صرف منہ بلکہ

ہاتھوں سے بھی Smell آنے لگتی ہے۔ اسی طرح سفید مولی کھانے سے نہ صرف Smell بلکہ ڈکاریں بھی آتی ہیں اور وضو کے فاسد ہونے کے امکانات بھی رہتے ہیں کیوں کہ سفید مولی پیٹ میں گیس پیدا کرتی ہے۔ سرخ رنگ کی گول مولی آپ چاہیں تو استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی طرح پیاز کو نمک لگا کر اچھی طرح دھولیں تو Smell ختم ہو جائے گی۔

اگر ہم رب تعالیٰ کو تھوڑے اہتمام کے ساتھ یاد کر لیں گے تو یقیناً ہم اس کے زیادہ فوائد حاصل کر سکیں گے۔ جس طرح آپ کسی ملک کے صدر سے ملنے جاتے ہیں تو اس سے پہلے کچھ اہتمام اور تیاری کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ تو پھر تمام جہانوں کا حقیقی بادشاہ ہے۔ جب اس کے حضور حاضر ہوں یا اس کا نام پکاریں تو ان امور کا خیال رکھیں۔ صاف لباس پہنیں، لباس پر خوشبو لگا لیں، کمرے میں خوشبو سلگا لیں، منہ سے کسی قسم کی ناگوار بو نہ آ رہی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش کریں کہ ہر وقت باوضو رہیں۔ اس سے ایک اضافی فائدے کے طور پر آپ کو رزق کی تنگی سے بھی نجات مل جائے گی۔

جہاں تک Moral Conditions یا Morality کو Continue رکھنے کا تعلق ہے تو میں واضح کر دوں کہ جب ہم ایسے وظائف پڑھتے ہیں جن میں جلال اور تیزی ہے تو ایسے میں ہمیں Extra care کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مشق یہ کر لیجیے کہ ہمارے منہ سے کبھی بھولے سے بھی کسی کے خلاف کوئی بات نہ نکلے اور نہ ہی دل میں آئے۔ ہماری زبان سے کسی کی غیبت یا عیب بیان نہ ہو۔ ہم کسی کے راز سے پردہ نہ اٹھائیں۔ سنی سنائی باتیں بغیر تصدیق کے آگے نہ پھیلائیں۔ کسی کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے دوسرے انسان کی عزت پر حرف آتا ہو۔

آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کے تمام پہلو ہمارے لیے روشن ستارے ہیں۔ آپ ﷺ کردار کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔ آپ لوگ آپ ﷺ کی تحمل، بردباری اور عفو و درگزر جیسی نمایاں خوبیوں کو اپنا لیجیے۔ اس سے سنت پر بھی عمل ہو جائے گا اور آپ کو ثواب بھی مل جائے گا۔ رب تعالیٰ اپنے بندوں میں ان خوبیوں کو بہت پسند فرماتا ہے۔ ان خوبیوں کو اپنا لینے سے بونس (Bonus) کے طور پر دنیاوی فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

Moral values کی ان پابندیوں کو ہر حال میں Exercise کریں۔ ان کا وظیفے کے ساتھ کوئی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے بنیادی عقائد کے ساتھ ان کا تعلق ضرور ہے۔ اسلام نے ہمیں جو کچھ سکھایا ہے وہ ہمارے بنیادی عقائد ہیں۔ اسلام نے ہمیں Moral values پر سختی سے کاربند رہنے کی ہدایت کی ہے۔ ہر وہ چیز جو اللہ کو ناپسند ہے، ہم اس سے دور رہیں۔ یہ دوری ہمیں رب تعالیٰ کے نزدیک کر دے گی۔

ہم غلط بیانی سے بچنے کی کوشش کریں۔ بعض اوقات ایسی صورت حال درپیش ہوتی ہے کہ ہمارے لیے سچ بتانا ممکن نہیں ہوتا اور جھوٹ بولنے سے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ میں نے تو اس کا ایک درمیانی راستہ نکالا ہے (کیوں کہ نوکری بھی کرنا ہوتی ہے، دفتری معاملات بھی نبھانا ہوتے ہیں، اہتمام

زیادہ Dealings بھی کرنا ہوتی ہیں) کہ میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ یا اس بات کو اڑا کر دوسری بات شروع کر دیتا ہوں۔ یوں دونوں صورتوں میں بچت ہو جاتی ہے۔ کوشش کریں کہ ہم غلط بیانی سے بھی کام نہ لیں۔ جہاں دیکھیں کہ پھنس گئے ہیں وہاں بات کو اڑا دیں۔ کوئی دوسری بات شروع کر دیں۔ سب سے اچھا Step یہ ہے کہ کوئی چھوٹی سی حکایت سنا دیں۔ یوں انشاءاللہ تعالیٰ رب تعالیٰ مدد فرمائے گا اور اس کے فوائد بھی بہت جلد آپ کو ملنے لگیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے وظیفے سے متعلق مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔ Feedback کے طور پر لوگ اس وظیفے سے حاصل ہونے والے اثرات مجھے بتاتے رہتے ہیں۔ ایک خاتون نے ایک ہفتہ یہ وظیفہ کیا۔ پھر وہ میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں "مجھے ایک ہفتے میں ہی الحمدللہ چیزیں نظر آنا شروع ہو گئی ہیں۔ (دراصل ان خاتون کو کشف کی ابتدائی شکل حاصل ہو گئی تھی اور انھوں نے سمجھا کہ وہ بہت اعلیٰ مقام پر چلی گئی ہیں اس لیے اب Gossip کر سکتی ہیں) تو یہ جو آپ نے پابندی لگائی ہے کہ غیبت نہ کریں، Gossip سے Avoid کریں کیا یہ برقرار رہے گی؟"

اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ Gossip شاید ہمارے لیے ہوا سے زیادہ ضروری ہو چکی ہے۔ جب تک ہم کسی کی غیبت نہ کریں ہمیں سکون نہیں ملتا۔ ان خاتون کو وظیفہ کرتے ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا اور وہ Gossip کے لیے بے چین تھیں۔ میری درخواست یہی ہے کہ یہ جو ذرا سا زبان کو ہلانا ہوتا ہے، اس سے پرہیز کر لیا جائے خواہ اس کا تعلق وظیفے کی پابندیوں سے ہو یا نہ ہو۔

عالم روحہ

سوال: کچھ کتابوں میں لکھا ہے کہ رب تعالیٰ کے صفاتی نام تین سو پچاس ہیں لیکن اکثریت کے مطابق یہ ننانوے ہیں۔ رب تعالیٰ کے نام اصل میں کتنے ہیں؟

جواب: رب تعالیٰ کے صفاتی نام (Main attributes) ننانوے ہی ہیں لیکن ان Main attributes میں سے Further derive ہونے کے بعد کچھ صفات کو اکٹھا کر کے ایک فہرست مرتب کی گئی ہے جس کے مطابق کل نام 350 ہیں لیکن Major یا Main attributes ننانوے ہی ہیں۔

جب انسان کی تخلیق کی گئی تو اس کے اندر ان تمام Attributes کا ایک عکس یا ہلکا سا اثر رکھا گیا ماسوائے دو صفات رب اور رحمٰن کے۔ ان Attributes کا پرتو بھی انسان میں موجود نہیں۔ رب تعالیٰ کی ربوبیت کی اساس اس کی رحمانیت ہے۔ اگرچہ باقی تمام صفات بھی اس کی ربوبیت کا حصہ ہیں لیکن ربوبیت کا Major element رحمانیت ہی ہے۔ رب تعالیٰ کی اس صفت کا ہلکا سا رنگ بھی کسی اور میں نہیں پایا جاتا۔

سوال: "روحہ" یا "الروحہ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: عربی میں "ال" لگا کر اسم عام کو اسم خاص بنایا جاتا ہے۔ عربی میں "روحہ" کرن کو کہتے ہیں۔ یہ کرنیں جس مقام پر جا کر ارتکاز کرتی ہیں، وہ مقام "الروحہ" کہلاتا ہے۔ اس مقام پر بالخصوص نور الھدیٰ کی کرنیں جمع ہوتی ہیں۔ یہ کرنیں روشنی کی کرنوں کی طرح نہیں ہوتیں بلکہ یہ Droplets کی صورت میں ہوتی ہیں جیسے ہلکی بارش ہو رہی ہو تو اس کے قطرے گرتے ہیں۔ اس لیے جب بھی کہیں نور کا ذکر ہو تو کہا جاتا ہے کہ نور برستا ہے یا نور کی بارش ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ نور الھدیٰ کی کرنیں Droplets کی صورت میں برستی ہیں اور جہاں یہ کرنیں اکٹھی ہوتی ہیں وہ مقام "الروحہ" کہلاتا ہے۔

سوال: آسمانوں میں مقام حسن کہاں ہے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: مقام حسن تیسرے آسمان پر ایک جگہ ہے۔ مقام عیسیٰ علیہ السلام سے کچھ فاصلے پر حضرت یوسف علیہ السلام کا مقام ہے جو مقام یوسف علیہ السلام کہلاتا ہے۔ چونکہ حسن یوسف بہت مشہور ہے۔ اسی نسبت سے مقام

یوسف علیہ السلام کو "مقام حسن" بھی کہا جاتا ہے۔

سوال: تیسرے آسمان کا کنٹرول کس فرشتے کے پاس ہے؟

جواب: تیسرے آسمان پر جو فرشتے ہیں اُن کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ان کے لیڈر فرشتے کا نام حضرت ہارون علیہ السلام ہے۔ یہ تیسرا آسمان ہی ہے جہاں انسانی روح کو زمین پر روانگی سے پہلے نور کا آخری غسل دیا جاتا ہے۔ اس مقام پر اُسے روحِ متحرکہ (The Moving Soul) کہا جاتا ہے جب کہ اسی روح کو پہلا غسل چھٹے آسمان پر دیا جاتا ہے اور اس مقام پر اُسے The Pious Soul (پاکیزہ روح) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلے غسل کے بعد پاکیزہ روح تیسرے آسمان پر اُتاری جاتی ہے۔ جہاں اُسے اور غسل دے کر روحِ متحرکہ کا نام دیا جاتا ہے اور پھر یہ روح تیسرے آسمان پر اُس وقت تک قیام کرتی ہے جب تک وہ جسم وجود میں نہ آجائے جس میں اُسے داخل کرنا ہوتا ہے۔ جیسے ہی زمین پر وہ جسم وجود میں آتا ہے تو روح کو روانگی کا حکم مل جاتا ہے اور وہ انسانی جسم میں قلب کے عین درمیانی حصے میں گہرائی میں رکھ دی جاتی ہے۔ یہ اس روح کی رہائش گاہ ہے جہاں وہ انسان کے مرتے دم تک رہتی ہے۔

سوال: نور الھدیٰ کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: جب کچھ نہیں تھا تو رب تعالیٰ کی ذات موجود تھی۔ اُس کے فرشتے تھے۔ تب رب تعالیٰ نے چاہا کہ میں ایک ایسی مخلوق تخلیق کروں جس سے خود میری ذات جھلکے۔ تب رب تعالیٰ نے انسانوں کی ارواح تخلیق کیں اور اسی نسبت سے انسان میں اپنی تمام صفات کا ایک ہلکا سا پرتو یا رنگ رکھ دیا سوائے رحمانیت اور ربوبیت کے۔ رب تعالیٰ نے اس مخلوق کی تخلیق کے لیے نور الھدیٰ میں سے دو حصے لیے۔ ایک حصہ نور الھدیٰ المتقین جب کہ دوسرا نور الھدیٰ العالمین کہلایا۔ نور الھدیٰ المتقین سے رب تعالیٰ نے پیغمبروں اور ملائکہ کی ارواح تخلیق کیں۔ آسمانوں اور عرش کو بھی نور الھدیٰ المتقین سے تخلیق کیا گیا۔ نور الھدیٰ المتقین کے قلب (درمیانی حصے) سے آپ ﷺ کی روحِ مبارک کی تخلیق ہوئی ہے جب کہ نور الھدیٰ العالمین سے باقی تمام انسانوں کی ارواح تخلیق کی گئیں۔

سوال: کیا جو سات آسمان اور سات زمینیں ہیں ان میں سے ہر زمین کا علیحدہ Solar system اور Cosmos ہے؟

جواب: آسمان تہ در تہ ہیں۔ پہلے ایک آسمان پھر دوسرا آسمان پھر تیسرا اور اسی ترتیب سے سات آسمان ہیں۔ آپ ﷺ کے ایک فرمان کے مطابق ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا درمیانی فاصلہ 500 سال کی مسافت ہے۔ اسی طرح جب ہم سات زمینیں کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ زمین کے سات Planets ہیں بلکہ اس سے مراد زمین کے سات درجے یا تہیں ہوتا ہے۔ زمین کی جو اندرونی تہ ہے اسے آپ تپش اور ساتویں درجہ کہیے۔ وہاں کا درجہ حرارت کئی ہزار ڈگری سینٹی گریڈ ہونے کی وجہ سے اس جگہ لاوا ابل رہا ہوتا ہے۔ اگر جہنم کی Description کو زمین کی اندرونی تپش اور ساتویں درجے کے ساتھ Link کر

وہیں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ امریکہ جاتے ہوئے سمندر کے اوپر ایک مقام Bermuda Triangle آتا ہے جہاں سمندری جہاز اور ہوائی جہاز دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔ وہاں بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں کو بھی یہ حکم ہے کہ اس مقام سے دور ہٹ کر گزریں۔ اس کے باوجود حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ ہر سال 2,3 جہاز وہاں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ پہلے یہ خیال تھا کہ اس مقام پر شاید سمندری چٹانیں ہیں جن کے ساتھ بحری جہاز ٹکرا کر تہہ میں چلے جاتے ہیں لیکن جب سائنس نے ترقی کی اور سمندر کی تہہ کو کھنگالا جانے لگا تو پتا چلا کہ ڈھانچوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ اگر چٹانوں سے ٹکرا کر جہاز تباہ ہوئے ہوتے تو تلاش کرنے والی ٹیم کو جہازوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا۔ چند سال قبل یہ بات سامنے آئی کہ اس مقام پر سمندر میں بہت بڑی غار ہے جہاں پر ہوا کا Suction بہت زیادہ ہے اور اس Suction کی وجہ سے وہ چیزوں کو کافی فاصلے سے اپنے اندر Suck کر لیتی ہے جس کی وجہ سے ایک Vacuum پیدا ہوتا ہے۔ وہاں نیچے پانی میں High Temperature ہے اور ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھتی ہے جس سے Vacuum کو Fill in کرنے کے لیے ہوا Rush کرتی ہے اور ٹھنڈا پانی بھی ادھر Rush کرتا ہے جس کے نتیجے میں بے پناہ قسم کا Strong suction پیدا ہو رہا ہے۔ اس جگہ کا نام Bermuda Triangle ہے۔ کچھ صاحبان نے قرآن کی کچھ آیات اور سورتوں میں جہاں جہنم کو اندھیرا غار کہا گیا ہے اس کے Reference سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گویا کہ جہنم کا دہانہ اس Bermuda Triangle میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو چیز ادھر کا رخ کرتی ہے پوری قوت کے ساتھ Vacuum میں Suck کر لی جاتی ہے۔ قصہ مختصر سات زمینوں سے مراد زمین کی سات تہیں ہیں۔ Bermuda Triangle پر جس طرح لوگوں نے کھینچ تان کر زمین کی چھٹی اور ساتویں تہہ اور قرآنی آیات کو Fit کرنے کی کوشش کی ہے وہ بعید از قیاس ہے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کی صفت ربانیت انسان میں نہیں ہے تو کیا صمدیت یا بے نیازی کی صفت انسان میں موجود ہے؟

جواب: اللہ کی جتنی بھی صفات ہیں وہ As it is کسی بھی انسان یا غیر اللہ میں نہیں ہو سکتیں۔ ان صفات کا ایک پرتو اور ہلکا سا عکس تو ہے لیکن تمام صفات مکمل طور پر انسان میں نہیں پائی جاتیں۔

اللہ تعالیٰ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی۔ اس کے رحمٰن ہونے کی صفت کسی انسان میں نہیں ہو سکتی۔ رحمٰن وہ ہے جو بغیر دیکھے، بغیر حساب اور بغیر کسی قسم کے امتیاز کے عطا کرے۔ یہ رب تعالیٰ ہی ہے جو ان لوگوں کو بھی عطا فرماتا ہے جو اسے مانتے ہی نہیں، اس کے وجود سے منکر ہیں۔ انہیں بھی دل کھول کر عطا فرماتا ہے جو (معاذ اللہ) اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ ان کا رزق بھی نہیں روکتا۔ انہیں بھی نوازتا ہے جو اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ وہ بے فرمانوں کو بھی عطا کرتا ہے، گناہگاروں کو بھی نوازتا ہے اور جو اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کو بھی دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں دیکھتا کہ کون کیا ہے۔ کیا کرتا

پروا نہیں کرتا۔ وہ بغیر یہ دیکھے کہ مانگنے والا کون ہے بس عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ صفت رب تعالیٰ میں ہی ہو سکتی ہے۔ وہ سب کو بلا تخصیص نوازتا ہے اور جہاں تک بے نیازی کی بات ہے تو قطعی طور پر بے نیازی صرف رب تعالیٰ کی ذات کو سزاوار ہے۔ یہ صفت صرف اور صرف رب تعالیٰ کی ہے کہ وہ بے نیاز اور بے پرواہ ہے کیوں کہ وہ انسان کی فرماں برداری اور نافرمانی سے بے نیاز ہو کر عطا فرماتا ہے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ اللہ نے چاہا کہ وہ پہچانا جائے اس لیے اس نے انسان کو اپنے ادراک کے لیے پیدا کیا۔ جب کہ ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے یہ کائنات تخلیق کی۔ ان دونوں باتوں کو کیسے Connect کیا جائے؟

جواب: پہلے تو جملہ درست کر کے یہ واضح کر دوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے ادراک کے لیے پیدا نہیں کیا۔ اس کو کسی ادراک کی ضرورت نہیں۔ وہ ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ نے چاہا کہ وہ کوئی ایسی تخلیق کرے جس سے وہ پہچانا جائے۔ ان دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔

درحقیقت آپ ﷺ کی روح مبارک حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے تخلیق کی گئی اور آپ ﷺ سب سے پہلی تخلیق ہیں۔ جس طرح کسی آرٹسٹ کو اپنی بنائی گئی پہلی تصویر بہت عزیز ہوتی ہے، کسی مجسمہ ساز کو اپنی زندگی میں بنایا گیا سب سے پہلا مجسمہ بہت عزیز ہوتا ہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کو اس نہج کی اپنی پہلی تخلیق بہت عزیز ہے۔ اتنی عزیز کہ آپ ﷺ کو اپنا محبوب ٹھہرا لیا۔ یہ تو ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نور الھدیٰ المتقین کے قلب سے آپ ﷺ کی روح تخلیق کی۔ اس نور نے پوری کائنات، تمام عالم بلکہ دیگر تمام عالمین کو بھی اپنے احاطے میں لیا ہوا ہے۔ ان تمام عالموں پر یہ نور پھیلا ہوا ہے۔ اس نسبت سے آپ ﷺ رحمۃ للعالمین کہلاتے ہیں۔ تمام کائنات پر یہ نور پھیلا ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو وجہ تخلیق کائنات کہا جاتا ہے۔

سوال: اگر تمام روحوں کو زمین پر روانہ کرنے سے پہلے نور کا غسل دیا جاتا ہے تو اس کے باوجود اتنی بدامنی، برائی اور قتل و غارت کس لیے ہے؟

جواب: ایک انسان ٹیکسٹائل مل میں کپڑا بناتا ہے۔ اسے وہ Bleach کرتا ہے کہ کپڑا بالکل White ہو جائے۔ پھر اسے مختلف کیمیکلز کے ذریعے Mercerise کرتا ہے تاکہ وہ سکڑنے سے محفوظ ہو جائے۔ اس کے بعد اس کی Finishing کرتا ہے تاکہ اس کی سفیدی میں اجلا پن آ جائے۔ پھر اس کو تھانوں میں لپیٹ کر مارکیٹ میں دے دیتا ہے۔ جب آپ دکان سے وہ کپڑا لے کر آتے ہیں، اس کو سلوانے کے بعد پہن لیتے ہیں۔ اگر کوئی بے پرواہ آدمی اس کو پہنے گا تو تھوڑی دیر بعد اس پر یا تو پین کی سیاہی یا سالن کا داغ لگا بیٹھے گا یا کچھ رنگ لگ جائے گا۔ اب اس میں Textile Mill کے مالک کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے تو آپ کو وہ کپڑا انتہائی اجلا فراہم کیا تھا۔ اس پر داغ دھبے تو ہماری اپنی بے پرواہیوں کے نتیجے میں لگے۔

رب تعالیٰ نے جب روح کو تخلیق کیا تب تمام ارواح کو اپنی اصل یعنی نیک حالت میں پیدا کیا۔ وہ ایک

صاف سلیٹ ہے اس پر جو چاہیں لکھ دیں۔ یہ ہمارا کمال ہے کہ ہم اس پر کیا لکھ رہے ہیں۔ اگر ہم نے اس پر جرائم کی کہانی لکھ دی تو اس کے لیے سزا دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی۔ اگر ہم نے اس پر نیک روداد لکھ دی تو اس کا انعام یہاں بھی ہے اور آخرت میں بھی۔

سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ جو عذاب ہوگا اور جو سزا و جزا ہے وہ جسم کو ملے گی۔

جواب: میں نے گزارش کی تھی کہ جسم کو ملتا ہے۔ ہم اگر ذرا سا بھی بات کو اس کے اصل Context سے ہٹا دیں گے تو مفہوم بدل جائے گا۔ آپ کا سوال تھا کہ عذاب قبر جسم کو ملے گا یا روح کو؟ اس وقت میرا جواب تھا کہ قبر میں جسم پیسا جاتا ہے۔ اب آپ نے جو سوال فرمایا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی یہ جانتا ہے اور خود رب تعالیٰ نے بھی فرما دیا کہ تم دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے۔ دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ روح کو بقا ہے۔ ایک زندہ چیز کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاتا۔ دوبارہ اسی کو زندہ کیا جاتا ہے جو مردہ ہو چکا ہو۔ جب انسان روزِ محشر اکٹھے حاضر کیے جائیں گے وہ جسم حالت میں ہوں گے اور سزا اور جزا کے بعد جہاں بھی روانہ کیا گیا (جنت یا دوزخ) وہاں بھی جسم ہی کی حالت میں ہوں گے۔

جب کوئی ہمیں چاقو یا چھری سے مارتا یا زخم لگاتا ہے، اس وقت تکلیف روحانی نہیں بلکہ جسمانی ہوتی ہے۔ جب کوئی ہمیں Humiliate کرتا ہے تب ہمیں روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ اگر بچے کو چپ دی جائے اور انتہائی شدید درجہ حرارت میں رکھا جائے تو وہ جسمانی تکلیف ہوگی۔ روح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ رب تعالیٰ کے احکامات میں Humiliation کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ انسان کو Humiliate کیا جائے گا۔ وہاں بار بار عذاب کا ذکر ہے۔ اسی طرح جزا اور انعامات بھی مادی جسم کے لیے ہیں۔ سزا و جزا جسم کی حالت میں ہے۔ ویسے بھی انسان دو چیزوں یعنی روح اور جسم کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ اگر جسم موجود نہ ہو تو روح ضرور موجود ہوگی مگر دکھائی نہیں دے گی۔ اس سے ہماری کوئی Communication یا Social meeting نہیں ہوتی ہے اور اگر روح نہ ہو تو جسم ہمارے لیے بے کار اور مردہ ہے۔ اس کے لیے حکم ہے کہ جلد از جلد دفنا دیا جائے۔ دوبارہ واضح کر دوں کہ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے اور اسے عذاب جسم حالت میں دیا جائے گا۔

سوال: جس طرح مختلف آسمانوں پر مختلف پیغمبر اور ملائکہ ہیں، کیا اسی طرح زمین کی پرتوں (بالخصوص چھٹی اور ساتویں پرت) میں بھی مخلوق ہے؟

جواب: کچھ چیزیں پردے کی ہیں۔ ان کا تعلق اسرار سے ہے۔ علم تو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اسرار نہیں کھولے جا سکتے۔ جیسے پہلے آسمان کے Entrance پر دریائے توحید بہتا ہے۔ جب ہم دریائے توحید سے گزر کر اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں تو آگے ایک سواری ملتی ہے جس پر بیٹھ کر پھر آگے کی سیر کی جاتی ہے۔ اس مقام کے فوراً بعد ایک پردہ ہے۔ اس پردے کے پار پھر ایک پہاڑی ہے۔ اب یہ جو پردہ ڈال دیا گیا وہاں وہ

اسی لیے ہے کہ بات کو یہیں پر ختم کر دیا جائے۔ بہت سے سوالات ایسے آئیں گے جہاں پر آ کر معذرت کرنی پڑے گی کہ صاحب یہ میں بیان نہیں کر سکوں گا کیوں کہ اس کا تعلق علم نہیں بلکہ اسرار سے ہے اور اسرار بیان نہیں کیے جا سکتے۔ البتہ اتنا ضرور عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے علاوہ اور بھی مخلوق موجود ہے۔

سوال: Infinity کو کیسے Define کیا جا سکتا ہے؟ اسلامک سمٹ مینار کے پیچھے کیا Concept پوشیدہ ہے؟

جواب: Infinite اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیوں کہ وہ Define نہیں ہو سکتی۔ Infinity کبھی Define نہیں ہو سکتی اور جو Define ہو جائے وہ Infinite نہیں۔

ابھی دو روز قبل کراچی کے ایک Leading architect میرے ساتھ آفس میں بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ مختلف Designs پر بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا "صاحب! یہ Islamic Summit Minaret ہے وہ تو ایک لایعنی سا Monument ہے۔ ایک Needle سی کھڑی ہے۔ صرف ایک نشان ہے۔" میں نے ان سے گزارش کی "صاحب یہ لایعنی نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ایک پورا Concept ہے۔ اگر آپ اس کے ڈیزائن کو غور سے دیکھیں تو اس کے چاروں اطراف میں Square میں ایک ڈیزائن ہے اور ان چاروں اطراف میں پانچ پانچ Slopes بنی ہوئی ہیں جو باہر سے دیکھنے میں 90 ڈگری پر ہیں۔ یہ Gradually sharp نہیں ہیں بلکہ Steps میں 45 ڈگری پر ہیں اور چاروں کونوں سے اندر کی طرف راستے گئے ہیں اور چاروں طرف برآمدے ہیں جو کہ Marble کے بنے ہیں۔ Grassy plots میں فوارے چل رہے ہیں اور درمیان میں وہ Monument کھڑا ہے اور Top پر یہ 4 مربع فٹ ہے۔ اس کی لمبائی 165 فٹ ہے۔ ایک ترک ماہرِ تعمیرات نے اسے Design کیا ہے۔

چاروں اطراف کی پانچ پانچ Inversed slopes پانچ ارکانِ اسلام کو ظاہر کرتی ہیں۔ باہر سے 90 ڈگری پر موجود ان دیواروں پر چڑھنا بظاہر دشوار دکھائی دیتا ہے۔ Designer کا کہنا ہے کہ اسلام بظاہر ایسی ہی مشکل دکھائی دیتا ہے لیکن اندر کی 45 ڈگری کی Gradual slopes یہ ظاہر کرتی ہیں کہ درحقیقت اسلام پر عمل کرنا نہایت آسان ہے۔ اگر آپ اسلام کے پانچوں ارکان پر عمل کرتے ہیں اور ان میں ڈوب جاتے ہیں پھر آپ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اس ڈیزائن کے چار اطراف خلفائے راشدین کو Depict کرتے ہیں یعنی اگر ہم حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نقشِ قدم پر چلیں تو ہم بہت سچے اور پکے مسلمان ہو جائیں گے اور جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ ماربل کے برآمدوں میں بنے باغ، فوارے اور Grassy plots جنت کو Depict کرتے ہیں۔

درمیان میں جو 165 فٹ بلند Monument کھڑا ہے وہ رب تعالیٰ کی Infinity کو ظاہر کرتا ہے۔ چار مربع فٹ چوڑے اس یادگاری مینار پر چاروں اطراف میں بلندی کی جانب بالکل سیدھی لائنیں کھینچی ہیں جو کہ Parallel اوپر کو جا رہی ہیں۔ آپ ان لائنوں کو کتنی ہی دور اوپر لے جائیں وہ مل نہیں سکتیں۔ وہ

Infinity ہے جو درحقیقت رب تعالیٰ کی صفت ہے۔ جس کو اس ڈیزائنر نے علامتی طور پر بیان کیا ہے۔ اس اسلامی ہشت پہلو ستارے کے ڈیزائن کے پیچھے گویا پورے اسلام کا ایک تصور موجود ہے۔"

سوال: عالم روح میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی Manifestation ہے جو اس دنیا میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کیا ہم اپنے اس دنیا کے عمل کو عالم روح سے Attach کر سکتے ہیں؟

جواب: اگر اس دنیا میں ہونے والے واقعات عالم روح میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی وجہ بنتے تو ہم وہاں کے معاملات کو یہاں کے معاملات کے ذریعے Influence کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہاں کے معاملات کے نتیجے میں یہاں کے معاملات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کیوں کہ نیچے والے برتن سے پانی اوپر والے برتن میں نہیں جا سکتا۔ البتہ اوپر والے برتن کا پانی نیچے والے برتن کے پانی کے Quantity, Flow اور Colour کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس دنیا کو نیچے والا برتن سمجھ لیں۔ اُس جہان سے اس دنیا میں Influence آ رہا ہے۔ یہاں سے اُس جہان کے معاملات کو Influence نہیں کیا جا سکتا۔

راہِ فقیر

جب ایک انسان کلمہ پڑھتا ہے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ جب وہ رب تعالیٰ کے احکامات پر عمل درآمد شروع کرتا ہے تو مسلمان سے مومن تک کا سفر طے ہوتا ہے۔ جب وہ پرہیزگاری اور زہد اختیار کر لیتا ہے تو وہ زاہد اور پرہیزگار ہو جاتا ہے۔ جب وہ زہد سے آگے کا سفر طے کرنا چاہتا ہے تو وہاں وہ رب تعالیٰ کا چاہنے والا بنتا ہے اور جہاں وہ رب تعالیٰ کو اپنا محبوب بناتا ہے وہاں عشق کے امتحان شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ دعویٰ کہ مجھے رب تعالیٰ سے عشق ہے، مجھے رب چاہیے، اُسے اس مقام پر لے جاتا ہے جہاں وہ زاہد سے فقیر بن جاتا ہے۔ یوں فقیری کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اس سفر میں مختلف مشکلات بھی آتی ہیں اور کچھ پابندیاں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ایک پابندی یہ بھی ہوتی ہے کہ فقیر مخلوق سے قطع تعلق کرے اور اس سے دور رہے کیوں کہ خلقِ خدا انسان کو بسا اوقات منزل سے بہت دور لے جاتی ہے۔

انسان کو فقر کی راہ میں بہت سی ریاضتیں اور مجاہدے کرنا ہوتے ہیں۔ اس سفر میں وہ اپنے نفس کی نفی کرتا ہے۔ نفس کی تمناؤں اور دل میں پیدا ہونے والی تمام خواہشات کے برعکس عمل کرتا ہے۔ وہ کثرت سے روزے رکھتا ہے کیوں کہ پیٹ جتنا بھرا ہو نفس اتنا ہی سرکش ہو جاتا ہے اور پیٹ خالی ہو تو نفس کمزور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ فقر روزے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اگر آپ فقر کا راستہ آسان کرنا چاہتے ہیں تو دو کام کیجیے:

1- روزہ رکھیے۔ اس سے نفس کمزور ہو جائے گا اور آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔

2- خلقِ خدا سے ناتا توڑ لیجیے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ ترکِ دنیا خلافِ سنت ہے اور فقیری میں کسی بھی خلافِ سنت عمل کی ممانعت ہے کیوں کہ سچا فقیر وہی ہے جو ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے میں دنیا لے کر چلے اور ان میں توازن رکھے۔ سوال یہ ہے کہ جب دنیا کو ساتھ لے کر چلنا ہے تو خلقِ خدا سے دور رہ کر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ فقر کی راہ میں ترکِ دنیا اور مخلوق سے دور رہنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ترکِ کاروبارِ حیات کیا جائے کیونکہ فقیر کی تو خوب صورتی ہی یہ ہے کہ جب وہ دنیا کے کام کر رہا ہوگا تو بڑے بڑے لوگوں کے کان کتر رہا ہوگا اور جب وہ دین کے کام کر رہا ہوگا تو اس سے بہتر دین دار آپ کو نہیں ملے گا۔ ترکِ مخلوق سے میرا مقصد یہ تھا کہ دوستیاں اور تعلقات نہ پالیے تاکہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو۔ جو وقت آپ نے ان کے ساتھ گپ شپ میں گزارنا ہے وہ تنہائی میں بیٹھ کر غور و فکر میں گزار دیجیے۔

غور و فکر فقر کی جان ہے۔ جو فقیر غور و فکر نہیں کرتا وہ فقر کے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے فقیر مخلوقِ خدا سے دور رہتا ہے اور روزے رکھتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے آنے والی ہر چیز خواہ وہ دکھ اور تکلیف ہی کیوں نہ ہو، اسے خوشی خوشی تسلیم کرتا ہے۔ ان تمام مصیبتوں، مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد وہ مقام آتا ہے جہاں اس کے قلب کی صفائی کر دی جاتی ہے۔ جونہی وہ مقام آتا ہے وہ فقیر سے ترقی پا کر صوفی کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ آسان لفظوں میں کہہ لیجیے کہ جونہی وہ صوفی کے مقام پر پہنچتا ہے تو رب تعالیٰ کی طرف سے اس پر سے مشقتیں، مجاہدے، ریاضتیں اور دشواریاں ہٹا دی جاتی ہیں۔ اس مقام پر وہ عبادات میں اگر محض فرائض اور سنت ہی ادا کرتا چلا جائے تو یہ سفر وہ طے کرتا چلا جائے گا۔ اس مقام پر وہ خلقِ خدا سے گھل مل جاتا ہے۔ جب وہ ایک عام آدمی کو خلقِ خدا سے گھلا ملا نظر آتا ہے تب بھی درحقیقت اس کا دل مخلوقِ خدا سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس وقت بھی اس کا دل اللہ کی یاد میں مصروف ہوتا ہے۔ اس لیے اسے سارا وقت مخلوقِ خدا کے ساتھ بیٹھ کر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس وقت خلقِ خدا کے ساتھ بیٹھ کر وہ ایک بہت بڑی سنت ادا کر رہا ہوتا ہے۔

چونکہ نبوت آپ ﷺ پر ختم ہو گئی اس لیے اب دین کو اللہ کے بندوں تک پہنچانا علما اور اہلِ فقر کا فریضہ ہے۔ صوفی جب لوگوں کے پاس بیٹھتا ہے اور رب تعالیٰ کی باتیں کرتا ہے تو اس کی زبان کی تاثیر اور اس کے جسم سے نکلنے والی Vibrations ان لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور لوگ نیکی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ فقیر اور صوفی میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ فقیر لذتِ دہن سے دور ہوتا ہے۔ اللہ کی نعمتیں دستیاب ہونے کے باوجود نفس کے خوف سے ان نعمتوں کا استعمال کم کرتا ہے۔ لیکن صوفی کے مقام پر وہ اللہ کی عطا کردہ تمام نعمتوں کو بے دھڑک استعمال کرتا ہے اور رب کا شکر ادا کرتا ہے۔

صوفی فقر کے راستے پر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں عرض کر دوں کہ سب فقر کے راستے کے راہی اور مسافر ہیں۔ منزل پر کوئی نہیں پہنچا سوائے آپ ﷺ کے۔ صوفی اس راہ پر چلتا جاتا ہے اور منزل کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے رب تعالیٰ اسے اپنے سے قریب کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مقام آتا ہے جہاں صوفی ہی ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر اسے عقل، حکمت اور فراست عطا کی جاتی ہے۔ وہ اس عقل، حکمت اور فراست سے خلقِ خدا کو راستہ دکھانے لگتا ہے۔ وہ صرف دینی بلکہ دنیاوی معاملات میں بھی ان کی راہنمائی کرنے لگتا ہے۔

ایک چیز یاد رکھنے کی ہے۔ فقیر بس دیتا ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔

راہروں کے لیے برگد کے درخت کی مانند ہوتا ہے جہاں دوست دشمن، اپنے پرائے سب دھوپ اور بارش میں پناہ لیتے ہیں۔ جس طرح درخت سایہ فراہم کرتے وقت یہ پروا نہیں کرتا کہ اس کے نیچے پناہ لینے والے لوگ اس کی جڑیں کاٹنے والے ہیں، اس پر کلہاڑا چلانے والے ہیں یا اس کی جڑوں کو پانی دینے والے اور کھاد ڈالنے والے ہیں۔ پیر بھی ایک سایہ دار گھنے درخت کی طرح ہوتا ہے۔ جس کے پاس خلقِ خدا مسائل، مصائب اور بے سکونی سے چھٹکارے کے لیے پناہ لیتی ہے۔ سب کو پیر سے مل کر بہت سکون ملتا ہے اور انہیں اپنے مسائل کا حل سوجھنے لگتا ہے۔

درحقیقت پیر وہ فقیر ہے جس سے خلقِ خدا کو فائدہ ملنے لگتا ہے۔ پیر کی بالکل صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ فقیر جو پھل دار درخت کی طرح پھل دینے لگے، وہ پیر ہے۔

فقیر سے پیر تک کا سفر بہت صبر آزما اور دشوار ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس سفر کا آغاز تو کرتے ہیں لیکن ذرا سی تکلیف اور پریشانی پر بددل ہو کر دور بھاگنے لگتے ہیں یا پھر ننھے بچے کی طرح پوچھتے پھرتے ہیں کہ ابھی کتنی منزلیں باقی ہیں؟ ابھی مزید کتنا وقت دشواری میں گزرے گا؟ جس طرح ایک چھوٹا سا بچہ اگر روزہ رکھ لے تو ہر چند منٹ بعد وہ پوچھتا ہے ”افطار میں ابھی کتنا وقت باقی ہے؟“

اسی طرح اس راہِ فقر میں بھی لوگ گھبرا کر پوچھتے ہیں کہ ابھی اور کتنا وقت باقی ہے؟ اس سوال کا جواب بہت سادہ ہے۔ دشواریاں اس وقت تک جاری رہتی ہیں جب تک انسان کی چیخیں آسمان تک نہ جانے لگیں۔ لیکن یہ خاموش چیخیں ہوتی ہیں، صبر کے قہقہے ہی دراصل یہ خاموش چیخیں ہیں جو آسمان کو چھوتے ہیں تو پھر راستے آسان کر دیے جاتے ہیں۔

رب تعالیٰ عالم الغیب ہے، ہمارا خالق ہے، وہ جانتا ہے کہ کسی شخص کی کتنی برداشت ہے اس لیے انسان کو ہمیشہ یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ رب کبھی بھی اپنے بندے کو اس کی برداشت سے بڑھ کر نہیں آزماتا۔ وہ ہمیں وہیں تک آزمائے گا جہاں تک ہم برداشت کر سکیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم ٹوٹنے لگیں، وہ ہم پر آسانیاں کر دیتا ہے۔

سوال: فقیر، صوفی یا پیر..... روحانیت کے کس درجے پر پہنچ کر انسان زمان و مکاں سے Beyond ہو جاتا ہے؟

جواب: Time and Space سے Beyond ہو جانا خالصتاً رحمتِ خداوندی ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر تصوف کا راستہ طے کرتے رہتے ہیں لیکن صاحبِ کشف نہیں ہو پاتے جب کہ کچھ لوگ سفر کے آغاز ہی میں صاحبِ کشف ہو جاتے ہیں۔

زمان و مکاں سے ماورا ہونے کا تعلق کسی کے مقام، روحانی ترقی یا اس معیار سے نہیں کہ اس کے پاس علم یا تصوف کا کتنا ذخیرہ ہوگا تو وہ صاحبِ کشف و کرامات ہو جائے گا۔ یہ محض رب تعالیٰ کی رحمت اور عطا ہے لہٰذا یہ کہنا دشوار ہے کہ کوئی شخص فقیر کے مقام پر صاحبِ کشف ہوگا یا صوفی یا پیر کے مقام پر وہ Time and

Space سے Beyond ہو جائے گا۔ یہ تو خالصتاً رحمتِ خداوندی ہے جو کسی بھی وقت نازل ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے بھولے سے انسان سے کوئی ایسی نیکی ہو جائے جو رب تعالیٰ کو اتنا زیادہ خوش کر دے کہ رب تعالیٰ اپنے اُس بندے کو صاحبِ کشف و کرامات کر دے۔

ہم کشف و کرامات سے بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی صاحبِ نظر، صاحبِ علم یا فقیر کے لیے کشف و کرامات کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یاد رکھیے ! کرامات دکھائی نہیں جاتیں بلکہ یہ سرزد ہوتی ہیں۔ جب ایک فقیر سے مختلف کرامات سرزد ہونے لگتی ہیں تو وہ انھیں ایک شعبدہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اسی طرح ابتدا میں کشف میں اولیاء اللہ سے ملاقاتیں ہوتی ہیں تو انسان کے دل میں پیغمبروں سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جب اُن سے ملاقات ہو جاتی ہے تو پھر فقیر اللہ اور آپ ﷺ کے دیدار کی خواہش اور تمنا کو دل میں بسا لیتا ہے۔ جب یہ تمنا اور آرزو دل میں رچ بس جاتی ہے تو وہ کشف و کرامات کو حقیر جانے لگتا ہے۔ پھر وہ اپنے دوست اپنے رب کے دیدار کے لیے تڑپنے لگتا ہے۔ اُسے بس ایک ہی تڑپ اور ایک ہی لگن ہوتی ہے کہ میری ملاقات میرے رب سے کب ہوگی۔

سوال: کیا اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد روحانی مدارج میں اضافہ ممکن ہے؟

جواب: ظاہری و دنیاوی اعمال کا سلسلہ انسان کے انتقال کے ساتھ ہی منقطع ہو جاتا ہے۔ وفات کے بعد کوئی بھی انسان اپنے نامۂ اعمال میں اضافے پر قادر نہیں رہتا۔ البتہ پسماندگان یا کوئی بھی شخص قرآن خوانی یا کسی بھی نیک عمل کی صورت اُس مرحوم کی روح کو جب ایصالِ ثواب کرتے ہیں تو اس سے مرحوم کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر انتقال کر جانے والے شخص نے اپنی زندگی میں کوئی کنواں کھدوایا تھا، کسی کو علم سکھایا تھا، قرآن پاک کی تعلیم دی تھی یا کوئی بھی صدقہ جاریہ والا کام کیا تھا تو اس سے اُس کو فائدہ ملتا رہتا ہے اور اُس کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جس سے اُس کے درجات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اُس کی روحانی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

سوال: یومِ آخرت ہر چیز کا حساب ہوگا۔ کیا کشف و کرامات کا بھی حساب ہوگا؟

جواب: فقر کی راہ میں بہت جلد پکڑ ہوتی ہے۔ ایک عام آدمی اپنی غلطیوں پر بچا رہتا ہے اور اللہ اُس کی خطاؤں کو بآسانی نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ لیکن فقیر چونکہ رب کے دوست ہیں اس لیے رب تعالیٰ اپنے دوست کو غلط راہ پر برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ اُس کا دوست غلط راہ پر چڑھ جائے رب اُسے فوراً کھینچ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیروں کو چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی مار پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ در اصل یہ رب مار نہیں رہا ہوتا بلکہ انھیں جھنجھوڑ رہا ہوتا ہے تا کہ وہ غلط راستے کی طرف جانے سے بچ جائیں۔

تقویٰ کی پانچ گھاٹیاں

سوال: راہِ سلوک میں غور و خوض کس انداز میں اور کن Subjects پر کرنا چاہیے؟

جواب: غور و فکر کے لیے کسی مخصوص انداز میں بیٹھنا ضروری نہیں ہے۔ یہ تو ایک مسلسل عمل ہے۔ غور و فکر کے لیے ضروری ہے کہ خلقِ خدا سے کم سے کم رابطہ رکھا جائے۔

جب کوئی زاہد فقر کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ مختلف کیفیات سے گزرتا ہے جس میں ایک کیفیت خلقِ خدا سے دُور رہنا بھی ہے۔ وہ خلقِ خدا سے صرف اتنی گفتگو کرتا اور اتنا تعلق رکھتا ہے جو ناگزیر ہو۔ باقی سارا وقت وہ غور و فکر میں مستغرق رہتا ہے۔ چونکہ فقیر تمام وقت رب کی طرف رجوع رکھتا ہے اس لیے اُس کے ذہن میں جنم لینے والے خیالات بھی رب تعالیٰ، روحانیت، قرآن پاک، اسلام، شریعت، تصوف سے ہی متعلق ہوتے ہیں۔ جوں جوں انسان اپنے ذہن میں آنے والے ان خیالات پر غور و فکر کرتا ہے، اُس کے ذہن میں نئے نئے نکتے آنے لگتے ہیں۔

جہاں تک Subject کا تعلق ہے فقیر کے ذہن میں ہمہ وقت صرف رب ہی رہتا ہے۔ یوں لامحالہ ایک ہی Subject اُس کے ذہن میں رہے گا۔ اُسی ہستی کی طرف وہ رجوع رکھے گا، اُسی کے متعلق چیزوں کی کرید کرے گا اور اُسی پر غور و فکر کرے گا۔ یوں اُسے مختلف چیزوں کی سمجھ آنے لگے گی۔

راہِ سلوک میں جب تک کوئی شخص تقویٰ اختیار نہیں کرتا اُس کے تمام مجاہدے، ریاضتیں، مشقتیں رائگاں جاتی ہیں۔ وہ کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔

تقویٰ کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

"ہر وقت خدا کی طرف رجوع رکھنا ہی تقویٰ ہے۔"

ایک ولی اللہ فرماتے ہیں:

"تمام ممنوعات سے بچے رہنا اور حکم کردہ کاموں کی پابندی کرنا تقویٰ ہے۔"

حضرت بایزید بسطامی ؒ فرماتے ہیں:

"غیر اللہ سے منہ پھیر لینے کا نام تقویٰ ہے۔"

ابن حبیب ؒ نے فرمایا:

"جو کچھ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں موجود رہنا اور جو کچھ کرنے سے منع کیا گیا ہے وہاں سے غیر حاضر رہنا تقویٰ ہے۔"

ایک اور ولی اللہ فرماتے ہیں:

"اپنے نفس کی مخالفت کا نام تقویٰ ہے۔"

ہر ولی اللہ نے تقویٰ کو اپنے مقام اور رُوحانی کیفیت کے مطابق بیان کیا۔ اُن کے مقامات اور رُوحانی کیفیات کے پیچھے بے تحاشا مجاہدے، ریاضتیں اور عبادات تھیں۔ یہ سب لوگ اپنے مقام سے بات کرتے ہیں۔

ہم جیسے لوگ جو تصوف کے اسکول میں ابھی داخل بھی نہیں ہوئے یہ تمام Definitions شاید ہمارے سر کے اُوپر سے گزر جائیں۔ ایک بار میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن پاک کی مختلف تفاسیر پڑھ کر انسان مشکل میں پڑ جائے گا کیوں کہ پیران پیر حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے قرآن پاک کی جو تفسیر بیان کی ہے وہ وراء مفہوم لیے ہوئے ہے۔ وہ رُوحانیت کے اُس بلند مقام پر ہیں کہ قرآن پاک کو اپنی رُوح کی بالیدگی کے مطابق گہرائی سے دیکھتے ہیں۔ جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی طرح حضرت داتا گنج بخش ؒ نے قرآن پاک کی تفسیر اپنے مقام اور مرتبے کے مطابق کی۔

ہم اکثر ایک غلطی کر جاتے ہیں۔ ہم کسی کتاب میں پڑھتے ہیں کہ حضرت غوث اعظم ؒ فلاں وظیفہ کیا کرتے تھے اور انھوں نے اُس سے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہ پڑھ کر ہم بھی بلا سوچے سمجھے وہ وظیفہ کرنا شروع کر دیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا کبھی ہم جان پائیں گے کہ انھوں نے وہ وظیفہ رُوحانیت کے کس مقام پر پہنچنے کے بعد شروع کیا تھا۔ اگر انھوں نے قطب کے مقام پر پہنچنے کے بعد وہ وظیفہ شروع کیا تو کیا ہمیں معلوم ہے کہ اس مقام پر رُوح کی بالیدگی اور طاقت کا کیا درجہ ہوتا ہے۔ یہ سب تفصیلات جانے بغیر اگر ہم وظیفہ پڑھنا شروع کر دیں گے تو سوائے پریشانیوں کے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہاں! اگر ہم اپنے آپ کو رُوحانیت کے اُس مقام پر لے جائیں اور تب وہ وظیفہ پڑھنا شروع کریں تو اس سے یقیناً ہم مطلوبہ فوائد حاصل کر لیں گے۔

اسی طرح تقویٰ کی Definition ہر ولی اللہ نے اپنے مقام اور مرتبے کے مطابق کی۔ ایک اہل مکتب کے لیے تقویٰ کی یہی تعریف کافی ہے کہ "آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید تقویٰ ہے۔"

اب سوال یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیسے کیا جائے؟

تقویٰ کی راہ میں دو چیزیں شدت سے حائل ہوں گی۔ ایک ہماری "انا" اور دوسرا ہمارا "نفس"۔

کوئی شخص تقویٰ اختیار نہیں کر سکتا جب تک وہ اس راہ کی پانچ گھاٹیاں پار نہ کر لے۔ وہ پانچ گھاٹیاں یہ ہیں:

1۔ نفس کی خواہشات کے خلاف چلے۔

2۔ انسان کو گزر بسر کرنے کے لائق رزق حاصل ہو جائے تو اس سے زیادہ کی تگ و دو میں نہ پڑے۔

3۔ انسان ذلت کو عزت پر ترجیح دے۔

یہ ایسا نکتہ ہے جو شاید پڑھے لکھے لوگوں کے حلق سے آسانی سے نیچے نہ اترے۔ سب سے زیادہ اسی مقام پر انسان کے اندر سے Resistance آتی ہے۔

ایک صاحب نے آ کر شکوہ کیا کہ ایک شخص نے مجھے سر راہ لوگوں کی موجودگی میں بے عزت کر دیا۔ "شاہ صاحب! کیا وہ سمجھتا ہے کہ میری کوئی عزت ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔

"بھائی فقیر کی تو کوئی عزت ہے ہی نہیں ـــــ جب عزت ہی نہیں تو پھر بے عزتی کیا ہوگی۔"

اس پر وہ صاحب بولے "شاہ صاحب! آپ کا مطلب ہے کہ ہماری کوئی عزت ہی نہیں......" یہ جملہ کہہ کر جب انھوں نے Indirectly خود کو فقیروں کی صف میں شامل کر لیا تو مجھے کسی قسم کی حکمت آمیز گفتگو کی ضرورت نہ رہی۔ میں نے سیدھے سبھاؤ کہا "ہاں فقیروں کی بھلا کیا عزت!" وہ قدرے تلخی سے یہ کہہ کر چل دیے "Thank you very much آج آپ نے مجھے میری اوقات بتا دی۔"

بعد ازاں مختلف ذرائع سے مجھے پتا چلتا رہا کہ وہ میرے اس جملے پر کہ "فقیر کی کوئی عزت نہیں ہوتی" خاصے برہم ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ علم کا ایک جملہ انھیں کیوں کر ناگوار گزرا۔ ڈیڑھ سال بعد وہ صاحب دوبارہ میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے "شاہ صاحب! I am Sorry! تب میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔ اب سمجھ آئی ہے کہ آپ نے تو بالکل سچی بات کی تھی۔" میں نے کہا "بعض اوقات کچھ نکتے وقت گزرنے کے ساتھ Clear ہوتے ہیں۔ دراصل اُس وقت میرے پاس اپنی بات کی Support کے لیے قرآنی آیت تھی کہ سب عزتیں اللہ ہی کے لیے ہیں لہٰذا جب سب عزتیں اللہ ہی کے لیے ہیں، وہ جس کو چاہے عزت عطا کر دے۔ وہ عزت ہماری ملکیت نہیں بلکہ عطا ہے اور یاد رکھیے! عطا پر Claim نہیں کرتے۔"

تقویٰ کی چڑھائی طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ذلت کو عزت پر ترجیح دے۔ جب ہمیں یہ یقین آ جاتا ہے کہ ہماری کوئی عزت نہیں ہے، سب عزتیں اللہ ہی کے لیے ہیں اور وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے صدقے میں عزت عطا فرماتا ہے۔ یہ باریک نکتہ سمجھ میں آ جانے کے بعد تقویٰ اختیار کرنے میں

آسانی ہو جاتی ہے۔

4۔ تقویٰ کی چوتھی گھاٹی یہ ہے کہ انسان خلق خدا کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے۔ جو بھی انسان غیر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو وہ اللہ کے در سے منہ موڑ لیتا ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ فقیر کو دست سوال دراز کرنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ وہ خود اپنی ذاتی ضروریات کے لیے لوگوں کے سامنے سوال نہیں کر سکتا۔

5۔ جو کچھ عطا ہو جائے اُس کو کافی جانے۔

آج کل یہ جو ہم مختلف عاملین اور صاحبانِ دُعا کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم موجود اور عطا شدہ نعمتوں کو کافی نہیں جانتے۔

ایک اور اہل علم نے تقویٰ کی تعریف یوں کی تھی

''مصیبتوں کو ہنسی خوشی سہہ جانے کا نام تقویٰ ہے۔''

یہاں تو پھر عطا شدہ کو کافی جاننے کا ذکر ہے۔ جو مصیبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنے سے قدرے آسان عمل ہے۔

آپ راہِ سلوک پر چلنے کے خواہش مند ہیں تو ذہن نشین کر لیجیے کہ تصوف اور رُوحانیت کا حصول تقویٰ اختیار کیے بغیر ممکن نہیں اور تقویٰ کا حصول ان پانچ گھاٹیوں کو طے کیے بغیر ممکن نہیں۔

رُوحانیت میں مشاہدہ

سوال: رُوحانیت میں مشاہدہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: رُوحانیت میں مشاہدہ سے مراد وہی ہے جو دُنیاوی معاملات میں ہم لیتے ہیں۔ آپ سڑک پر چلتے جا رہے ہیں تو اُسی سڑک کے اطراف کے تمام مناظر، Grand Features اور دور نظر آنے والی آبادی سب آپ کی نظر میں ہوتے ہیں۔ اگر آپ کبھی اُس روڈ پر دوبارہ سفر کرنے کا ارادہ کریں تو آپ کے ذہن میں ہوتا ہے کہ اُس سڑک کے حالات کیا ہیں۔ اُس پر کتنے Restaurants اور کتنے Motels ہیں۔ اطراف میں بسنے والی آبادی کیسی ہے۔ یہ مشاہدہ ہے۔

جب آپ لگاتار مختلف سڑکوں پر سفر کرتے ہیں تو تجربہ کار مسافر کہلاتے ہیں اور آپ سے اگر کوئی ان سڑکوں کے حوالے سے معلومات Share کرے تو آپ فوراً اس کی تردید یا تصدیق کرتے ہیں۔ نئے راہ رو کو آپ اُس راستے کی مشکلات اور دقتوں سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی آپ کی بات کا یقین کرے گا اور کوئی نہیں۔ لیکن جب وہ خود اُس راہ پر چلیں گے تو تصدیق ہو جائے گی کہ اُس آدمی نے ہمیں جو معلومات فراہم کی تھیں وہ بالکل درست ہیں۔ یوں لوگ سفر کرنے سے پہلے اُس گائیڈ سے راہنمائی لینے لگتے ہیں کیوں کہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ وہ جو بھی اطلاع دے گا، درست ہو گی۔ یہ مشاہدہ ہے۔ رُوحانیت میں سیر کے ذریعے واردات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ آپ جیسی جیسی رُوحانی کیفیات سے گزرتے ہیں، جس جس منزل کی سیر کرتے ہیں، اس کا مشاہدہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یوں آپ کا تجربہ اور علم بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ایک بار پڑھائی کے دوران میں نے ایک عجیب طرح کی بلڈنگ دیکھی۔ فوج 10X10 کے ایک کمرے کے برابر چھوٹے مورچے بناتے ہیں جنھیں Pillbox کہا جاتا ہے۔ اس کی Wall تقریباً 36 انچ ہوتی ہے۔ یہ کنکریٹ اور سیمنٹ سے بنایا جاتا ہے۔ زمین سے تقریباً چار انچ اوپر تین اطراف میں فائرنگ کے لیے سوراخ رکھے جاتے ہیں۔ یہ سوراخ باہر سے چوڑے ہوتے ہیں لیکن اندر آتے آتے 16 انچ رہ جاتے ہیں۔

میں پڑھائی کے دوران سیر کو 7 Buildings ایسی دیکھیں جو لمبائی، چوڑائی اور اونچائی میں بہت بڑی

تھیں لیکن ان کے روشن دان اور دیواروں کی ساخت Pillbox سے ملتی جلتی تھی۔ روشن دانوں سے انسانوں سے قدرے مختلف مخلوق کی شکلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ قبلہ مرشد یعقوب علی شاہ صاحب سے یہ ساری تفصیلات عرض کیں تو ایک لمحے کے توقف کے بعد بولے "وہ تو فلاں اقلیم تھی جس کی سیر کو تم نکلے ہوئے تھے۔" کچھ عرصے بعد روحانی علم کے کسی اور ذریعے سے تصدیق ہو گئی کہ وہ واقعی وہی اقلیم تھی جو مجھے شاہ صاحب نے بتائی تھی۔ تب میں نے ان سے عرض کیا "حضور! فلاں ذریعے سے اس اقلیم کی تصدیق ہو گئی ہے۔" کہنے لگے "میاں! اگر انسان خود ان راہوں سے گزرا ہے تو جب کوئی سوال کرتا ہے تو وہ فی الفور اس کا جواب دے دیتا ہے لیکن اگر وہ خود ان راہوں سے نہیں گزرا تو ایسے کسی بھی سوال کے جواب میں وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے گا۔"

مجاہدے کے نتیجے میں انسان کو بہت سی چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں، خواہ وہ مجاہدہ عبادات کا ہو یا نفس کی مخالفت ہو۔ جہاں آج کل فرق آتا ہے وہ یہ کہ ہم عبادات اور ریاضت میں تو مجاہدہ کر لیتے ہیں لیکن نفس کے خلاف مجاہدہ کرنا ہمیں مشکل لگتا ہے۔ مثلاً ہم نے روزہ رکھ لیا، کھانا پینا چھوڑ دیا، نماز کی پابندی کر لی عرف عام میں جھوٹ کہلانے والی چیزوں سے اجتناب کر لیا لیکن چھوٹی چھوٹی وعدہ خلافیوں اور ہلکے پھلکے جھوٹ میں مبتلا ہونے کی عادت سے چھٹکارا نہ پا سکے۔

علاوہ ازیں اکثر ہم ایک بہت اہم نکتہ فراموش کر جاتے ہیں اور وہ نکتہ ہے "توکل"۔

کسی کام میں ہمیں ذرا سی مشکل آئے گی تو ہم کسی عامل، فقیر، صاحب دعا یا جادو تعویذ کرنے والے کے پاس بھاگ جائیں گے کہ مجھے پیسے چاہئیں۔ مدت سے مکان فروخت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن وہ بک ہی نہیں رہا تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔

ایسے میں ہم بھول جاتے ہیں کہ پیسے تو رب تعالیٰ نے دینے ہیں۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ کس Point پر ہمارا نقصان شروع ہو جائے گا۔ ہمارا کام تو ہاتھ پاؤں ہلانا اور محنت و کوشش کرنا ہے۔

جب ایسا کیا اور مشکل میں حواس باختہ ہو گئے تو رب تعالیٰ پر بھروسے سے بہت دور چلے گئے۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں تم چلو! میں بس ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔ میں اپنے کام نمٹاتا رہا اور پانچ کے بجائے پچاس منٹ میں مقررہ جگہ پر پہنچا۔ یہ ایسی وعدہ خلافی ہے جس کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔

وظائف کرنے اور چلے کاٹنے کی نسبت نفس کے خلاف مجاہدہ زیادہ ضروری ہے۔ جب ہم نفس کا مجاہدہ کرتے ہیں تو رب تعالیٰ پر بھروسا پیدا ہوتا ہے۔ تب ہماری دنیا بدلنے لگتی ہے اور زندگی اتنی آسان ہو جاتی ہے کہ اس کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔

سوال: کیا عید میلاد النبی ﷺ منانا جائز ہے؟

جواب: میرے نزدیک اس کی پوزیشن ایسی ہے کہ اگر ایک صاحب انتقال کر جائیں اور ان کے چار بیٹوں میں

ہے کوئی بیٹا اپنے والد کے یوم پیدائش کے موقع پر اس نیت سے غربا میں کھانا اور کپڑے تقسیم کرتا ہے کہ اس نیک عمل کا ثواب اُس کے والد کی رُوح کو مل جائے اس میں کوئی حرج نہیں۔

دوسرا بیٹا کہتا ہے کہ صاحب وہ دُنیا میں آئے اپنا وقت پورا کر کے چلے گئے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ تیسرا بیٹا کہتا ہے کہ آج کے دن ہمارے والد صاحب پیدا ہوئے تھے تو کیوں نہ قرآن خوانی کروا کر ان کی رُوح کو ایصالِ ثواب کر دوں۔ یہ عمل بھی پسندیدہ ہے۔ چوتھا بیٹا سرے سے کچھ نہیں کرتا۔ یہ بھی اس کی اپنی مرضی ہے۔ اس سارے قصے میں بات اپنی خوشی کی ہے۔

آپ ﷺ ہمارے آقا ہیں۔ آپ ﷺ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیں صحیح راہ دکھائی۔ اگر کوئی آپ ﷺ کا دن منانا چاہتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ اس سلسلے میں یہ احتیاط ضرور رکھنی چاہیے کہ اس موقع پر کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو اسلام میں ناپسندیدہ ہے اور نہ ہی کوئی انسانی وقار سے گری ہوئی حرکت کی جائے۔

کسی موقع کو Celebrate کرنے کے پیچھے اس علاقے کی Local traditions اور Cultural values کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ جیسے عمارتوں پر چراغاں کرنے کا رواج بہت کم ملکوں میں ہے۔ زیادہ تر برصغیر پاک و ہند میں یہ چراغاں کیا جاتا ہے۔ اس کی داغ بیل رام کے جنم دن کی وجہ سے پڑی۔

ہندومت دُنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ یہ ہندو مذہب اس وقت دُنیا میں آیا جب انسان ذہنی ارتقا کی ابتدائی منازل طے کر رہا تھا۔ اس زمانے میں انسان چونکہ ذہنی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اس لیے اس کی اپنی Living کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف اور تشکر کی وجہ سے مختلف چیزوں کی پوجا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیسے سانپ سے خوف زدہ ہو کر اس نے اُسے اپنا دیوتا بنا لیا اور گائے کے دودھ سے فائدہ اُٹھانے کی وجہ سے اُسے ماتا کا درجہ دے دیا۔ محدود ذہنی سطح کی وجہ سے عجیب و غریب چیزیں ہندو مذہب میں در آئیں۔ رام کے زمین پر اتر آنے کی خوشی میں ہندوؤں نے دیے جلائے جو رفتہ رفتہ چراغاں کی صورت برصغیر کے کلچر کا لازمی حصہ بن گیا اور ہر خوشی کے موقع پر چراغاں کیا جانے لگا۔

برصغیر میں بزرگانِ دین کی کاوشوں سے ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد مسلمان تو ہو گئی لیکن انھوں نے اپنے سابقہ کلچر کی بہت ساری چیزوں کو Adopt کر لیا۔ ہماری شادی کی رسوم میں نکاح اور ولیمے کے سوا تمام رسوم ہندوانہ ہیں۔ اسی طرح کسی کے انتقال پر بہت سی ہندوانہ رسوم ہمارے کلچر کا حصہ بن چکی ہیں۔ خوشی کے موقع پر چراغاں کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اگر 12 ربیع الاوّل کے موقع پر خوشی کے طور پر چراغاں کیا جائے تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن میری ذاتی رائے کے مطابق اس دن کو Celebrate کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم خود بھی قرآن پاک پڑھیں اور باقاعدہ طور پر قرآن خوانی کا اہتمام بھی کریں۔ پھر اللہ کے حضور درخواست کریں کہ وہ اس قرآن خوانی کا ثواب بطور تحفہ و نذرانہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دے۔ اس روز جب

تو حسبِ استطاعت غرباء و مساکین کو کھانا کھلایا جائے اور اس کا ثواب آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں ہدیہ کر دیا جائے۔

ہلڑ بازی، جھگڑے اور اسی قسم کی دیگر بے وقار حرکتوں سے گریز کیا جائے۔ اللہ بہت باوقار ہے اور باوقار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ خود آپ ﷺ انتہائی باوقار تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ کا جشنِ ولادت مناتے ہوئے ہم اللہ اور آپ ﷺ کی سنت، اسلامی تعلیمات اور آداب کے تقاضوں کو مدِنظر رکھیں۔ اس روز ہم دوسروں کا راستہ نہ روکیں۔ ہماری وجہ سے ٹریفک کا Flow ڈسٹرب نہ ہو۔ دوسروں کو ہماری وجہ سے کوئی دقت پیش نہ آئے۔ بارہ ربیع الاوّل مناتے ہوئے ان تمام باتوں کا خیال رکھیں۔

سوال: خیرات کی بہترین صورت کیا ہے؟

جواب: خیرات دینا اللہ کے نزدیک بہت مستحسن عمل ہے۔ آپ ﷺ نے صدقات و خیرات پر بڑا زور دیا ہے لیکن بدلتے حالات کے ساتھ صدقات و خیرات کی صورت تبدیل ہو جانی چاہیے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کی تعداد 1.2 بلین ہے۔ (نوٹ: یہ لیکچر 27 اکتوبر 2007 کو دیا گیا) اور ہم دنیا کی کل آبادی کا 20 فی صد ہیں۔ چالیس فی صد پٹرول کی دولت ہمارے پاس ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں نچلے درجے کے لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہمیں وحشی سمجھا جاتا ہے اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم بہت کم ہے۔ ہماری Muscular power کم نہیں۔ 1.2 بلین صحت مند مسلمانوں سے کوئی متاثر نہیں ہوتا کیوں کہ آج کی دنیا میں انسان کی اصل طاقت کا راز Muscles نہیں بلکہ دماغ میں پوشیدہ ہے۔ ہم سڑکوں اور چوراہوں پر کھڑے گداگروں کو دو چار روپے دے کر غربت ختم نہیں کر سکتے صرف گداگروں کی تعداد میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں کل آبادی کا 15 فی صد لوگ مالی لحاظ سے خوشحال ہیں۔ پاکستان کی 16 کروڑ آبادی میں سے یہ 15 فی صد لوگ نکال دیے جائیں تو 13 کروڑ ساٹھ لاکھ لوگ باقی بچتے ہیں۔ کل میں سے Earning hand پچاس فی صد مرد اور پچاس فی صد عورتیں ہیں۔ یوں تقریباً آٹھ کروڑ مرد رہ گئے۔ ہمارے ہاں تقریباً 80 فی صد بچے، بوڑھے اور Non-earning ہیں اور 16 کروڑ آبادی کا 20 فی صد Earning hand ہیں جو تین کروڑ 20 لاکھ بنتے ہیں۔ 4.7 ملین لوگ مالی لحاظ سے Affluent ہیں۔ اگر یہ 4.7 ملین لوگ سمجھ لیں کہ ہمارے چار نہیں بلکہ پانچ بچے ہیں اور وہ اپنے غریب عزیز و اقرباء یا ملازمین کے ایک بچے کو اپنے بچوں کے ساتھ تعلیم و تربیت کے اخراجات اور تمام سہولتیں فراہم کریں اور پھر ان بچوں کو Superior Education کے لیے دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں میں بھیج دیں تو صرف 18 سال کے بعد ہر سال 47 لاکھ ڈاکٹر قدیر خان پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے اور اس سے اگلے دس سال بعد ساری مغربی دنیا ہمارے قدموں میں ہو گی۔ یہ 30 سالہ پروگرام ہے۔ تیس برس بعد پاکستان کسی سے قرض نہیں مانگ رہا ہو گا بلکہ امریکہ پاکستان سے قرض مانگ رہا ہو گا۔

اسلام میں خیرات کا جو Concept ہے اگر اسے موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق Channelise کر دیا جائے تو یہی خیرات پوری مسلم اُمت کے اُٹھ کھڑے ہونے کا ایک بہت بڑا Source بن جائے گی۔ تیس سال بعد 4 کروڑ 70 لاکھ ڈاکٹر قدیر خان پاکستان کے پاس ہوں گے۔ ان 4 کروڑ 70 لاکھ ڈاکٹرز کا Impacts پوری مسلم اُمت پر آئے گا۔ جو کچھ آپ پاکستان میں سیکھتے ہیں وہ پوری مسلم اُمت میں پھیلا دیں گے تو ساری دنیا کے مسلمان متحرک ہو جائیں گے۔ خیرات کے بارے میں میرا Concept یہی ہے۔

قائداعظم Muscular Power کے لحاظ سے لاغر تھے لیکن ایک تن تنہا شخص نے اپنی Intellectual Power کے زور پر ہندو اور انگریز کو شکست دے دی۔ خیرات کا یہ پہلو بہت Constructive ہے کہ اس کے ذریعے ہم Intellectual Power کو اُجاگر کریں۔ اگر ہم نے اس فارمولے پر عمل کرنا شروع کر دیا تو ہمارے معاشرے میں بہت بڑی مثبت تبدیلی آ جائے گی۔

علماء معترضہ کے طور پر یہاں عرض کر دوں کہ ہم میں سے لوگوں کی اکثریت زکوۃ کو Saving Tax سمجھتی ہے کہ وہ بچت جو ایک سال تک ہمارے پاس موجود ہے اس پر زکوۃ لاگو ہو گی۔ ایسا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مدیں ہیں جن پر زکوۃ واجب ہے۔ اگر زکوۃ کی ادائیگی کا نظام درست ہو جائے تو غربت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں مومن کی تعریف کی کہ اس کے کردار و گفتار میں اللہ کی برہان ہوتی ہے۔ یہ برہان محض قرآن پاک کو پڑھ لینے سے نہیں آتی بلکہ اس کو سمجھنے، اس پر غور و فکر کرنے اور اس کے احکامات کو اپنی زندگی پر Apply کرنے کے بعد آتی ہے۔ علامہ اقبال کو ہمیشہ مسلمانوں سے یہی گلہ رہا کہ وہ قرآن پاک پڑھتے تو ہیں سمجھتے نہیں اور نہ ہی قرآنی تعلیمات پر اس طرح عمل کرتے ہیں جس طرح کرنا چاہیے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم قرآنی احکامات کو اپنی پوری زندگی پر محیط نہیں کرتے۔ جیسے ہم دوسروں کا حق مارتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حق مارنا صرف یہی نہیں کہ ہم دوسروں کی جائداد پر قبضہ کر لیں، دوسروں کا روپیہ پیسہ ضبط کر لیں۔ حق مارنے کا اطلاق اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ جب ہم گھر کا فرش دھو ئیں تو اس کا پانی باہر گلی میں بہہ کر ہمارے ہمسائے کے گھر کے سامنے چلا جائے۔ اسی طرح اگر ایک شخص ٹریفک لین کی پابندی کر رہا ہے تو ہم الٹی طرف سے اوور ٹیک کر کے اس کے سامنے گاڑی کھڑی نہ کریں کہ سگنل کھلنے کی صورت میں ہم پہلے نکل جائیں گے۔ اسی طرح قطار میں کھڑے ہونے کی بجائے میں ڈائریکٹ کاؤنٹر پر جا کر اپنا کام کروالوں ——— یہ بھی حق تلفی ہے۔

جب تک ہم اپنے ان رویوں کو بہتر نہیں کریں گے معاشرے کا بگاڑ ختم نہیں ہو سکے گا۔

سوال: کیا اصحاب کہف کے کتے کا مشاہدہ اللہ کی طرف لے جائے گا؟

جواب: میرے علم کے مطابق تو یہ ممکن نہیں کہ کوئی کتا اللہ کی طرف لے جائے۔ اصحاب کہف کا کتا ہونے کی وجہ سے ہم اس کا ذکر اچھے لفظوں میں کرتے ہیں ورنہ کتا تو ایسا بے زبان نجس جانور ہے کہ جس کا تھوک کپڑوں

پر لگ جانے سے لباس ناپاک ہو جاتا ہے۔

البتہ رُوحانیت میں مشاہدہ کی بہت اہمیت ہے اور یہ رب کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی لیے تو قیم کوزمین پر سیر کر کے اللہ کی نشانیوں اور قدرت کا مشاہدہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ اسے رب تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ ذرا دیکھوں جائیے، چیونٹیوں کو ہی لے لیجیے۔ وہ دانہ جو چیونٹی بہت مشقت کے بعد بل میں لے کر جاتی ہے وہ سب چیونٹیوں کے لیے ہوتا ہے۔ ہم اکثر اپنے کم وسائل رکھنے والے بھائیوں کی مدد کی بات کرتے ہیں۔ ہم سے پہلے تو یہ سبق چیونٹیوں نے سیکھ لیا۔ اسی طرح لوگ کووں کا مشاہدہ کر کے اُن سے Wisdom سیکھتے ہیں۔ مشاہدہ بنیادی چیز ہے جو ہمیں رب کی طرف لے جانے کا سبب بن سکتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ سب سے حقیر چیز میری بارگاہ میں پیش کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو راستے میں ایک خارش زدہ کتا نظر آیا۔ لیکن ایک لمحہ کے توقف کے بعد انھوں نے خود اپنے آپ کو بطور حقیر چیز اللہ کے حضور پیش کر دیا۔ جس پر اللہ نے فرمایا ''اے موسیٰ! اگر تم وہ کتا لے آتے تو میں تمھیں دیوانِ نبوت سے خارج کر دیتا۔''

جواب: یہ واقعہ مجھ جیسے انسانوں کے لیے ہی بیان ہوا ہے۔ اگر کسی نبی نے بھی کتے جیسی نجس چیز کو خود سے حقیر جان لیا تو وہ نبوت سے خارج ہو گیا۔ مقصد یہی ہے کہ کسی چیز کو حقیر نہ جانو کیوں کہ جب ہم کسی کو حقیر سمجھتے ہیں تو گویا خود کو Superior (برتر) سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ تکبر کیا ہے؟ خود کو دوسروں سے برتر اور بہتر جاننا۔ خواہ وہ علم، دولت یا سوشل سٹیٹس ہی کے لحاظ سے ہو۔ جس نے تکبر کیا علم اُس کے قریب سے بھی نہیں گزرے گا۔

بھید بھری باتیں

(کشف القبور، کشفِ شخصی اور اس راہ کی مشقتیں)

کشف کی ایک قسم ایسی ہے جس کے بارے میں لوگ اُسی قدر متجسس رہتے ہیں جس قدر انھیں اسمِ اعظم کے بارے میں ہوتا ہے کہ اگر وہ ہمارے ہاتھ لگ جائے تو ہم اپنی زندگی سے مشکلات نکال کر پڑوسی کے گھر میں پھینک دیں، جس طرح ہم اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ پڑوسی کے گھر کے آگے ڈال دیتے ہیں۔

بڑے شاہ صاحب کے پاس ایک شیخ صاحب تشریف لایا کرتے تھے۔ انھیں یہ کمال حاصل تھا کہ اگر شاہ صاحب کو کسی طور غصہ نہ آتا ہو تو شیخ صاحب اُن کے پاس ایک آدھ منٹ بیٹھ جاتے اور اس انداز میں بات کرتے کہ بڑے شاہ صاحب بگڑ جاتے اور تب اُن کا جلال سنبھالا نہ جاتا۔ اس لیے جب بھی قبلہ مرشد صاحب علم کی باتیں کرنے پر راغب ہوتے تو ہم میں سے ایک شخص باہر جا کر کھڑا ہو جاتا تا کہ شیخ صاحب کو کچھ دیر کے لیے باہر ہی روک لیا جائے۔

ایک روز شیخ صاحب وہاں موجود تھے اور قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب مجھ سے کوئی بات کر رہے تھے۔ شیخ صاحب بار بار درمیان میں Interrupt کرنا چاہتے تھے۔ جیسے ہی گفتگو کے دوران شاہ صاحب نے Pause کیا۔ شیخ صاحب ایک دم بولے ”حضور! آج کل کوئی کام نہیں ہو رہا۔ بڑی دقت آ رہی ہے۔“ میں نے شاہ صاحب کے چہرے کی جانب دیکھا جس کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے شیخ صاحب کو اشارہ سے مزید کوئی بھی بات کرنے سے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آئے اور تین چار بار وہی جملے دہراتے حتیٰ کہ تیسری بار یہ سب کچھ انھوں نے بہت Loudly کہا۔ اس پر شاہ صاحب نے بہت خوب صورت جواب دیا:

”کیوں میاں! اس میں کیوں دعا کر دوں۔ اچھا وقت تم گزارو اور برا وقت تمھاری جگہ کوئی اور گزارنے آئے گا؟ اگر اچھا وقت تم نے Enjoy کیا ہے تو برا وقت بھی تم ہی گزارو گے۔“

ہم اسمِ اعظم کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگر کسی Unguided moment میں کوئی فقیر انجانے میں اسمِ اعظم Disclose کر دے تو ہم ذرا سی دقت میں اس اسمِ اعظم کو استعمال کر کے اس سے باہر نکل آنے کے

خواہش مند رہتے ہیں۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ رب تعالیٰ ایسے اسرار انہی لوگوں پر کھولتا ہے جو اپنی روحانی تربیت کی وجہ سے مشکلات کو مشکلات اور فاقے کو فاقہ نہیں سمجھتے۔ وہ ہر قسم کے کٹھن حالات کو یہ سوچ کر خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے ہیں کہ یہ ہمارے رب تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس میں ہمارے لیے بہتری ہے کیوں کہ ہمارا رب تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ اس سے سوائے بہتری کے کوئی اور توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

گفتگو کے آغاز میں کشف کی جس قسم کی جستجو کا ذکر ہوا وہ کشف القبور ہے۔ لوگ اس کے بارے میں جاننے میں بہت متجسس رہتے ہیں۔ کشف کی تمام اصناف میں سے کشف القبور تک رسائی قدرے آسان ہے۔

یہ درست ہے کہ جس انسان کو کشف القبور حاصل ہو وہ جب کسی قبر پر جا کر فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو اُس کا کشف جاری ہو جائے گا۔ اُس کو صاحبِ قبر کا حال معلوم ہو جائے گا۔ اُس سے ملاقات اور گفتگو ہو جائے گی۔ لیکن اس ملاقات اور گفتگو میں صاحبِ قبر کبھی یہ نہیں بتاتے کہ ساتھ والی قبر میں کوئی خزانہ دفن کیا گیا تھا۔ نہ ہی وہ یہ بتائیں گے کہ فلاں شخص پر فلاں شخص نے جادو کیا تھا۔ اگر کشف القبور رکھنے والا شخص صاحبِ قبر سے کوئی غیر ضروری اور دنیاداری کا سوال کرے گا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ دن کے لیے کشف القبور بند ہو جائے گا۔

کشف کی مختلف اقسام میں کشف القبور کا حصول سب سے آسان جب کہ کشف شخصی حاصل کرنا سب سے مشکل ہے کیوں کہ کشف شخصی کا تعلق آپ کے مخاطب کی ذہنی اور روحانی سطح و قوت سے ہے۔ اگر آپ کا مخاطب خود بھی صاحبِ علم ہے تو جس طرح پانی اپنی سطح برقرار رکھتا ہے۔ جس طرف پانی کم ہوتا ہے اُس طرف دوسرا پانی بہہ کر آ جائے گا اور یہ لیول Maintain ہو جائے گا۔ علم میں بھی فارمولا تو یہی ہے لیکن یہ الٹ کام کرتا ہے۔ جہاں کم علم ہوگا وہ زیادہ علم والی جگہ کی طرف ٹرانسفر ہو جائے گا۔ جسے عام طور پر ''علم کو سلب'' کر لینا کہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کا علم سلب کر لیتے ہیں لیکن روحانیت میں ایسا کرنا گناہ ہے۔ کیوں کہ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ایک شخص نے محنت سے پیسہ کمایا اور کوئی اس کی محنت کی جمع پونجی چھین کر لے گیا۔

اگر آپ کسی شخص کے علم کو اس کی مرضی کے خلاف سلب کر رہے ہیں تو یہ ڈاکا زنی ہے۔ البتہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ کم علم والا شخص زیادہ علم والے شخص کو Challenge کر بیٹھتا ہے تو اُس کا علم سلب ہو جاتا ہے یا یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی ایسے شخص کے بارے میں کشف کے ذریعے کچھ جاننا چاہتے ہیں جو علم میں آپ سے بڑھ کر ہے تو معاملہ الٹا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر اُس کا اور آپ کے علم کا ایک ہی Level ہے تو ایسے میں آپ کا کشف جاری نہیں ہو پائے گا اور اگر کشف جاری ہو بھی گیا تو سکرین نہیں آئے گی۔ جس طرح ایک ہی جگہ پر دو ریڈیو اسٹیشن ہوں اور وہاں ایک Strength کے دو ٹرانسمیٹر لگے ہوں تو وہ دونوں Automatically ایک دوسرے کو Jam کر دیں گے۔ دونوں ہی اسٹیشنوں کی ٹرانسمیشن رک جائے گی۔

اگر شخص کشف کا حامل شخص بہت زیادہ Strong ذہنی قوت رکھتا ہے یا روحانیت کے بلند مقام پر ہے تو وہ مردے کو Overpower کرنے لگے گا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روحانیت کے اتنے بلند مقام پر جانے والا شخص بھی کشف کے ذریعے کسی کو دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرے گا۔

میں نے کشف شخص کو بہت دشوار پایا کیوں کہ اس میں بہت سے نشیب و فراز آتے ہیں۔ ویسے تو کشف القبور میں بھی بعض اوقات صورتِ حال ایسی ہی ہو جاتی ہے لیکن اس میں عموماً بچت اس لیے ہو جاتی ہے کیوں کہ ایک طرف روح اور دوسری طرف زندہ انسان ہوتا ہے۔ صاحبِ قبر بہت بلند مقام پر ہوتے ہیں۔ بہت بڑے ولی اللہ ہونے کی وجہ سے عموماً وہ بہت مہربان ہوتے ہیں لیکن اگر صاحبِ قبر جلالی ولی اللہ ہیں تو وہ آدمی کو مروڑ دیتے ہیں۔ تاہم ایسے ولی اللہ خال خال ہیں۔

اگر بہت کم علم رکھنے والے شخص نے کسی مزار پر حاضری دی اور صاحبِ مزار سے ملاقات ہو گی تو صاحبِ مزار چونکہ علم کے بلند اور اعلیٰ معیار پر تھے اس لیے حاضری دینے والے شخص کے پاس جو بھی علم تھا وہ ایک بار تو چلا جائے گا لیکن پھر دس گنا اضافے کے ساتھ واپس مل جائے گا۔ جس طرح تین سال کا ایک بچہ آپ کو پانچ روپے کا نوٹ دکھا کر فخر سے کہتا ہے "دیکھو میرے پاس کتنے پیسے ہیں۔" آپ پیار اور مذاق سے کہتے ہیں۔ "لاؤ یہ مجھے دے دو۔" اگر آپ کا دل بڑا ہے تو ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد آپ 5 روپے کی بجائے اُسے 50 یا 100 روپے کا نوٹ تھما دیں۔

کشف القبور میں Risk کم ہے کیوں کہ صاحبِ مزار بہت بڑا آدمی ہوتا ہے۔ وہ آپ سے کچھ لے کر اپنے پاس نہیں رکھتا بلکہ دس گنا بڑھا کر لوٹا دیتا ہے۔ یوں انسان فائدے میں رہتا ہے اور اس کی کشف کی Strength بہت بڑھ جاتی ہے۔

لیکن اس میں یہ احتیاط ملحوظ رکھیں کہ کشف ہو یا کوئی بھی روحانی علم...... اس کے حصول کا مقصد دنیا کا حصول نہ ہو کیوں کہ روحانی علم وہیں پنپتا اور پھلتا پھولتا ہے جہاں دل سے دنیا کی محبت نکل گئی ہو، جو صرف دینا جانتے ہوں لینا بھول گئے ہوں۔

علم گداز دلوں پر اترتا ہے۔ کچھ لوگ دل کو گداز کرنے کے لیے ضرب لگاتے ہیں حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ دل پر اگر اللہ ھو یا نفی اثبات یا لا الٰہ الا اللہ کی ضرب لگائی جائے تو وہ Physically کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کا دل بہت سخت ہو اور اسے نرم کرنے کی ضرورت ہو تو اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ نماز کے بعد جب سلام پھیریں تو ہر نماز کے بعد صرف تین بار دل پر "الا اللہ" کی ضرب لگائیں۔

قلب کی سختی دور کرنے کے لیے یہ عمل ہر نماز کے بعد تین بار دہرایا جا سکتا ہے لیکن اگر دل پہلے سے ہی گداز ہے تو اس کی ضرورت نہیں۔

میرے نزدیک دل کو گداز کرنے کا آسان طریقہ وہی ہے جو رب تعالیٰ استعمال کرتا ہے۔ انسان پر مصیبتیں آتی ہیں، الزامات اور بہتان لگتے ہیں، لوگ طعنے دیتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں۔ اس سے دل پر

چھریاں چلتی ہیں۔ جس طرح جب کسان زمین میں ہل چلاتا ہے تو ہل کا پھل بہت گہرائی میں زمین میں گاڑتا ہے جس سے زمین گہرائی میں پھٹ کر زیادہ زرخیز ہو جاتی ہے۔

انسان کے دل کو گداز عطا کرنے کے لیے ابتدا میں طعنوں اور تہمتوں کے ساتھ ساتھ اسے مالی تنگی سے اس طرح گزارا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہتا ہے بلکہ اپنے Dependents کی ضروریات بھی باوجود بھاگ دوڑ اور تگ و دو کے پوری نہیں کر سکتا۔ صرف اپنی ذات کی بات ہو تو وہ اس مالی مشکل کو ہنس کھیل کر جھیل لے لیکن جب بچے بھوک سے بلکتے ہوں، اولاد Demands کرتی ہو اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ بہتان، الزامات اور تہمتیں لگتی ہوں، طعنے سننے کو ملتے ہوں اور اوپر سے یہ پابندی بھی ہو کہ ان سب حالات میں زبان سے ایک لفظ نہیں کہنا، کسی کو صفائی یا وضاحت نہیں دینی کہ جناب مجھ پر یہ جھوٹا الزام لگایا گیا ہے بلکہ سب کچھ خاموشی سے سننا، سہنا اور برداشت کرنا ہے۔ ہر الزام کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسے میں ضبط کی انتہا پر پہنچ کر انسان کے اندر جو ہلچل مچتی ہے اور دل کا جو حال ہوتا ہے وہی گداز کا باعث بنتا ہے۔ جب انسان کو لوگوں کی وہ باتیں یاد آتی ہیں اور وہ سو نہیں پاتا۔ جب لوگوں کی تیکھی نوکیلی باتوں کے نشتر اس کے دل کو گداز کر دیتے ہیں تو پھر اس کے دل میں علم اترنے لگتا ہے اور تب وہیں سے کشف جاری ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو کشف کے حصول کی خواہش ہے وہ جان لیں کہ اس راہ کی مشکلات کیا ہیں اور کشف حاصل کرنے کے لیے کن کڑی شرائط اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

1986ء میں ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے "شاہ صاحب! میں آپ سے دنیا کی کوئی دعا کروانے نہیں آیا کیوں کہ میرے پاس عزت، دولت، مرتبہ سب کچھ موجود ہے۔ میں تو آپ کے پاس روحانیت کے حصول کے لیے آیا ہوں۔" میں نے انھیں کہا "میں آپ کو Warn کر رہا ہوں کہ اس راہ میں بہت سی مشقتیں اور مشکلات ہیں۔ لہٰذا آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیجیے۔" انھوں نے کہا "میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔" تب میں نے انھیں پڑھنے کے لیے کچھ دے دیا۔ شروع کے تین روز تو خیریت گزر گئے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ مالی تنگی کا شکار ہونے لگے۔ کوئی پندرہ بیس روز بعد وہ میرے پاس آ کر کہنے لگے "شاہ صاحب! آپ اپنی پڑھائی واپس لے لیں۔ مجھے ایسی روحانیت نہیں چاہیے جو فاقوں مارنے لگے۔"

وہ تمام لوگ جو کشف القبور کے حصول کے بارے میں متجسس و بے چین رہتے ہیں اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے پہلے وہ اپنے آپ کو اس راہ کی مشقتوں کے لیے تیار کر لیں۔

سوال: کشف کی کتنی اقسام ہیں؟

جواب: کشف دو طرح کا ہے۔

1۔ غیر اختیاری کشف

2۔ اختیاری کشف

غیر اختیاری کشف وہ ہے جس پر کسی انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ انسان کسی سے باتیں کر رہا ہے، نماز یا قرآن پاک پڑھ رہا ہے اسے اچانک کچھ چیزیں دکھائی دینے لگیں گی۔ اکثر اولیائے کرام کو یہ کشف حاصل ہوتا ہے۔

اختیاری کشف وہ ہے کہ جس میں جب چاہا، حالت کشف میں داخل ہو گئے۔ یہ کشف بہت کم اولیائے کرام کو حاصل ہوتا ہے۔

ہماری نظر اس پر رہتی ہے کہ ایسا کشف عطا ہو جائے کہ جب چاہیں کشف میں داخل ہو جائیں۔

کشف کے حصول کی ترتیب یوں ہوتی ہے کہ عموماً سب سے پہلے زمین سے متعلق، پھر سمندر اور اس کے بعد آسمان سے متعلق کشف حاصل ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ یہی ترتیب ہو۔ کچھ لوگوں کو سب سے پہلے آسمان، پھر زمین یا سمندر سے متعلق کشف حاصل ہو جاتا ہے۔ کشف کی یہ تین Major kinds ہیں۔ جن کی مزید بہت سی Sub-kinds ہیں جس میں کشف قلبی، کشف شخصی، کشف القبور اور دیگر بہت سی اقسام شامل ہیں۔

سوال: ملک میں بے یقینی کی فضا ہے۔ اس سے ہم باہر کب نکلیں گے؟

جواب: اللہ تعالیٰ اس ملک کو ایک خاص مقصد کے تحت وجود میں لایا اور وہ اس مقصد کو ضرور پورا کرے گا۔ (انشاءاللہ)

اس لیے آپ کسی بھی فقیر سے جب اس بارے میں سوال کریں گے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ انشاءاللہ اس ملک کو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ قائم و دائم رہے گا۔ باقی اونچ نیچ اور Turbulence ہر ملک میں ہوتی ہے لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ جب لوگوں کی تربیت ہو جائے گی تو یہ Turbulence اتنی نہیں رہے گی جتنی دکھائی دیتی ہے۔ اگر آج بھی ہمارے ہاں تعلیم عام ہو جائے اور معلومات تک رسائی ہو تو صورت حال بہت بہتر ہو جائے گی۔

ہماری قومی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ نیم حکیم خطرہ جان نیم ملا خطرہ ایمان۔ جب ہمارے پاس معلومات کم ہوں گی تو ہم افواہوں پر بہت جلد یقین کر لیں گے اور اسی قدر جلد لوگوں کے نقطہ نظر سے متاثر ہو جائیں گے۔ لیکن جب ہمارے پاس علم اور معلومات ہوں گی تو ہم تجزیہ کر سکیں گے کہ What is what? اور Who is who? آپ کسی Learned آدمی سے یہ کہیے کہ اگر آپ اقتدار مجھے سونپ دیں تو میں 2007ء میں 1990 والی Prices واپس لا سکتا ہوں۔ اگر وہ منطقی شخص ہے تو آپ کی اس Illogical بات پر خاموش ہو جائے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اکنامکس کا ایسا کوئی کلیہ یا قاعدہ نہیں جس کے تحت قیمتوں کو واپس لے جایا جا سکے۔ جب وہ آپ کی باتوں میں نہیں آئے گا تو آپ کسی کو اپنے ساتھ ملا کر یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ میں 1990 والی قیمتیں لوٹا سکتا ہوں۔

دراصل تعلیم اور معلومات کی کمی کی وجہ سے ہم بہت جلد دوسروں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ ہم چونکہ اندھیرے میں ہوتے ہیں اس لیے سوچتے ہیں کہ چونکہ یہ شخص روشنی میں کھڑا ہے اس لیے جو بھی کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ مسئلہ ہماری کم علمی کا ہے۔

البتہ میرے خیال میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وقتی طور پر ہمیں ہلچل اور Turbulence محسوس ہو رہی ہے لیکن انشاءاللہ جلد یا بدیر اس ملک کے حالات سنور جائیں گے۔

سوال: ضروری تو نہیں کہ مالی تنگی اور معاشرے کی ٹھوکروں سے دل گداز ہی ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انسان کے اندر منفی سوچ جنم لینے لگے۔

جواب: جو انسان رُوحانیت کی تلاش میں نکلتا ہے اس کا رب تعالیٰ پر پختہ ایمان ہوتا ہے۔ جس شخص میں یہ دو خصوصیات موجود ہوں وہ Negative side پر نہیں جائے گا۔

1995ء میں ایک محفل میں چند Intelligentsia (اہل الرائے) بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک گفتگو کا رُخ ملکی حالات کی طرف مڑ گیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا "ملک میں غربت زیادہ ہونے کی وجہ سے رشوت اور بے ایمانی بڑھ گئی ہے۔" میں نے گزارش کی "جناب مجھے صرف ایک نکتہ Clear کر دیں کہ ہجرتِ مدینہ کے پہلے دس سالوں میں جو غربت تھی کیا آج اس سے زیادہ غربت ہے؟

وہاں تو غربت کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کرامؓ پیٹ پر پتھر باندھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ الحمدللہ ہمارے ہاں تو کسی کو پیٹ پر پتھر نہیں باندھنا پڑتا۔ موجودہ دور سے کم و بیش 1000 گنا زیادہ غربت انھوں نے دیکھی لیکن وہاں نہ تو رشوت تھی اور نہ ہی بے ایمانی اور چوری چکاری ...... وجہ یہ تھی کہ ان کا ایمان بہت مضبوط تھا۔ تب اسلام اپنی صحیح شکل میں نافذ تھا۔ اسلام معاشرے میں نہیں بلکہ دلوں میں نافذ تھا۔ معاشرہ افراد سے مل کر بنتا ہے اور افراد کے قلوب میں اسلام کے نفاذ کے بعد جو معاشرہ تشکیل پایا وہ Purely اسلامی تھا۔ جب انسان کے دل میں ایمان ہوتا ہے تو وہ منفی سائیڈ پر نہیں جاتا بلکہ ہر حال میں رب تعالیٰ کے ساتھ منسلک رہتا ہے۔"

سوال: کشف کی کوئی ایسی قسم ہے جس سے ہم خود اپنے آپ کو پہچان سکیں؟

جواب: آپ جانتے ہیں کہ جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

رُوحانیت کی بنیاد اسی وقت پڑے گی جب انسان خود سے آگاہ ہو جائے گا۔ خود سے آگاہ ہو جانے کے بعد ہی انسان اپنی خوبیوں کو اجاگر اور خامیوں کو دور کر پائے گا۔ اس لیے کشف کے ذریعے اپنے آپ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیوں کہ انسان رُوحانیت کی ابتدا ہی میں اپنے آپ سے آگاہ ہو چکا ہوتا ہے کہ میں کیا ہوں۔

وظائف کی بنیادی شرائط

ہم لوگ ابھی تک تصوف کو وظائف ہی کا مجموعہ سمجھے ہوئے ہیں اور تصوف کو شعوری یا لاشعوری طور پر دنیاوی مسائل کے حل کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہم اس سے دنیاوی فائدہ کا حصول چاہیں گے رُوحانیت حاصل نہیں ہوگی۔ درویشوں کا کہنا تو یہ ہے کہ اگر ہم رب تعالیٰ کے قریب بھی محض اس لیے ہونا چاہیں کہ اس سے ہمیں دنیاوی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ قرب کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس انتظار میں ہوں کہ ہمیں آج کتنا ملا۔ تین سال سے ہم اس راہ پر ہیں، اس عرصہ میں ہمیں کتنا علم حاصل ہوا۔ اس طرح کے حساب کتاب میں پڑنے والے شخص کو کبھی علم نہیں ملتا۔ جہاں ہم نے کسی چیز کا انتظار شروع کیا، وہ چیز پھر کبھی رُوحانیت کی راہ میں نہیں آئی چہ جائیکہ علم کے حصول کے پیچھے ہمارا بنیادی مقصد دنیا کا حصول ہو۔

کچھ لوگوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا وظیفہ پڑھا لیکن انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ نتیجہ میری توقع کے عین مطابق تھا کیوں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے وظیفے کے ساتھ کچھ بنیادی شرائط منسلک ہیں جن کو پورا کیے بغیر اُس وظیفے کے ثمرات حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ وہ بنیادی شرائط یہ ہیں:

1. انسان Selfless (بے غرض) ہو جائے۔

2. جب بسم اللہ الرحمن الرحیم کا وظیفہ پڑھنا شروع کریں تو ہم دوسروں کے آرام، خواہشات اور ضروریات کو اپنے آرام، خواہشات اور ضروریات پر ترجیح دینا شروع کر دیں۔

3. تیسری شرط یہ ہے کہ جن لوگوں سے ہمیں آنے والے کل میں تکلیف پہنچنے والی ہے، انھیں ہم آج ہی معاف کر دیں۔ اب آپ سوچیں گے کہ ہمارے پاس کوئی علم الغیب تو ہے نہیں کہ ہمیں یہ پتا چل جائے کہ کون ہمیں تکلیف دینے والا ہے۔ اس سے دراصل مراد یہ ہے کہ جونہی کسی شخص سے آپ کو تکلیف پہنچے خود کو سمجھائیں کہ یہ اللہ کا بندہ ہے، اس سے غلطی ہو گئی۔ یہ غلطی مجھ سے بھی ہو سکتی تھی اور نہ جانے کتنی بار ایسی غلطی مجھ سے سرزد ہو چکی ہے جس پر لوگ مجھے معاف بھی کر چکے ہیں لہٰذا میں اسے کیوں نہ معاف کر دوں۔ اس طرح بغیر کوئی شکوہ شکایت کیے اسے دل سے معاف کر دیں اور پہلے جیسی خندہ پیشانی سے اُس سے ملتے رہیں۔

4۔ اس وظیفے کی چوتھی Pre-condition یہ ہے کہ ہم دنیاوی مال و زر کی محبت اپنے دل سے نکال دیں۔ ہم یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں عطا فرمایا ہے، جو کچھ میں نے محنت سے کمایا ہے۔ یہ میرا نہیں، یہ پروردگار کی عطا ہے۔ اس پر میرا صرف اتنا حق ہے کہ جس سے میری اور میرے خاندان کی جائز ضروریات پوری ہو سکیں اور جو باقی بچ جائے وہ میرا نہیں، دوسروں کا حق ہے اور حق دار کو اس کا حق جتنی جلدی ہو سکے، پہنچا دیا جائے۔

ان تمام Pre-conditions کو پورا کرنے کے بعد جب ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا وظیفہ پڑھتے ہیں تو اس کے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بنیادی شرائط پوری کرنے کے ساتھ ساتھ وظیفہ پڑھنے کے جو مختلف اسلوب ہیں ان کا دھیان رکھنا بھی انتہائی اہم ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہم ایک Building (عمارت) بناتے ہیں، اس میں ایک مزدور، ایک Mason (معمار) اور Architect سب کا اپنا اپنا اور اہم کردار ہے۔ ان میں سے اگر ایک بھی Missing ہو گا تو Building نہیں بن پائے گی۔ لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ آج کے زمانے میں مزدور تقریباً تین سو روپے، Mason (معمار) ایک ہزار اور Architect بے تحاشا فیس Charge کرتا ہے۔ اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو مزدور جو اینٹیں اٹھا کر تختوں پر پاؤں رکھتا ہوا سب سے زیادہ مشقت برداشت کر رہا ہے اور اپنی جان کو Risk میں ڈالے ہوئے ہے وہ سب سے کم مزدوری وصول کر رہا ہے۔

Mason (معمار) جو مزدور کی لائی ہوئی اینٹوں کو تھام کر دیوار کھڑی کر رہا ہے اس کے سر پر دھوپ سے بچنے کو بھی اہتمام ہے اور اس کی مشقت بھی مزدور کی نسبت کم ہے لیکن اجرت وہ مزدور سے زیادہ لے رہا ہے۔ اس کے برعکس آرکیٹیکٹ (Architect) جو Furnished اور Air-conditioned کمرہ میں بیٹھ کر چند لائنیں کھینچ کر عمارت کا Design اور نقشہ بناتا ہے وہ مزدور اور معمار دونوں سے زیادہ معاوضہ وصول کر رہا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ سب سے کم محنت کرنے والا سب سے زیادہ معاوضہ اور سب سے زیادہ محنت کرنے والا سب سے کم معاوضہ وصول کر رہا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ مزدور ایک مشکل انداز میں تختے پر اینٹیں رکھتا ہے، انھیں اوپر پہنچاتا ہے، پھر نیچے آتا ہے اور وہی عمل دہراتا ہے۔ اس سارے عمل میں وہ کہیں بھی اپنا ذہن Apply نہیں کرتا اس لیے وہ سب سے کم معاوضہ وصول کرتا ہے۔

Mason (معمار) نے اپنے استاد سے فنِ تعمیر سیکھا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اینٹیں کیسے جمائی جائیں گی۔ دیوار کیسے سیدھی رکھی جائے گی۔ دونوں اینٹوں کے درمیان مسالے کی کتنی موٹی تہہ لگائی جانی چاہیے۔ معمار اپنے اس فن کو استعمال کر رہا ہے۔ درحقیقت وہ دو چیزوں سے کام لے رہا ہے ——— ہاتھ اور ذہن۔

آرکیٹیکٹ نے Designing کا علم سیکھا ہے اور وہ اس علم کو استعمال بھی کر رہا ہے۔ اس کا ہاتھ Trained ہے لائنوں کو اپنی جگہ پر رکھنے میں ——— ہاتھوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ذہن بھی Apply کر رہا

جیسے عمارت کا ڈیزائن بناتے ہوئے وہ اپنی حسِ جمالیات (جسے ہم دل کا ذوق بھی کہہ سکتے ہیں) بھی استعمال کر رہا ہے۔ گویا آرکیٹیکٹ اپنے ہاتھ، ذہن اور دل کے ذوق کو استعمال کرتا ہے۔ اگر علاقہ میں زلزلے آتے ہیں یا طوفانی ہوائیں چلتی ہیں تو وہ ان زلزلوں اور طوفانی ہواؤں کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک Building کا Structure بناتا ہے۔ عبادت میں بھی یہی معاملہ ہے۔ جب ہم محض ایک میکانکی انداز میں تسبیح رولتے ہیں جب کہ ہمارا دل اور ذہن کہیں اور ہوتا ہے تو ہمیں اس تسبیح کے بدلے میں صرف ثواب ملتا ہے کوئی اور فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

جب ہم وہی اسمِ الٰہی توجہ لگا کر پڑھتے ہیں تو ہمارے ہاتھ تو تسبیح کے دانے پھیرتے ہیں لیکن ہمارا ذہن اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اس کا فائدہ اور معاوضہ توجہ کی Degree کے مطابق دیا جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق بخش دے کہ اس کے ہاتھ تو تسبیح کے دانے رول رہے ہوں اور اس کا ذہن اس ہستی کی طرف متوجہ ہو جس کا وہ نام پکار رہا ہے۔ اس ذکرِ الٰہی میں اس کا ذوق و شوق بھی ہو یعنی اس کا دل بھی اس میں شامل ہو تو پھر ایک آرکیٹیکٹ کی طرح انسان کو تھوڑی محنت سے بھی بے پناہ معاوضہ عطا ہو جاتا ہے۔

اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر میں یہی کہوں گا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا وظیفہ ہو یا کوئی اور وظیفہ اگر ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھا جائے تو پھر یہاں تک ہونے لگتا ہے کہ انسان چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب پوری توجہ سے رب کو پکارتا ہے اور کہتا ہے:

"اوئے ربّا کتھے آں توں؟"

"او ربّا دھیان کر میرے ول..... کدھر ایں توں؟"

اور رب تعالیٰ اسی ایک جملہ پر نواز دیتا ہے۔

"یا اللہ مدد کر دے، رحم کر دے۔"

اس لیے کہ یہ صدا دل سے نکلتی ہے۔ انسان پوری طرح دل اور ذہن سے متوجہ تھا یہ کہتے ہوئے "یا اللہ! رحم کر دے۔" اس لیے اسے نواز دیا گیا۔

انعام اس بات کا نہیں کہ آپ نے پڑھا کیا؟ انعام اس بات کا بھی نہیں کہ آپ نے کتنی بار پڑھا۔ انعام اس کا بھی نہیں کہ آپ نے کس Time پر پڑھا۔ انعام تو اس پر ہے کہ آپ نے اُسے کتنے درد سے پکارا۔

اگر آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے وظیفے کا پورا فائدہ لینے کے خواہش مند ہیں تو آپ کو اس کی Pre-conditions پوری کرنا ہوں گی اور اس کے بعد اس وظیفے کو ایک آرکیٹیکٹ کی طرح پوری توجہ اور دل سے پڑھنا ہوگا۔ وہ آرکیٹیکٹ جو اپنے پورے ذوق و شوق، مہارت اور Prerequisites کو کام میں لا کر خوبصورت Design بناتا ہے اور یوں پیسہ بھی کماتا ہے، نام اور شہرت بھی۔ Prerequisites اور اسلوب کا خیال رکھے بغیر آپ وظیفے کے ثمرات حاصل نہیں کر پائیں گے۔

پاکستان کے ایک شہر سے ایک صاحب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ 1994-95ء میں وہ اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ یہاں آیا کرتے تھے۔ ہمشیرہ کو Cancer تھا اور ان کو دم کروانے وہ ان کے ساتھ آتے تھے۔ اسی دوران انھوں نے روحانیت کی راہ پر چلنے کا فیصلہ کرلیا اور ایک روز مجھ سے علم کے حصول کی خواہش کا اظہار کیا۔ اب طویل عرصے کے بعد انھوں نے بڑے دردبھرے انداز میں سوال کیا ہے ”کیا روحانیت کی راہ میں مصائب ہی مصائب اور مشکلات ہی مشکلات ہیں؟“

جہاں تک حصولِ علم کی بات ہے تو یہ علم کسی کی میراث تو ہے نہیں۔ اس پر ایک غیر مسلم کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ایک مسلمان کا۔ یوکے میں آنے والے کچھ غیر مسلم لوگوں نے مجھ سے کہا ”ہم اللہ کو اس انداز میں پکارنا چاہتے ہیں جس میں آپ پکارتے ہیں۔“ میں نے کہا ”ضرور پکاریے! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ صرف اسی پکار کا جواب دیتا ہے تو آپ اُسے ہمارے انداز میں پکار لیجیے۔ ورنہ میرا تو یقین ہے کہ میرا رب اتنا وسیع القلب ہے کہ اسے جیسے بھی پکارو وہ جواب دیتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس پکار میں خلوص ہو۔“

تین چار امریکیوں کو میں نے قرآن پاک کی مختلف سورتیں رومن عربی میں لکھ دیں۔ جب وہ انھیں امریکی لہجے میں پڑھتے تو بہت خوبصورت لگتا۔ ایک روز جب میں نے انھیں سورہ اخلاص پڑھتے سنا تو مجھے اتنا اچھا لگا کہ دل میں خیال آیا کہ ان کا سورہ فاتحہ یا اخلاص پڑھنا مجھے اتنا اچھا لگ رہا ہے تو رب تعالیٰ جس کا یہ کلام ہے، وہ ان کی زبان سے اپنا کلام سنتے ہوئے کتنا خوش ہو رہا ہوگا کہ یہ لوگ اسے Proper pronounce بھی نہیں کر پا رہے پھر بھی ذوق و شوق اور محبت و خلوص سے پڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح یہودی اللہ تعالیٰ کے نام پڑھتے ہیں۔ میں نے تورات یا زبور نہیں پڑھی۔ ایک روز چند یہودیوں کے سامنے جب میں نے اللہ تعالیٰ کے وہ نام لیے تو انھوں نے ان ناموں کو Translate کر کے بتایا کہ یہ نام تو ہمارے ہاں بھی ہیں۔ اُن کی بات پر میں کچھ حیران ہوا۔ پھر دعا کے دوران جو نظر ڈالی تو پتا چلا کہ زبور میں باقاعدہ اللہ تعالیٰ کے نام لکھے ہیں یہ اور بات کہ ہم وہ نام عربی میں پڑھتے ہیں جب کہ یہودی وہی نام عبرانی میں پڑھتے ہیں۔

میں تو یہودیوں کو بھی اسمائے الٰہی پڑھنے کو دے دیتا ہوں اور کہتا ہوں ”وہ آپ کا بھی رب ہے، میرا بھی رب ہے۔ وہ تو ان کا بھی رب ہے جو اُسے مانتے ہی نہیں۔“

بدھ مت کے لوگ بھی اللہ کے نام پڑھتے ہیں۔ یہ اللہ کی اپنی صوابدید ہے کہ وہ انھیں اس کا کیا اجر عطا فرماتا ہے۔ رب تعالیٰ کے تمام Pleasant reactions ہماری توقع سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔

صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے وظیفے کا معاملہ نہیں۔ آپ رب تعالیٰ کو کہیں بھی، کسی بھی معاملے کے سلسلے میں جیسے مرضی پکار لیں۔ بنیادی شرط بس یہی ہے... محبت اور خلوص۔

جن صاحب کے خط کا ابتدا میں ذکر ہوا، انھوں نے بھی 1994-95ء میں مجھ سے کسی وظیفے کے بارے میں پوچھا ہوگا اور میں نے انھیں پڑھنے کا کہہ دیا ہوگا۔ بعدازاں میں نوکری چھوڑ کر انڈسٹری کی طرف نکل گیا اور پھر معاملات نمٹانے یوکے چلا گیا اور تین برس تک پاکستان نہ آسکا۔

ان صاحب نے لکھا ہے کہ آپ چونکہ انگلینڈ چلے گئے تھے اور چونکہ اس عرصے میں مجھے گائیڈ کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے میں سلسلہ چشتیہ کے ایک صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

اب انھوں نے یہ لکھا تھا کہ کیا اس راہ میں مصائب ہی مصائب اور تکلیفیں ہی تکلیفیں ہیں۔ میں تو اپریشن کا شکار ہو گیا جس کی وجہ سے کالج سے لیکچر شپ کی ملازمت سے بھی چھٹی ہو گئی۔ اس سوال کا تعلق چونکہ علم سے ہے اس لیے اس کا جواب آپ سب کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ روحانیت کی راہ میں صرف مصائب ہی مصائب اور پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔ پریشانیاں اور مصائب اس لیے در آتے ہیں کہ ہم اپنے طور پر تو یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں دُنیا سے کوئی غرض نہیں لیکن درحقیقت ایسا ہوتا نہیں۔ Somehow or the other, at the back of our mind یہ غرض موجود ہوتی ہے۔ اس کو کلیتہً نکال پھینکنا عموماً انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک لمبی ریاضت اور طویل مجاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں آپ کو ایک مرشد اور گائیڈ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر جب مرشد کسی بات سے سختی سے منع کرتا ہے تو انسان کو بہت بُرا لگتا ہے کہ میں تو اپنا دُکھ لے کر ان کے پاس آیا ہوں اور یہ آگے سے مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ نہیں ہوتی۔ میں بھی کبھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ میں نے اپنے مرشد صاحب سے بہت ڈانٹ کھائی حتیٰ کہ دو بار تو انھوں نے بڑے باعزت طریقے سے مجھے حجرے سے نکال دیا "نکل جاؤ یہاں سے——دوبارہ نہ آنا۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی اور باہر نکل کر گلی کے کونے پر جا کھڑا ہوا۔ پانچ منٹ بعد انھوں نے کسی کو بھیجا کہ جاؤ بلا لاؤ اس کو گلی کے کونے پر کھڑا ہوگا۔

یہ ڈانٹ ڈپٹ نہیں ہوتی بلکہ انسان کو سیدھی راہ پر رکھنے کی کوشش ہوتی ہے تاکہ انسان اپنے Track سے Derail نہ ہونے پائے۔ ورنہ ہوتا یہی ہے کہ انسان اپنی خواہشات اور وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے کہ میرے پاس تو روٹی ہی نہ رہی کھانے کو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں غلط پڑھ رہا ہوں کہ آتا ہوا رزق بھی رُک گیا ہے۔

بالکل ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ہم ایسے موقع پر ذرا Recall کر لیا کریں کہ ہم نے قرآن پاک میں کیا پڑھا تھا تو معاملہ سمجھ آ جائے گا۔ جس کیفیت سے ہم گزر رہے ہیں اس کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں قرآن پاک میں موجود ہے۔

جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں "اے اللہ تعالیٰ! ہم تیرے ہیں اور تو ہمارا ہے" تو ایسے لوگوں کو اللہ ضرور آزماتا ہے۔ وہ دیکھنا یہ چاہتا ہے کہ یہ بندہ کتنا کھرا ہے۔ یہ اپنے دعویٰ میں کتنا سچا ہے۔ اللہ بندے کو وہاں وہاں سے آزماتا ہے جہاں جہاں اُسے سب سے زیادہ دُکھ اور تکلیف پہنچتی ہے۔ پھر رب تعالیٰ دیکھتا ہے کہ کیا بندہ اس تکلیف کے باوجود بھی مجھے اسی خلوص اور محبت سے پکار رہا ہے یا گلے شکوے پر اتر آیا ہے۔

یاد رہے کہ گلہ شکوہ صرف یہی نہیں ہے کہ ہم اللہ کو چٹھی لکھیں یا ٹیلی فون کریں "یا اللہ! یہ کیا کر رہا ہے تو؟" اگر میں کسی غیر اللہ کے پاس روز جا رہا ہوں اور جا کر کہتا ہوں "صاحب! میرے بیٹے نے بہت محنت کی

تھی لیکن وہ فیل ہو گیا۔ دعا کر دیجیے کہ وہ پاس ہو جائے۔" میرے نزدیک یہ بھی گلہ شکوہ ہے۔

بات یہ ہے کہ جب مجھے یہ یقین ہے کہ میرا رب کسی کی محنت اپنے ذمہ نہیں رکھتا، ہر شخص کی محنت کا انعام اس کی محنت سے کہیں زیادہ عطا کرتا ہے تو پھر مجھے یہ شک کیوں ہوا کہ میرے بیٹے نے محنت کی لیکن پھر بھی وہ فیل ہو گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں اپنے رب تعالیٰ کے وعدہ پر شک کر رہا ہوں۔ اگر میرا اللہ پر پختہ یقین ہے تو یہ شبہ تو میرے ذہن میں پیدا ہونا ہی نہیں چاہیے بلکہ میرے Trained ذہن کو ایک Automatic process کے تحت یہ واضح کر دینا چاہیے کہ ضرور تمہارے بیٹے کی محنت میں کوئی کسر تھی کہ وہ پاس نہ ہو سکا۔ ورنہ میرا رب تو اتنا مہربان ہے کہ وہ تھوڑی سی محنت کا بھی بے پناہ اجر عطا فرماتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے بیٹے نے محنت کی اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کیوں کہ یہ رب تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔ یہ بات اور نکتہ سمجھ میں آنے کے بعد میں اپنے بیٹے کے فیل ہو جانے پر کسی صاحب دعا کے پاس دعا کروانے نہیں جاؤں گا۔

اگر میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے، اس کا ہر فیصلہ میرے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر میری اولاد دو دن کے فاقے سے ہے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میں کسی کے پاس جا کر یہ کہوں "صاحب! دعا کر دیجیے کہ میری فاقہ زدہ اولاد کو اللہ تعالیٰ رزق عطا فرما دے۔" گویا (معاذ اللہ) میں رب تعالیٰ کے رزاق ہونے پر شک کر رہا ہوں؟ معاذ اللہ مجھے یہ شک ہے کہ رب تعالیٰ کا کوئی فیصلہ میرے مفاد کے خلاف ہو گیا ہے۔ اگر میرا ذہن پوری طرح Trained ہے اور میرے مرشد نے مجھ پر محنت کی ہے تو میں یہ سب کبھی کسی سے کہنے نہیں جاؤں گا۔

اگر میری ٹرانسفر بلوچستان کے کسی دور افتادہ گاؤں میں ہو گئی جہاں آبادی اور پانی کا نام و نشان بھی نہیں تو بھی میں شکوہ زبان پر نہیں لاؤں گا۔ اب تو بلوچستان میں آبادی بہت ہو گئی لیکن 1974ء میں میں سرکاری ڈیوٹی کے سلسلے میں جب میں وہاں گیا تھا تو سوائے چٹانوں کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جہاں ایران اور پاکستان کے بارڈرز ملتے ہیں وہاں دو ہی دو ٹینوں کے ہوٹل تھے جن میں میل سے سیاہ ہوئے بنچ پڑے ہوتے تھے اور ان پر مکھیوں کا بستر ہوتا تھا کہ بنچ پر بیٹھنے کے لیے مکھیوں کو باقاعدہ ہاتھ سے اڑانا پڑتا تھا۔

اب ایسے علاقے میں اگر ٹرانسفر ہو جائے تو میں اپنے Boss کے پاس دوڑا دوڑا جاؤں گا۔ "یہ آپ نے میری ڈیوٹی کہاں لگا دی۔ وہاں تو پانی تک نہیں ہے۔ میں پیوں گا کیا؟ میرا کیا ہو گا وہاں؟" لیکن اگر میرا یہ ایمان ہے کہ رب تعالیٰ کا ہر فیصلہ میرے بہترین مفاد میں ہے تو پھر میں اس ٹرانسفر کو بھی خوشی خوشی قبول کرتے ہوئے کہوں گا "صاحب! میں ضرور جاؤں گا بلوچستان۔"

جب ذہن کی Training ہو جاتی ہے اور دل میں ایمان پختہ ہو جاتا ہے تو رب تعالیٰ وہاں بندے کو آزما رہا ہوتا ہے۔ علم حاصل کرنے کی راہ میں درحقیقت یہ دقتیں نہیں ہیں بلکہ Training کا ایک حصہ ہیں۔

اللہ کا پسندیدہ معیار

سوال: فقیر، صوفی اور پیر سے کیا مراد ہے؟

جواب: جب کوئی شخص تصوف کی راہ پر چلنا شروع کرتا ہے تو وہ ایک مخصوص پروگرام پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔ یہ کوئی Written پروگرام نہیں ہوتا لیکن مربوط ضرور ہوتا ہے۔ اس مربوط پروگرام پر عمل کرتے ہوئے وہ اپنی عادات، طور طریقوں، خواہشات اور نفس کو Mould کرتا جاتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے طے کردہ معیار کے مطابق ہو جائے۔ اگر وہاں تک نہ بھی پہنچ پائے تو کم از کم اُس کے قریب ضرور چلا جائے۔

اللہ کا پسندیدہ معیار کیا ہے؟

اللہ ہم سے بندگی چاہتا ہے۔ بندگی سے پہلے Total surrender کا مقام آتا ہے۔ Total surrender سے مراد ہے 'اطاعت'۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کرتا ہے تو پھر وہ بندگی کے درجے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ جب انسان رُوحانیت کی راہ پر چلتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے Total surrender سے اس راہ کی ابتدا کرتا ہے۔ وہ Total surrender یوں کرتا ہے کہ اللہ کے احکامات کو ماننے کے سلسلے میں وہ "کب، کیوں، کیسے" جیسے الفاظ اپنی ڈکشنری سے نکال دیتا ہے اور Blindly اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرتا چلا جاتا ہے۔

عمل کے ضمن میں سب سے بڑی Resistance (مزاحمت) نفس کی طرف سے آتی ہے۔ پھر انسان کی عادات اور خواہشات بڑی شدت سے رکاوٹ بنتی ہیں جنھیں دبانے کی کوشش میں بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ آپ میں ایک Change آ رہی ہوتی ہے اور جو لوگ آپ کی ایک Certain self کے عادی ہیں وہ آپ کو بدلا ہوا دیکھتے ہیں تو Resist کرتے ہیں حتیٰ کہ مختلف آوازیں آپ پر کسی جاتی ہیں۔ رُوحانیت کی راہ پر چلنے سے پہلے حلال و حرام کی تمیز نہ تھی۔ پیسے کو سینے سے لگا کر رکھتے تھے۔ دنیاوی اشیا سے محبت تھی لیکن اس راہ پر چلنے کے بعد انسان ان سب چیزوں کی نفی کرنے لگتا ہے اور نتیجتاً مالی مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے، راتوں کو نیند پوری نہیں ہوتی۔ وہ خلقِ خدا کی زیادتیوں پر خاموش رہتا ہے جس کا خلقِ خدا فائدہ

اضافی ہے اور یوں انسان کی زندگی دشوار تر ہونے لگتی ہے۔ غرض انسان ہر لحاظ سے مشکلات میں گھر جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ روحانیت کی راہ پر قدم رکھنے کے بعد انسان حقوق العباد پوری طرح سے ادا کرنے لگتا ہے۔ عبادات میں بھی زیادہ وقت صرف ہونے لگتا ہے۔ یہ سب مشقتیں اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے:

''وہ راہی جو تصوف کے سفر میں صعوبتیں اور مشقتیں اٹھاتا ہے اور فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کا بوجھ بھی اٹھائے ہوتا ہے، وہ فقیر ہے۔''

جب یہ فقیر علم کے ایک خاص مقام پر جا پہنچتا ہے اور علم کی ایک خاص منزل حاصل کر لیتا ہے تو رب تعالیٰ اس سے نوافل کا اضافی بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ پھر وہ صرف فرائض ادا کرتا ہے۔ اس مقام پر ضروریاتِ زندگی کا حصول اس کے لیے آسان کر دیا جاتا ہے اور بندگی اس کے لیے سہل کر دی جاتی ہے۔ یہ 'صوفی' کا مقام ہے۔

جب صوفی کو علم حاصل ہونے کے بعد مومن کی فہم و فراست اور عقل و دانش عطا کر دی جاتی ہے تو وہ پیر کا مقام ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت مختلف درجے ہیں۔ پہلے انسان فقیر بنتا ہے۔ وہ محنت کرتا ہے یا آسان لفظوں میں کہہ لیجیے کہ وہ Investment کرتا ہے اور جب اس Investment کے Results آنے لگتے ہیں اور Profit ملنا شروع ہوتا ہے تو یہ صوفی کا مقام ہے۔ جب اس Investment پر Profit کے ساتھ Bonus بھی ملنے لگتا ہے تو وہ پیر کا مقام ہے۔ پیر کے ذمے لوگوں کی راہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی راہ لوگوں کو دکھانے لگتا ہے۔ وہ گدی نشین نہیں ہوتا کیوں کہ جو گدی پر بیٹھ گیا وہ پھر راہنمائی نہیں کر پاتا۔ وہ خدمت کرانے لگتا ہے اور جس کو خدمت کرانے کی عادت پڑ جائے وہ کبھی اچھا راہنما نہیں ہوتا۔ کیوں کہ راہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی اپنی شخصیت ویسی ہو جیسی شخصیت وہ دوسروں کو عطا کرنا چاہتا ہے۔ جس راہ پر وہ دوسروں کو لے کر جانا چاہتا ہے وہ اس راہ پر لوگوں کو چلتا دکھائی دے گا تو لوگ اس کی پیروی کریں گے۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے اس لیے فقیر اور درویش جو پیری کے مقام پر پہنچے ہوتے ہیں ان کی اپنی زندگی اس Pattern سے قطعی طور پر مختلف نہیں ہوتی جس Pattern of life کی طرف وہ لوگوں کو بلا رہے ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ کوئی شخص فقیر ہے۔ یاد رہے کہ فقیر دو طرح کے جھوٹ کے درمیان لپٹا ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو کچھ نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ وہ بہت کچھ ہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو بہت کچھ ہیں اور کہتے ہیں میں کچھ نہیں۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔

جب آپ کسی کو یہ کہتے سنیں ''میں بہت کچھ ہوں، میں قطب کے مقام پر ہوں۔ میرے پاس کرامات ہیں۔ میری کرامت سے فلاں شخص ٹھیک ہو گیا۔ فلاں کام ہو گیا۔'' تو سمجھ جائیں کہ وہ شخص بالکل خالی ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آپ کو یہ کہتا ملے ''مجھے تو پتا ہی نہیں کہ تصوف کیا ہوتا ہے؟ ولایت کیا ہوتی ہے؟ میں ان چیزوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں'' جان لیجیے کہ وہ درحقیقت بہت کچھ ہے۔

جب انسان کے پاس علم مقدار میں کم ہوتا ہے تو اس کا Mental horizon بہت Limited ہوتا ہے اور یوں تھوڑا علم بھی اسے زیادہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ جوں جوں علم بڑھنے لگتا ہے اس کا Mental horizon بھی Broad ہونے لگتا ہے۔ جوں جوں اس کے ذہنی افق میں وسعت آتی ہے توں توں اسے ادراک ہوتا ہے کہ علم کا سمندر تو بے حد وسیع ہے اور میرے پاس تو علم بہت محدود اور کم ہے۔ تب وہ اپنے آپ کو چھوٹا کہنے لگتا ہے۔

آپ بڑے نامور پروفیسرز اور سینئر ڈاکٹرز سے پوچھ لیجئے وہ کبھی دعویٰ نہیں کریں گے کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ وہ فوراً آپ سے کہیں گے "صاحب! اناٹومی بہت مشکل مضمون ہے۔ ابھی تک انسان اسے 15-20 فی صد سے زیادہ Explore نہیں کر پایا۔ ہمارا Knowledge تو اس بارے میں بہت کم ہے۔ ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے۔" یوں وہ اپنی کم علمی کا اظہار و اعتراف کریں گے اور یہی ان کے بڑے پن کی علامت ہے۔ اسی طرح تصوف کی راہ میں کسی شخص کو جتنا علم حاصل ہوگا وہ اتنا ہی عاجز دکھائی دے گا۔

سوال: علم کی وسعت کے ساتھ اس کی Retention بھی بہت ضروری ہے جو عمر میں اضافے کے باعث کم ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ قرآن پاک کی ایک آیت کے مفہوم کے مطابق بڑھاپے میں انسان بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور اس کی یادداشت بچوں جیسی ہو جاتی ہے۔ Knowledge کو Retain کیسے کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اگر میں روزانہ اپنے کپڑے خریدوں تو میری وارڈروب وسیع ہوتی چلی جائے گی۔ اسی طرح اگر میں اپنے بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کراؤں تو اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا لیکن علم کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بڑھتا اور جمع ہوتا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ علم کا کوئی مادی جسم نہیں ہوتا۔ آپ نے کلاس ون سے پڑھائی شروع کی اور کلاس Six سے انگریزی پڑھنا شروع کی۔ چودہ جماعتیں پاس کر لینے کے بعد اگر آپ اپنے قد کی پیمائش کریں یا جسم کو تولیں تو اس علم کی وجہ سے نہ تو آپ کے وزن میں اضافہ ہوا اور نہ ہی قد میں کوئی فرق پڑا۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتے "صاحب! میں نے تو علم حاصل ہی نہیں کیا کیونکہ میرے قد اور وزن میں سے کسی ایک میں بھی اضافہ نہیں ہوا۔" لیکن ذرا غور کیجئے کہ جب آپ کلاس Six میں تھے تو انگریزی کا ایک جملہ نہ لکھ سکتے تھے لیکن جب آپ نے تعلیم مکمل کی اور کاروباری دنیا میں قدم رکھا تو کاروباری خطوط انگریزی میں بڑی مہارت سے ڈرافٹ (Draft) کرنے لگے۔ آپ نے کچھ سیکھا تو اس کام پر قادر ہوئے۔

بچپن میں آپ خشک بالوں میں کنگھا پھیر کر اس کنگھے سے کاغذ کے ننھے ٹکڑے اٹھایا کرتے تھے۔ تب آپ کے نزدیک یہ ایک Magic (جادو) تھا۔ لیکن کلاس Eight میں پڑھائی کے بعد آپ کو پتا چلا کہ یہ تو دراصل Static charge ہے جو پلاسٹک کا کنگھا بالوں میں پھیرنے سے Create ہو جاتا ہے۔ اگر میں اس کنگھے پر انگلی رکھ دوں تو یہ Static charge فوراً Discharge ہو جائے گا اور کاغذ کے ٹکڑے اٹھانا ناممکن ہو جائے گا۔

اس طرح FSc میں نیوٹن کے Laws of Motion کے بارے میں پتا چلا اور معلوم ہوا کہ Actions اور Reactions کیا ہوتے ہیں؟ بطور نتیجہ آج جب آپ مختلف مشینوں کے Functions دیکھتے ہیں تو آپ کو پتا چل جاتا ہے کہ فلاں میکنزم (Mechanism) کے تحت یہ مشین کام کر رہی ہے۔ یہ سب جو آپ نے سیکھا تو جانا۔ بغیر سیکھے آپ یہ سب نہیں جان سکتے تھے۔ علم آپ نے Retain کیا تو آپ نے یہ سب جانا۔

اصل چیز جو آپ Refer کر رہے ہیں وہ Knowledge نہیں بلکہ Memory ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی Brain کے اندر یہ سسٹم (System) رکھا ہے کہ جو تفصیلات Lesser Important ہوں ان کو یہ System بند (Shut off) کرتا چلا جاتا ہے۔ صرف Jist of theories اور Systems باقی رہ جاتا ہے۔ اسے ہم کہتے ہیں "سمجھنا"۔

آپ جس Knowledge کی بات کر رہے ہیں وہ دراصل "رٹا" ہے۔ ایک کتاب میں نے Memorise کی اور امتحان میں بیٹھ کر اسے Reproduce کر دیا۔ بہت اچھے Marks حاصل کیے اور اس کے بعد میں Blank ہو گیا۔ جب میں نوکری کے لیے جاتا ہوں تو Personnel Manager کہتا ہے کہ آپ نے Masters تو First Division میں کیا ہے جب کہ آتا جاتا آپ کو کچھ بھی نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ وہاں میں نے علم "حاصل" نہیں کیا بلکہ محض اسے "یاد" کیا اور "رٹا" لگایا تھا۔ "رٹے" کے سلسلے میں تو یہ بات درست ہے کہ بیس پچیس سال بعد ہمیں یاد نہیں رہے گا کہ ہم نے کئی سال پہلے کیا "رٹا" تھا لیکن جو علم آپ نے مدتوں پہلے سیکھا تھا وہ آج بھی آپ کو یاد ہوگا۔

علم "سیکھنے" اور "رٹنے" میں یہی فرق ہے کہ جب کوئی علم کو محض رٹے گا اور کتابوں کو Memorise کرے گا تو کچھ عرصے بعد علم بھول جائے گا لیکن جب سیکھے گا تو علم یاد رہے گا۔ قرآن پاک کا جو حوالہ آپ نے دیا وہ بہت معتبر ہے لیکن قرآن پاک ایسی اعلیٰ کتاب ہے کہ جس کے ظاہری معنی سے تقریباً ہم بھی لوگ واقف ہوتے ہیں لیکن اس کے مخفی معنی بھی ہیں جنہیں ہر شخص اپنے مقام اور درجے کے مطابق سمجھتا ہے۔

آپ نے جو حوالہ دیا کہ عمر کے ایک دور میں بوڑھے اور بچے کی یادداشت ایک جیسی ہو جاتی ہے اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس بوڑھے نے ساری زندگی جو علم حاصل کیا وہ رائیگاں چلا گیا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ تو Life cycle ہے کہ جو بچہ آج پیدا ہوا وہ جوان ہوا اور پھر اس کا زوال شروع ہو جائے گا۔ عمر ڈھلے گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کی عادات بالکل بچوں کی سی ہو جائیں گی۔ وہ بچوں کی مانند ذرا سی بات پر ناراض ہو جائے گا ضد کرنے لگے گا۔ اس کی عادات و مزاج میں تبدیلی ضرور آئے گی لیکن ایسا نہیں کہ اس عمر میں اس کا علم اس سے چھن جائے گا۔

سوال: زندگی میں ایک Phase آتا ہے آزمائشوں اور مشکلات کا۔ اس میں رزق میں کمی آجاتی ہے، گھریلو پریشانیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں آپ فرماتے ہیں کہ اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہیے لیکن یہ کیسے پتا چلے کہ یہ Phase آزمائش ہے یا غلطیوں کی سزا؟

جواب: اللہ نے خود فرمایا ہے:

"اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچی تو وہ لوگ بھی ویسی ہی تکلیف پا چکے ہیں اور
یہ دن ہیں جن میں ہم نے لوگوں کے لیے باریاں رکھی ہیں۔"

(سورۃ آل عمران:140)

مراد یہ ہے کہ اچھے اور برے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو شخص آج اچھے حالات سے گزر رہا ہے اُسے برے دور سے بھی گزرنا ہوتا ہے۔

دوسرے غلطیوں کی سزا کی جو بات آپ نے کی ہے تو یہ دنیا عالم الاسباب ہے۔ ہر چیز کا ایک سبب اور وجہ ہے حتیٰ کہ موت کا بھی ایک بہانہ اور وجہ بن جاتی ہے۔ حالاں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ موت اٹل ہے اور ایک روز ہر ایک کو موت کا ذائقہ ضرور چکھنا ہے لیکن اس موت کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنتا ہے۔

اسی طرح جب ہم مشکل Phase میں جاتے ہیں تو اس کی بھی کوئی وجہ ضرور بنتی ہے۔ اللہ اپنے ذمہ کچھ نہیں لیتا۔ خود رب تعالیٰ نے فرمایا:

"اور جو پڑے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اُس کا جو کمایا تمہارے
ہاتھوں نے۔" (سورۃ الشوریٰ:30)

باقی رہ گئی بات کہ برے وقت پر بھی راضی بہ رضا رہنا چاہیے اور اسے بھی خوشی تسلیم کرنا چاہیے۔ اگر ہم اصولی طور پر انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو سمجھ آ جائے گی کہ اگر اچھے دنوں کو میں نے ہنستے کھیلتے ہوئے گزارا ہے تو ان برے دنوں کو کیا میری جگہ کوئی اور آ کے گزارے گا۔ اب یہ مجھ پر ہے کہ میں ان مشکل دنوں کو چاہے ہنس کر گزار دوں یا پھر رو کر بسر کروں۔۔۔۔ اگر رو کر گزار دوں گا تو اللہ تعالیٰ کا ناشکر گزار بندہ کہلاؤں گا۔ جب اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی نعمتوں کی بارش کر رہا تھا تب میں خوش تھا اور آج ذرا نعمتیں کم ہوئی ہیں تو میں ہاہا کار مچائے ہوئے ہوں۔ کبھی کسی کے پاس تو کبھی کسی کے پاس دعا کرانے جا رہا ہوں۔ یہ در حقیقت میں Indirectly رب تعالیٰ کا گلہ شکوہ کر رہا ہوتا ہوں۔ جب ایک Phase میں سے گزرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ میں اسے بھی خوشی گزاروں اور شکر گزار بندہ کہلاؤں تاکہ رب بھی راضی ہو جائے اور دنیا بھی میرے صابر ہونے کی تعریف کرے۔ برے دنوں میں ایسا رویہ اپنا کر رب تعالیٰ کی خوشنودی اور دنیا کی تحسین دونوں چیزیں مجھے حاصل ہو جائیں گی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جب کسی شخص کو پھانسی کی سزا ہوتی ہے اور اسے تختہ دار کی طرف لے

جا رہا ہوتا ہے تو وہ عموماً رو رہا ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص بھی ہے جسے ساری دنیا نے زرا اعلا کہا یہاں تک کہ اسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی لیکن تختہ دار کی طرف جاتے ہوئے اس کے چہرے پر کوئی تردد تھا اور نہ ہی Body language میں کوئی پریشانی۔ وہ یوں گپ شپ کرتا اور ہنستا مسکراتا آگے بڑھ رہا تھا جیسے کسی Picnic پر جا رہا ہو۔ پھانسی گھاٹ پر پہنچ کر اس نے خود کہا کہ یہ پھندا میرے گلے میں ڈال دو۔ اس شخص کی اس ایک ادا اور ایک حرکت کی وجہ سے میں نے ساری دنیا کو اس کی تعریف کرتے دیکھا حتیٰ کہ اس کا بدترین دشمن صدر بش تک یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

He is such a brave man.

اگر انسان بُرے وقت کو اسی حوصلے کے ساتھ ہنستے کھیلتے ہوئے گزار دے تو اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور دنیا بھی ایسے شخص کو سراہتی ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص رُوحانیت کی راہ پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو تو کس Stage پر اسے مرشد کی ضرورت پڑے گی؟

جواب: میری Understanding کے مطابق رُوحانیت کی راہ پر قدم رکھتے ہی ایک ایسے Guide کی ضرورت پڑتی ہے جو ان راہوں پر چلا ہوا ہو اور تمام Blind corners, Steep slopes, Pitfalls سے اسے آگاہ کرتا رہے۔

اس ضمن میں ایک بہت اہم سوال ہے وہ یہ کہ آپ جس شخص (گائیڈ) کے پاس جا کر بیٹھنا اور علم حاصل کرنا چاہیں گے وہ آپ سے یہ سوال ضرور کرے گا کہ آپ اس راہ پر کیوں جانا چاہتے ہیں؟ اس راہ میں ایک زبردست خدشہ یہ رہتا ہے کہ رُوحانیت کی راہ پر چلنے کے خواہش مند لوگوں میں سے 99.9 فی صد لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مختلف کتابوں سے اولیاء اللہ کی ماورائے فطرت قوتوں اور کشف و کرامات کے قصے پڑھ کر متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے شعور یا تحت الشعور میں کہیں یہ بات ہوتی ہے کہ جب ہمیں بھی یہ قوتیں حاصل ہو جائیں گی تو ہمارے دنیاوی کام آسانی سے ہونے لگیں گے۔ ہم عیش کریں گے۔ لوگ ہماری عزت کریں گے اور ہمیں سلام کرنے لگیں گے۔

مختصر لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ رُوحانیت کی راہ پر چلنے کے شوق کے پس پردہ درحقیقت دنیاوی فوائد کا حصول ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس راہ میں دقتیں پیش آتی ہیں تو وہ برا بھلا کہہ کر یہ راہ چھوڑ دیتے ہیں۔

آپ رُوحانیت کی راہ پر چلنے کے لیے جس گائیڈ کے پاس بھی جا کر بیٹھیں گے اگر Genuine شخص ہے تو آپ سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ آپ اس راہ پر کیوں جانا چاہتے ہیں؟ اگر تو مقصد قربِ الٰہی اور اللہ کی رضا کا حصول ہے تو پھر جان لیجیے کہ اس میں بے شمار دقتیں آئیں گی۔ ان کو ذاتی طور پر پہلے سے قبول کر

پیچھے۔ اس کے بعد جب آپ اس راہ پر قدم رکھیں گے تو واپس نہیں پلٹیں گے۔

سوال: بڑے شاہ صاحب (سید یعقوب علی شاہ صاحب) لوگوں کو باقاعدہ طور پر بیعت کرنے سے Avoid کرتے تھے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: بڑے شاہ صاحب سے میری کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی۔ کبھی اتنی ہمت ہی نہ ہوئی کہ ان سے کوئی ایسا سوال کر لیتا لیکن گمان غالب ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ چیز ہوگی کہ وہ جس آدمی کو بھی بیعت کریں گے اور اپنا شاگرد بنائیں گے، اس کی تربیت کی ذمہ داری اُن پر آ جائے گی۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ ہر آدمی کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے اس لیے وہ زیادہ لوگوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ صرف گنتی کے دو چار لوگ اُن کے پاس جاتے تھے۔

نشست نمبر 23

نکتہ ہائے...

سوال: اللہ ھو کے اثرات کیا ہیں؟

جواب: رُوحانیت کے دس درجات ہیں۔ اس کی Graduation خواہ کسی بھی انداز میں کی گئی ہو درجات دس ہی رہتے ہیں۔ جیسے سلسلہ چشتیہ میں 100 درجے گنے جاتے ہیں لیکن Graduation دس ہی کی ہے۔ ایک، دس، بیس، تیس ---- یوں درجات دس ہی بنتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آگے ہر درجے میں Sub-division ہوتی ہے جیسے سلسلہ قادریہ میں 50 درجے ہیں اور Graduation پانچ، پانچ کی ہے۔

مختلف اوراد و اذکار جو ہم رُوحانیت کے حصول کے لیے کرتے ہیں ان کا اپنا اپنا مقام ہے۔ کچھ الفاظ کا ورد اگر ایک مخصوص انداز، طریقے، وقت اور Environment میں ایک خاص عرصے تک کیا جائے تو انسان ولایت کے تیسرے درجے میں داخل ہو جائے گا۔

سورۂ بقرہ کی ابتدا الم سے ہوتی ہے۔ اس کا ذکر بھی انسان کو ولایت کے تیسرے درجے میں لے جائے گا۔

اسی طرح کچھ الفاظ انسان کو رُوحانیت کے پانچویں درجے تک لے جاتے ہیں۔

اللہ ھو کا تعلق رُوحانیت کے ساتویں درجے سے ہے۔ اگر اسے تمام Prerequisites اور Pre-conditions پوری کرنے کے بعد پڑھا جائے تو یہ ولایت کے ساتویں درجے تک لے جائے گا اور اس سے قلب بھی جاری ہو جائے گا۔

قلب جاری ہونا بہت مزے اور دکھاوے کی بات ہے۔ ساری دُنیا سمجھتی ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے خاموش بیٹھا ہے لیکن اُس کا دل اللہ ھو، اللہ ھو کا ذکر کیے جا رہا ہے۔ ساری محفل یہ ذکر سن کر متاثر ہو رہی ہے۔ ایسے میں ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم ولایت کی طرف جا رہے ہیں کیوں کہ اندر کہیں یہی خواہش ہوتی ہے کہ ولایت کے حصول کے بعد لوگ ہمیں نیک سمجھیں، ہمارے ہاتھ چومیں اور ہمیں سلام کریں۔ اس لحاظ سے اللہ ھو کا یہ ذکر بہت لطف کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ قلب کا جاری ہونا دکھاوے کے لیے بہت

لاوا مدتج ہے۔

اگر کسی انسان کا قلب بہت سخت ہو گیا ہے اور روحانیت اس پر اثر نہیں کر رہی، جس طرح کلر زدہ زمین پر جتنی بھی اچھی نسل کا بیج بو دیا جائے، فصل نہیں اگتی، اسی طرح بعض اوقات انسان کا دل اتنا سخت ہو چکا ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی نیکی اس میں گداز پیدا نہیں کر پاتی۔ دل میں گداز ہونے کے لیے اس کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ دل کی Softening اسم اللہ ھو سے ہوتی ہے۔ اگر دل پر اللہ ھو کی ضرب لگائی جائے تو اس میں گداز پیدا ہو گا جو علم لدنی حاصل کرنے کی بنیادی Requirement ہے۔ اس کے بغیر تصوف میں داخل ہونا ممکن نہیں۔

جب بھی کوئی شخص تصوف میں داخل ہوتا ہے تب قدرت کی طرف سے کچھ ایسا انتظام ہوتا ہے کہ مصیبتیں دوڑ دوڑ کر اس کی راہ میں آتی ہیں۔ جو لوگ پہلے سلام کیا کرتے تھے اب وہی طعنے دینے اور باتیں بنانے لگتے ہیں۔ چاروں طرف انسان کے خلاف پراپیگنڈا ہونے لگتا ہے۔ پھر ایسے میں حکم یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ سنو، خاموش اور مسکراتے رہو۔ جب انسان سب کچھ سنتا اور اسے اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے تو ان طعنوں اور چرکوں کا درد سوا ہو جاتا ہے۔ اس دکھ کو ضبط کرتے کرتے اس کے دل میں گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہل کے ذریعے زمین جتنی گہری پھاڑی جائے فصل اتنی ہی اچھی ہوتی ہے اسی طرح انسان کے دل پر جتنے گہرے چرکے لگتے ہیں، جتنے زیادہ وہ زخم کھاتا اور انھیں برداشت کرتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کے دل میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ اسی قدر اس پر علم اترتا اور تیزی سے جذب ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ اولیائے کرام کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو پہلے عشقِ مجازی میں مبتلا ہوئے اور اس عشق کی معراج تک پہنچے۔ پھر رب تعالیٰ نے اس میں انھیں ناکام کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا دل خون کے آنسو رویا اس پر انھیں حکم یہ تھا کہ اس دکھ کو ضبط کر سہنا ہے اور یہ اظہار تک نہیں ہونے دینا کہ مجھ پر کیا بیتی۔ ضبط کی اس انتہا پر ان کا دل زخمی اور پارہ پارہ ہوا۔ ایسی حالت میں جب علم وہاں اترا تو پھر انھوں نے بے پناہ روحانی ترقی کی۔ ایسے اولیا اللہ جو عشقِ مجازی میں ناکامی کے بعد عشقِ حقیقی کی راہ پر چلے انھیں بہت بلند مقام حاصل ہوا۔

رب تعالیٰ کی طرف لو لگانے سے جو سکون ملتا ہے یہاں اس کی ایک دنیاوی مثال دے رہا ہوں۔ ایک صاحب اس قدر تکلیف میں تھے کہ کسی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تک انھیں نصیب نہ ہوتا، چاروں طرف لو ہی لو چل رہی تھی۔ کبھی کہیں سے کوئی اچھی خبر سننے کو نہ ملتی۔ جب بھی دوستوں سے ملتے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہوتیں۔ آئے روز ایک نئی آفت کی کہانی سناتے۔ ایک روز دوستوں نے دیکھا کہ مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ پوچھنے لگے "آج کیا ہو گیا؟" وہ صاحب بولے "آج نیا جوتا خریدا تھا وہی کاٹ رہا ہے۔" دوستوں نے کہا "دیکھ کر خریدنا تھا۔ تم بھی کمال کرتے ہو۔ مصیبتیں مول لینے والے ہو۔" وہ صاحب بولے "میں نے جان بوجھ کر ایک نمبر چھوٹا جوتا خریدا ہے۔" دوستوں نے حیرت سے استفسار کیا "وہ کیوں؟" وہ

صاحب بولے "بات یہ ہے کہ زندگی میں مجھے کہیں بھی سکون نہیں ملا۔ یہ Undersized shoe میں سارا دن پہن کر چلتا رہتا ہوں اور یہ کاٹ کاٹ کر بے حال کر دیتا ہے لیکن جب شام کو میں اس جوتے سے پاؤں باہر نکالتا ہوں تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ میں اسی میں خوش ہو جاتا ہوں۔"

بعض دفعہ جب انسان اتنا دکھی ہو کہ ہر طرف لو کے تھپیڑے ہوں۔ ایسے میں جب وہ اللہ سے لو لگاتا ہے تو اُسے بڑا سکون ملتا ہے۔ وہ رب کی طرف دوڑنے لگتا ہے تاکہ وہ ہر لمحہ اُسے یاد کرے اور سکون کی کیفیت میں رہے۔ یوں وہ روحانیت کی راہ پر چلتا جاتا ہے اور اس میں ترقی پاتا جاتا ہے۔

اللہ ھو کا مقام یہی ہے کہ ایسا دل جو انتہائی سخت ہو اگر اس پر اللہ ھو کی ضرب لگائی جائے تو دل نرم ہو جائے گا اور اس میں گداز پیدا ہو جائے گا۔ اگر اس کا مسلسل ورد کیا جائے تو انسان ولایت کے ساتویں درجے تک جا پہنچتا ہے۔

سوال: اللہ ھو کی ضرب لگانے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: جب آپ 'اللہ' کہیں گے تو سانس اندر آئے گا اور پھیپھڑوں میں بھر جائے گا۔ 'ھو' میں ایک جھٹکے سے ہم سانس کو باہر نکال دیں گے۔ اثبات دنگی کی ضرب کی طرح اللہ ھو کی ضرب لگا کر دل کو گداز کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بہتر ہے کہ یہ ضرب کسی صاحب علم کی زیرِ نگرانی لگائی جائے۔ بغیر نگرانی کے ضرب لگانے سے قلب کمزور ہو جاتا ہے۔ جب آپ کو اس میں پریکٹس ہو جائے تو تب Independently ضرب لگائیں۔

جس طرح سریع الاثر دوائی یا Life-saving drugs کو ڈاکٹر کی ہدایت کے بغیر استعمال کیا جائے تو بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہو سکتا ہے اور انسان موت کے منہ میں پہنچ سکتا ہے۔ اللہ ھو کا ذکر جس قدر اہم شے ہے اس کی Prerequisites کا اگر خیال نہ رکھا جائے تو قلب کمزور ہو جائے گا۔ اس لیے یہ ذکر کرتے ہوئے انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔

سوال: کیا کشف میں بزرگ ہستیوں سے ملاقات کے وقت سوال و جواب ہو سکتے ہیں؟

جواب: سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کشف ہے کیا۔ کشف کے معنی ہیں 'کسی چیز کا کھل جانا'۔ جب کوئی شخص اللہ کی راہ پر چلتا ہے، اس کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس پر انعامات کی بارش کرتا ہے اور اس کا ہو جاتا ہے۔ تب اُسے انعام کے طور پر عجائبات عالم کی سیر کراتا ہے۔ یہی کشف کی ابتدا ہے۔

جس قدر رب تعالیٰ چاہتا ہے اسی قدر اسرارِ عالم اپنے اس بندے پر عیاں کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ قرآن پاک کے مخفی معنی بھی اس پر کھلنے لگتے ہیں۔

انعام کے طور پر عطا ہونے والی کشف و کرامات بعض اوقات انسان کے لیے Distraction بھی بنتی ہیں۔ انسان انہی میں کھو جاتا ہے اور روحانیت کی راہ پر اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ ایسے میں بہتر یہی ہے کہ انسان ان کشف و کرامات میں کھونے کے بجائے اپنی نظر اپنے مقصد اور منزل پر رکھے اور کہے "میری

منزل تو میرے رب کا قرب ہے۔ "لطف اُس وقت آتا ہے جب رب تعالیٰ انسان پر اپنا کرم کرتا ہے اور اُسے اُس مقام پر لے جاتا ہے جہاں قرآن پاک کے عملی معنی اُس پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ لیکن بہرحال کشف کو اس حد تک Restrict نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کی ابتدا تو وہیں سے ہو جاتی ہے جہاں اسرارِ عالم اس پر کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ رب تعالیٰ اپنی مرضی سے جس قدر چاہے انسان کو اپنے عجائبات کی سیر کی اجازت دے۔ اگر اُس کی مرضی نہ ہو تو انسان لاکھ کوشش کر لے پوشیدہ چیزوں کا بھید اس پر بھی نہیں کھل سکتا۔

کشف میں پیغمبروں اور اولیائے کرام سے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سب انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم سے عطا کیا جاتا ہے اس لیے یہ Almost One-sided affair ہوتا ہے۔ اگر کسی بلند پایہ ہستی سے کشف میں ملاقات ہو تو عام طور پر انسان اُن بزرگ کی باتیں سنتا ہی ہے۔ اس میں سوال و جواب اور مکالمہ کم ہی ہوا کرتا ہے کیوں کہ ایک تو اُن بزرگ کا مقام اور مرتبہ اتنا بلند ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے اس انسان کی زبان کھل ہی نہیں پاتی، اُن کا احترام بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ کچھ بلند پایہ ہستیوں کے سامنے تو انسان کی سٹی ویسے ہی گم ہو جاتی ہے۔ وہ انسان خواہ کتنا ہی تیز طرار کیوں نہ ہو ملاقات کے وقت واقعتاً اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوتی ہیں کہ میں کتنی بلند ہستی کے سامنے پیش ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کشف میں بلند مرتبت ہستیوں سے ملاقات کے وقت مکالمہ عموماً One-sided affair ہی رہتا ہے۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحبِ کشف اس قدر جرأت مند ہوں کہ سوال و جواب کی ہمت کر لیں۔ یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ حالتِ کشف میں انسان کی ملاقات بلند پایہ بزرگوں، پیغمبروں اور اولیائے کرام سے ہو جاتی ہے اور اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ صاحبِ کشف علم کے کس مقام پر ہے۔

سوال: فرشتوں کے معصوم اور شیطان کے راندۂ درگاہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: شیطان آگ سے بنا تھا جب کہ فرشتے نور سے تخلیق کیے گئے۔ شیطان اس قدر عبادت گزار تھا کہ زمین کے چپے چپے پر اس نے سجدہ کیا جس کے انعام کے طور پر اسے نور سے تخلیق کردہ فرشتوں کا لیڈر بنا دیا گیا۔ فرشتے نوری مخلوق ہیں۔ وہ اُتنا ہی کام کرتے ہیں جتنا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنا ذہن Apply نہیں کرتے اس لیے وہ معصوم ہیں اور روزِ حساب، حساب کتاب سے بری ٹھہریں گے۔

فرشتوں کے پاس چونکہ اپنی مرضی کرنے کا کوئی Option ہی نہیں تھا اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد جب انھیں سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اُن کے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انھوں نے سجدے سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ محض یہ کہا تھا "یا باری تعالیٰ! یہ انسان تو زمین میں فساد برپا کرے گا۔" لیکن جب حضرت آدم علیہ السلام نے اُن چیزوں کے نام گنوا دیے جو فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھے تب وہ بول اُٹھے "یا باری تعالیٰ! جو تو جانتا ہے ہم نہیں جانتے۔" یہ اُن کی Supermacy تھی۔

دوسری طرف آتش سے تخلیق کردہ شیطان نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور راندۂ درگاہ ٹھہرا۔

شیطان کی آگ سے تخلیق ہی سے اس کی فطرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شیطان فرشتوں کا سردار اپنی عبادت کی وجہ سے قرار دیا گیا تھا جب کہ راندۂ درگاہ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے ٹھہرا۔

سوال: Administrative Appointments کے حامل اولیائے کرام کی Duties کیا ہوتی ہیں؟

جواب: تصوف سے متعلق بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں کھلے عام بیان نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت جنید بغدادی ؒ کے ہاں درس و تدریس کے سلسلہ میں ہر خاص و عام کو شمولیت کی اجازت تھی لیکن جب کچھ پوشیدہ جہتوں پر بات کرنا مقصود ہوتی تو وہ اپنے چند خاص 23,24 شاگردوں اور مریدوں کو بند کمرے کے اندر درس دیا کرتے۔ اس میں اس قدر احتیاط کرتے کہ خود اپنے ہاتھ سے دروازہ بند کرتے اور کواڑ اچھی طرح ہلا کر دیکھتے کہ کہیں دروازہ کھلا ہوا تو نہیں۔

تصوف کی مخفی جہتوں (Dimensions) پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھتے کہ یہ بات کسی عام آدمی کے سامنے نہ ہو۔ اس اخفا کا مقصد علم کو محدود کرنا نہ تھا بلکہ ان دو خطرات سے بچاؤ تھا:

1. تصوف کی پوشیدہ جہتوں پر جب ایک عام آدمی کے سامنے بات ہو تو ممکن ہے کہ وہ مذاق اڑائے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کا یہ رویہ دوسروں کے ذہنوں میں بھی شکوک پیدا کرے گا اور جہاں شک پیدا ہو گیا وہاں علم کا راستہ رک گیا۔
2. ہوسکتا ہے کہ کوئی کمزور ذہن سامع عقیدت میں حد سے بڑھ جائے اور ان باتوں سے اس قدر متاثر ہو جائے کہ مرشد کو اتنے بلند درجے پر بٹھادے جو شرک کے زمرے میں آتا ہے۔

ان دو خطرات سے بچنے کے لیے تصوف میں سختی سے منع کیا جاتا ہے کہ اس کی Higher dimensions کو عام لوگوں کے سامنے بیان نہ کیا جائے چہ جائیکہ اس نظام کا بھید کھول دیا جائے کہ اولیاء اللہ کی Duties کیا ہیں اور وہ کیا کام کرتے ہیں۔

سوال: ایک بیمار شخص کی دوائی میں شراب کا کچھ عنصر موجود ہو تو کیا ایسی دوائی کھانے سے وہ گناہ کا مرتکب قرار پائے گا؟

جواب: اس پر علما کا Clear-cut فتویٰ موجود ہے۔ اگر کوئی ایسی بیماری ہو جو ایسی دوائی کے بغیر ٹھیک نہ ہوسکتی ہو تو مریض افاقہ ہونے تک وہ دوا کھا سکتا ہے۔

سوال: کیا رفع یدین کرنا درست ہے؟

جواب: ہر وہ طریقہ جس سے آپ ﷺ نے نماز ادا کی وہ درست ہے۔ البتہ اس میں ایک بات کا خیال رکھا جاسکتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ آپ ﷺ نے مدنی دور کے آخر میں کس طریقے پر نماز ادا کی۔ ہم بھی وہی طریقہ اپنا

میں تو یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

سوال: قلب کے جاری ہونے سے کیا مراد ہے؟ اور یہ دکھاوا کیوں کر ہو سکتا ہے؟

جواب: 'قلب کا جاری ہونا' تصوف کی ایک Term ہے جس کا مطلب ہے کہ آپ کو ذکر کی اتنی عادت ہو جائے کہ جب آپ خاموش ہوں تب بھی آپ کے جسم کا ایک عضو دل اللہ ھو کا ذکر کرتا ہے۔ اس ذکر سے جسم میں اتنی گونج پیدا ہو جاتی ہے جو دوسرے لوگوں کو بھی سنائی دیتی ہے۔ دل سینے میں پھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں۔

جب کوئی شخص کثرت سے اللہ ھو کا ذکر کرتا ہے تو اس کا دل کچھ عرصے بعد بغیر کسی Conscious effort کے خود بخود ذکر شروع کر دیتا ہے۔ انسان سڑک پر جا رہا ہوتا ہے اور اس کا دل اللہ ھو، اللہ ھو کا ذکر کر رہا ہوتا ہے۔ لندن میں ایک صاحب کا کہنا تھا کہ میں جس کے سینے پر ہاتھ رکھ دوں اس کا قلب جاری ہو جاتا ہے۔ ایک شخص نے میرے سامنے اس بات کا تذکرہ کیا تو میں نے کہا "ضرور جایئے۔" وہ شخص وہاں گیا۔ پیر صاحب نے اُن کے سینے پر ہاتھ رکھا، سینہ دبایا لیکن قلب جاری نہ ہوا۔ حیران ہو کر کہنے لگے "تمہاری روح بہت کثیف حالت میں ہے۔ قلب ایک ہی صورت میں جاری ہو گا کہ میں تمہارے سینے پر ہاتھ رکھ کر جو کچھ پڑھوں تم بھی ساتھ پڑھنا۔" لیکن یہ عمل دہرانے کے باوجود اس شخص کا قلب جاری نہ ہو سکا۔

بات یہ ہے کہ کچھ اولیائے کرام عبادت کے اخفا پر بہت زور دیتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس میں حصولِ علم کے لیے بیٹھتا تھا وہ تو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی ورد یا تسبیح پڑھتے ہوئے ہونٹ بھی ہلتے دکھائی دیں۔ وہ تسبیح ہاتھ میں نہیں رکھنے دیتے تھے۔ لوگوں کی موجودگی میں فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے چہ جائیکہ انسان کا قلب جاری ہو جائے۔

میں بھی لوگوں سے یہی کہتا ہوں اور خود بھی ذہنی طور پر اسی طرف راغب ہوں کہ انسان کے ظاہر سے اس کے باطن کا حال معلوم نہ ہو۔ کیوں کہ انسان جس قدر اپنے باطن کو چھپائے اور لوگوں کے علم میں نہ آنے دے، اُسی قدر جلد اس کی روحانی ترقی ہوتی ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص اللہ کا قرب حاصل کرنے کا خواہش مند ہو تو وہ اللہ کے کون سے نام کا ذکر کرے؟

جواب: اللہ کے سبھی نام بہت اچھے ہیں۔ وہ تو رب ہے اور اتنا عظیم ہے کہ ان تمام چیزوں سے بے پرواہ ہے کہ اُسے کون کس انداز میں پکارتا ہے۔ شرط صرف اخلاص کی ہے۔

اگر آپ اُمت محمدیہ ﷺ سے ہیں لیکن آپ کی مادری زبان انگریزی ہے تو اُسے God کہتے رہیے۔ وہ آپ کو ضرور جواب دے گا۔ ہم میں سے اکثر لوگ اُسے 'خدا' کہتے ہیں۔ فارسی کا یہ لفظ ایران سے Import ہوا۔ وہاں کے آتش پرست عبادت کے ایک مخصوص طریقے کو 'خدا' کہتے ہیں۔ لیکن جب ہم رب کو 'خدا' کہتے ہیں تو وہ ہمیں جواب دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس لیے اُسے پکارتا ہے (خواہ کسی بھی نام سے) کہ وہ لائق عبادت ہے اور اس کا رب ہے تو رب اُسے بھی جواب دیتا ہے۔ شرط بس اُسے سچے دل اور خلوص سے پکارنے

کی ہے۔

سوال: اگر تنہائی میسر نہ ہو تو پھر نفل نماز کیسے ادا کی جائے؟

جواب: تنہائی کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ نفل عبادات تنہائی میں ادا کرنے پر اس لیے زور دیا جاتا ہے کہ جب آپ لوگوں کی موجودگی میں ایسا کریں گے تو وہ آپ کو نیک سمجھ کر سلام کریں گے۔ آپ کی واہ واہ ہونے لگے گی اور لوگ آپ کو احترام کی نظر سے دیکھیں گے جس سے آپ کا نفس پھلے پھولے گا۔ نفس کے اس خطرے سے بچاؤ کے لیے نفل عبادت تنہائی میں کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

انعام یافتہ بندے

سوال: ہم اللہ کے انعام یافتہ بندوں میں کیسے شامل ہو سکتے ہیں؟

جواب: قرآنی آیات دو طرح کی ہیں:

1- محکمات

2- متشابہات

وہ آیات جو دو ٹوک، غیر مبہم اور واضح احکامات پر مبنی ہیں، محکمات کہلاتی ہیں جب کہ وہ آیات جن میں اشارۃً یا تمثیلاً کوئی بات کی گئی ہے، انھیں متشابہات کہا جاتا ہے۔

آپ کا یہ سوال کہ اللہ کے انعام یافتہ بندوں میں شامل ہونے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے بارے میں آیات بہت ہیں جن میں بتا دیا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کر کے انسان اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے اور اس کے انعام یافتہ بندوں میں شامل ہو سکتا ہے۔

اللہ کے بتائے ہوئے Dos اور Do nots کو Observe کر کے انسان اللہ کے قریب ہو سکتا ہے۔ 'تقویٰ' سے عموماً مراد 'خوف' لیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک ڈر اور خوف Motivating factor ہے لیکن یہ منفی Factor ہے اور Negative factor زیادہ دیر تک کامیاب نہیں ہوا کرتا۔ جب کہ اس کے مقابلے میں پیار اور محبت ایک Postive motivating factor ہے۔ اس کی ایک مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ چھٹی سے آدھ گھنٹہ قبل آپ کا باس آپ کو ہدایت کرتا ہے کہ تم سول سیکرٹیریٹ جا کر فلاں کام کر کے مجھے رپورٹ کرو۔ آپ باس کے ڈر سے کہہ دیتے ہیں ٹھیک ہے سر لیکن اپنی سیٹ پر آ کر ٹھنڈا پانی پیتے ہیں، اخبار پر نظر دوڑاتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں اور پندرہ منٹ بعد باس سے جا کر جھوٹ بولتے ہیں" سر! میں نے سول سیکرٹیریٹ فون کیا تھا۔ سیکرٹری صاحب تو آج چھٹی پر ہیں۔"

اس جھوٹ کے پیچھے دراصل کام نہ کرنے کی مرضی اور باس کا ڈر اور خوف ہے۔ چھٹی کے بعد آپ پسینے میں نہائے ہوئے گھر پہنچے تو دروازے پر بیٹے کو اپنا منتظر پایا جو آپ کو دیکھتے ہی آپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا کر

مجھے ابھی ببل گم دلا کر لائیں۔ آپ نے اُسے گود میں اٹھایا، اپنے سر سے رومال اتار کر بیٹے کے سر پر رکھا تاکہ اُسے دھوپ نہ لگے اور چلچلاتی دھوپ میں اُسے ببل گم دلانے چل پڑے۔ پیسے خرچ کرنے اور مشقت برداشت کرنے کے باوجود آپ بیٹے کو خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہو رہے ہیں۔

یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ باس سے ڈر اور خوف کا رشتہ ہے جب کہ بیٹے سے پیار کا رشتہ ہے۔ ڈر اور خوف میں انسان لگے بندھے انداز میں مجبوراً فرائض سر انجام دیتا ہے جب کہ پیار میں انسان ذوق اور شوق سے کام کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے ڈر اور خوف کو Negative motivating factor کہا ہے۔ تقویٰ کا ترجمہ اگر ہم یہ کریں کہ اللہ سے ڈرو اور خوف کھاؤ۔ پھر ہم Negative side پر چلتے چلے جائیں گے۔ ہم محض اللہ سے ڈر کر کام کریں گے، دل سے کام نہیں کریں گے۔ ڈر میں سزا کا خوف جب کہ پیار میں محبوب کی ناراضی کا خوف زیادہ ہوتا ہے۔ جب ہم رب تعالیٰ سے اس طرح پیار کریں گے کہ اُسے اپنا دوست بنا لیں گے تو ہم تقویٰ کی راہ پر چل پڑیں گے۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ رات کو تنہائی میں نماز اور تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہونے کے بعد جا نماز پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے رب تعالیٰ سے گفتگو کیا کیجیے۔ یہ سب رب تعالیٰ سے پیار کا ایک طریقہ ہے۔

رب سے ایسی قربت ہو جائے کہ ہم اپنے دل کی بات اس سے کہہ کر مطمئن ہو جایا کریں کہ ہم نے اپنی پریشانی اس ہستی کے ذمہ لگا دی ہے جو سب سے عظیم اور طاقت ور ہے۔ وہ میری پریشانی کو آسانی میں بدل دے گا۔ جب رب کے ساتھ دوستی ہو گی اور اس دوستی پر پختہ یقین ہو گا تو پھر پریشانی ایک جھونکے کی طرح محسوس ہو گی۔ ایسے میں جب کوئی مشکل زندگی میں آتی ہے فوراً انسان کے اندر سے آواز آتی ہے "تم اپنے طاقت ور اور قادر مطلق دوست کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی فکر کیوں کرتے ہو۔" جیسے ہی یہ خیال آیا کہ اب کیا ہو گا ساتھ ہی اللہ کے دوست اور قادر مطلق ہونے کا خیال آیا اور انسان بے فکر ہو کر قہقہے لگانے لگا۔

میں تقویٰ اختیار کرنے کو کہتا ہوں لیکن از روئے ڈر اور خوف نہیں بلکہ از روئے پیار اور محبت...... کیوں کہ جب انسان رب تعالیٰ سے پیار کرنے لگتا ہے تو سوچتا ہے کہ کہیں میرا رب میرا محبوب مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ محبت کا یہ ڈر اور خوف سزا کے ڈر اور خوف سے زیادہ طاقت ور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں میں شامل ہونے کے لیے آپ تقویٰ اختیار کریں اور تقویٰ یہ ہے کہ آپ اللہ کے ساتھ بے پناہ پیار اور دوستی پال لیجیے۔ اس کے ساتھ عشق کر لیجیے۔ وہ ان شاء اللہ اس دوستی کا بھرم رکھے گا اور ہم پر واضح کر دے گا کہ واقعی وہ ہمارا بہترین دوست ہے کہ وہ ہر مشکل گھڑی میں ہمارے کام آتا ہے۔ ہر موقع پر ہمیں Look after کرتا ہے۔ ہمارا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے وہ حل نہ کر دے۔ ہاں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ کبھی کوئی فیصلہ ہماری توقعات کے خلاف ہوتا ہے اور ہم کچھ مایوس ہو جاتے ہیں لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ہم پر واضح ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کا فیصلہ ہمارے بہترین مفاد میں تھا۔

ایک صاحب کی بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ ان کی Posting لاہور ہی میں رہے۔ میں نے دعا کی تو

جواب آیا کہ اُن کا لاہور سے چلے جانا ہی زیادہ بہتر ہے۔ میں نے اُن صاحب سے بڑے طریقے سے کہا "اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے اور ہمیں اُس کی طرف سے آئے ہوئے فیصلوں کو خوش دلی سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ آپ اللہ سے اچھی امید اور گمان رکھیے، وہ اچھا ہی کرے گا۔"

یہ ساری بات تب ہو رہی تھی جب ہم پاکپتن شریف سے واپس آ رہے تھے۔ شام کو لاہور پہنچے تو اُن کے آرڈر آ گئے کہ موجودہ پوسٹ کا چارج چھوڑ دیجیے۔ انھیں لاہور سے باہر ایک ایسی Post کا چارج دے دیا گیا جس سے احساس ہوتا تھا کہ جیسے انھیں Sideline کر دیا گیا ہو۔ اُن کی Posting کے ٹھیک دس دن بعد اُن کے لاہور آفس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں اُن کی جگہ آنے والے صاحب کو Suspend کر دیا گیا۔ اُن کی انکوائری ہوئی اور وہ Demote کر دیے گئے۔ تب وہ صاحب دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "میں تو بال بال بچ گیا۔" میں نے کہا "جناب آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ تو اللہ نے آپ کو بال بال بچایا ہے ورنہ آپ تو لاہور میں ہی رہنے پر بضد تھے۔ یہ رب تعالیٰ کا فیصلہ ہے جو صحیح ثابت ہوا ہے۔" جب دعا کے بعد میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کا لاہور سے چلے جانا ہی بہتر ہے تو یہ سن کر آپ مایوس ہو گئے تھے۔

یاد رکھیے رب تعالیٰ کے فیصلے ہمیشہ درست ہوتے ہیں۔ ایک صاحب ترقی چاہتے تھے۔ ایک سال بعد میں نے انہی صاحب کو یہ کہتے سنا "اچھا ہی ہوا میری ترقی نہیں ہوئی۔ یہ کام میں سنبھال نہ سکتا تھا۔"

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ہماری صلاحیتیں اور Capacities کیا ہیں؟ ہم تو اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اللہ کے فیصلوں کو اگر ہم خوشی خوشی تسلیم کر لیں تو اللہ پر توکل اور بھروسا پیدا ہو جائے گا اور یہی رویہ ہمیں اس مقام تک لے جائے گا جہاں انسان اللہ کے انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہو جائے گا۔

سوال: کیا اللہ ھو کا ذکر کسی بھی وقت شروع کیا جا سکتا ہے یا اس کے لیے پہلے کچھ شرائط پوری کرنا ہوں گی؟

جواب: ہم اکثر کتابوں، رسالوں میں پڑھتے ہیں کہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ فلاں لفظ کا ورد کرتے تھے جس سے انھیں بلند مقام حاصل ہوا۔ ہم اس لفظ کو Out of context جانتے ہیں۔ بظاہر تو وہ ایک لفظ ہی ہوتا ہے لیکن اس لفظ کے ورد سے پہلے ایک بہت بڑی تیاری موجود ہوتی ہے۔ اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ ہم ڈبل روٹی کھاتے ہیں۔ کوئی مہذب انسان ایک سلائس کھانے میں شاید دس منٹ لے لیکن ایک ناکھدہ تراش شاید ایک منٹ میں دو سلائس کھا لے۔ ایک منٹ میں کھائے جانے والے اس سلائس کی تیاری میں بہت سے لوگوں کی محنت اور وقت صرف ہوا ہوتا ہے جس کا ہمیں احساس نہیں ہوتا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ورد میں رہنے والا ایک لفظ اُن کو ایک دم اس مقام پر نہیں لے گیا تھا جہاں انھوں نے تمام اولیائے کرام کی گردن پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بچپن سے لے کر آخری سانس تک پرہیزگاری کی زندگی، لوگوں کی خدمت کی عادت، اللہ کے عطا کردہ علم کو بغیر کسی معاوضے کے لوگوں میں تقسیم کرنے کی صفت، تواضع اور دیانت داری کی خو...... یہ تمام خوبیاں ایک طویل عرصے تک پریکٹس ہوتی

دیں۔ اس کے بعد جب انھوں نے اس خاص اللہ کا ورد شروع کیا تو اس کے اثرات کی وجہ سے آپ رتبۂ ولایت کے درجات طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں آپ نے تمام اولیا کی گردنوں پر پاؤں رکھ دیا۔ یہ ایک دن، ایک مہینے یا ایک سال کا کمال نہیں تھا بلکہ یہ تو ساری عمر کی محنت کا ثمر تھا۔

اسی طرح جب ہم اللہ ھو کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے مطلوبہ اثرات ہمیں اس وقت تک نہیں مل سکتے جب تک ہم اس کے لیے گراؤنڈ تیار نہ کر دیں۔ اگر میں زمین میں High-breed corn کا بیج لگا کر 120 من فی ایکڑ فصل لینا چاہتا ہوں تو اس کے لیے مجھے زمین میں ایک خاص گہرائی تک ہل چلانا ہوگا۔ پھر اس میں ایک مخصوص قسم کا High-breed بیج پھینکنا ہوگا۔ اس کی آبیاری اور دیکھ بھال کرنا ہوگی۔ جب چار مہینوں بعد فصل پک کر تیار ہو جائے گی تب کہیں جا کر مجھے 120 من فی ایکڑ پیداوار حاصل ہوگی۔ اگر میں یہ ساری محنت نہیں کرنا چاہتا تو پھر مجھے زمین میں ایک ایسی قسم کا بیج ڈالنا ہوگا جو از خود زمین میں سے اگ آتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی آبیاری اور Care کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن یاد رکھیے اس کی Yield دس بارہ من سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگر میں یہاں بھی محنت نہیں کرتا تو مجھے صرف دو تین من پیداوار حاصل ہوگی۔

اگر بہترین بیج ڈالنے کے باوجود میں اسے صحیح وقت پر پانی نہیں دیتا، صحیح طریقے سے اس کی دیکھ بھال نہیں کرتا تو مجھے 120 من فی ایکڑ پیداوار نہیں مل سکے گی۔ مطلوبہ پیداوار کے حصول کے لیے اس کی Prerequisites کو پورا کرنا ضروری ہے۔

اگر ہم کسی بھی ورد، ذکر یا مجاہدے سے صحیح Yield لینا چاہتے ہیں تو ہمیں تمام Prerequisites کا خیال رکھنا ہوگا۔

ایک صاحب نے کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان بزرگ کے ڈیرے پر اپنی Family کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کی تربیت کا آغاز ہو گیا۔ تیس برس گزر جانے کے بعد ان کے مرشد نے اعلان کیا "کل عصر کی نماز کے بعد میں اپنی تلوار تمھیں دوں گا۔" وہ صاحب بہت خوش ہوئے کیوں کہ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اگلے دن عصر کی نماز کے بعد انھیں مرشد صاحب نے بلایا اور کہا "تمھاری کمر پر جو تلوار بندھی ہے اسے کھول کر زمین پر رکھ دو تاکہ وہاں میں اپنی تلوار باندھ سکوں۔" ان صاحب نے اپنی کمر سے تلوار کھولی اور وہ اپنے پاس کھڑی اپنی بیگم کے ہاتھ میں تھما دی۔ جس پر مرشد صاحب نے کہا "ابھی تم اس قابل نہیں ہوئے کہ تمھیں یہ تلوار دی جا سکے۔ ابھی تمھیں مزید تربیت کی ضرورت ہے۔"

مرشد نے فوری طور پر اپنا Mind کیوں تبدیل کیا؟ یہ ایک قابل غور نکتہ ہے۔ دراصل مرید سے غلطی یہ ہوئی کہ جب مرشد نے انھیں تلوار کھول کر زمین پر رکھنے کو کہا تو انھیں اسے زمین پر ہی رکھنا چاہیے تھا۔ بیوی کے ہاتھ میں نہیں تھمانا چاہیے تھا۔

جب تک انسان اطاعت کے اس درجے تک نہ پہنچ جائے اعزاز کا حصول ناممکن ہے۔ اللہ ھو کا ذکر کرنے کے باوجود اگر ہم نے Prerequisites پوری نہیں کیں تو اس ورد سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

تلوار والے قصے میں ایک بہت بڑا اخلاقی عنصر ہے۔ جب ہم رب تعالیٰ کی اطاعت اس انداز میں کریں کہ اپنا مائنڈ Apply کرنا چھوڑ دیں تب کسی بھی ورد سے بہت کچھ عطا ہوگا۔ ہم تو اتنا نہیں کر پاتے کہ اگر کسی کا کوئی عیب ہمارے علم میں آ جائے تو ہم اسے آگے بیان نہ کریں۔ کسی کو شراب پیتے دیکھ کر ہم اس کی پردہ پوشی کے بجائے واعظ دینے لگتے ہیں۔ جب کسی کی برائی ہمارے سامنے ہو رہی ہو تو ہم یہ نہیں کہتے "صاحب! وہ تو اچھا انسان ہے۔ بس بے چارے سے غلطی ہوگئی۔ اس کا پاؤں پھسل گیا، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہماری ساری شائستگی اس وقت ہوا ہو جاتی ہے جب ہمارے مزاج کے خلاف ذرا سی بات ہو جاتی ہے۔ ہماری آنکھوں کا رنگ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ کوئی ذرا سا ہمارا نقصان کر دے تو ہم ہر ایک کے سامنے اس کا گلہ کرنے لگتے ہیں اور ایسے میں ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم کن نبی ﷺ کے امتی ہیں۔

اگر ہم اپنے رویوں کو بہتر نہیں بنا سکتے تو کوئی ورد یا وظیفہ ہمیں فائدہ نہیں دے سکے گا کیوں کہ وہ محض ذکر ہی ذکر ہے، اطاعت تو وہاں غائب ہے۔۔۔۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے اطاعت اختیار کریں اس کے بعد ذکر اذکار اور اوراد و وظائف کی طرف راغب ہوں۔ پہلے ہم زمین میں ہل چلا کر اس کی Watering کر کے چھوڑ دیں تا کہ فالتو پانی evaporate (بھاپ بن کر اڑ جائے) ہو جائے۔ اس کے بعد زمین میں بیج ڈال دیا جائے۔ زمین کی مناسب تیاری نہ کی جائے تو بیج فصل نہیں دے گا۔ بیج ڈالتے ہوئے بھی ہمیں محتاط رہنا ہوگا کہ ایسا بیج ڈالیں جو وہاں کی Soil اور Weather conditions کو Suit کرتا ہو۔ اگر ہم الاسکا، بیجنگ یا خط استوا کے کسی حصے سے بیج لا کر بوئیں گے تو وہ فصل نہیں دے گا۔ اسی طرح ذکر بھی Pick کیجیے جو آپ کی Body chemistry اور Nature کو Suit کرتا ہو۔

سوال: مشکلات اور مسائل میں اضافے کے باوجود راضی بہ رضا رہنے کی کیفیت میں دوام اور استقامت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

جواب: یو کے میں ایک غیر مسلم نے ایک بار مجھ سے سوال کیا "اسلام اپنی اصلی حالت میں زیادہ دیر تک Implement کیوں نہیں رہا؟" میں نے عرض کیا "اگر آپ دین اسلام کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ایثار و قربانی کا مذہب ہے۔" ایثار و قربانی بظاہر گھاٹے کا سودا لگتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ ہم عموماً ہر چیز کو اس کی Face value اور سطحی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے سمجھ نہیں پاتے کہ درحقیقت یہ فائدے کا سودا ہے۔ چونکہ اس کا Immediate impression گھاٹے کا ہے اس لیے ہم ایثار و قربانی سے گریز کرتے ہیں۔ جب کسی کو کچھ دینے کی بات آتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ میرا تو اپنا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے میں فالتو رقم کہاں سے لاؤں۔ لیکن اسلام کا فلسفہ تو بہت مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ کے پاس جو کچھ فالتو (Surplus) ہے اس پر یقینی طور پر دوسروں کا حق ہے۔ اگر محض اپنی ضروریات کے لیے وسائل ہیں تو اپنی ضروریات کو محدود کر کے تھوڑا سا ایثار کریں اور دوسروں کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اگر آپ کے وسائل آپ کی ضرورت سے بھی بہت کم ہیں تو پھر قربانی کیجیے اور اس بہت تھوڑے میں

سے بھی تھوڑا سا کسی کے لیے نکال لیجیے۔

اگر ہم خود بھوکے ہیں پھر کسی کو کھانا تو نہیں کھلا سکتے لیکن کم از کم ہم اپنی بھوک تو کسی کے ساتھ Share کر سکتے ہیں۔ اگر کہیں سے مجھے دو روٹیاں میسر ہو گئیں حالاں کہ میری بھوک چار روٹیوں کی ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ کروں کہ دو روٹیوں میں سے بھی ایک روٹی کسی دوسرے فاقہ زدہ انسان کے ساتھ Share کر لوں۔

اسلام اس پر Believe کرتا ہے اور درس دیتا ہے کہ جب آپ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی بھوک ہی Share کر لیجیے۔ یہ ایثار و قربانی ہے۔ راضی بہ رضا رہنے کی کیفیت میں دوام اور استقامت کا حصول بھی ایثار و قربانی ہی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ استقامت ایک ہی صورت میں آئے گی کہ میں جائزہ لوں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اس وقت سے لے کر اب تک جب بھی میری محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ میری خواہشات کے برعکس آیا تو بعد کے وقت نے کیا ثابت کیا؟ کیا وہ درست تھا جو میں چاہتا تھا؟ یا پھر رب کا فیصلہ گزرتے وقت کے ساتھ بہتر ثابت ہوا۔ جب ہم اس صورت حال پر غور کریں گے تو پتا چلے گا کہ ہمیشہ رب تعالیٰ کا فیصلہ ہمارے حق میں بہتر اور درست ثابت ہوا۔ یہ جان لینے کے بعد ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ہمیشہ کی طرح مستقبل میں بھی میرے رب تعالیٰ کی طرف سے آنے والا فیصلہ ہی درست ہوگا۔ یہ سوچ اور یقین رب تعالیٰ پر ہمارے اعتبار، بھروسے اور یقین کو مزید پختہ کر دے گا اور ہم اس کے ہر فیصلے پر راضی بہ رضا رہنے لگیں گے۔

شرط یہی ہے کہ ہم اپنے فارغ وقت میں اپنی زندگی کو Review کرتے رہیں کہ کب، کہاں، کیا پیش آیا جس پر ہم وقتی طور پر قدرے ناخوش تھے لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ رب تعالیٰ کا فیصلہ ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ اس Review سے راضی بہ رضا رہنے کی کیفیت کو دوام عطا ہو جائے گا۔

رُوحانیت میں گواہی کی اہمیت

ہم اللہ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم اللہ کی اطاعت اور اُس کی بندگی نہ کر لیں۔ اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ ہم رب تعالیٰ کے تمام احکامات کی حتی الوسع پیروی کریں اور قلب کو آئینے کی طرح صاف کر لیں کیوں کہ قلب صاف ہو تو نیکی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے رُوحانیت میں قلب کی صفائی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

اللہ کے قرب کے حصول کے لیے ایک اور چیز پر عمل کرنا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی گواہی کو درست کر لیں۔ ہمارے ہاں کلچر کے نام پر کچھ چیزیں یوں در آئیں کہ ہمیں اُن کی بدصورتی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم Gossip کے نام پر لاشعوری طور پر دوسروں کی غیبت کرتے رہتے ہیں اور یوں انجانے میں اپنے اُوپر جھوٹا ہونے کا لیبل لگوا لیتے ہیں کیوں کہ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تصدیق کے آگے بیان کر دے۔ ہم دن میں نہ جانے کتنی بار سنی سنائی باتیں آگے بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور ہمیں اپنی غلطی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اگر اسی چیز کو ہم آگے بڑھائیں تو وہاں ایک چیز ہے "گواہی"۔ ہم شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی گواہی میں زیادہ سچے نہیں ہیں۔ گواہی صرف وہی نہیں ہوتی جو عدالت میں دی جاتی ہے بلکہ اگر میں کسی محفل میں موجود ہوں اور وہاں میرے کسی دوست کے بارے میں بات ہو رہی ہے اور میں اگر اپنے دوست کی کوئی ایسی خوبی وہاں بیان کرتا ہوں جو اس میں سرے سے موجود ہی نہیں یا جس کا اُس نے ایک آدھ بار مظاہرہ کیا ہے وہ اُس کے کردار کا لازمی جزو نہیں ہے تو در اصل میں ایک غلط گواہی دے رہا ہوں۔

اسی طرح جب میں اپنے کسی دشمن کا ذکر کرتا ہوں اور اُس کی صرف خامیاں ہی بیان کرتا ہوں، کسی خوبی کا ذکر نہیں کرتا تو یہ بھی گویا گواہی میں بددیانتی کا مرتکب ہوتا ہے۔

ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے بدترین دشمن کا ذکر کرتے ہوئے بھی حق گوئی سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے دشمن میں فلاں فلاں بُرائیاں ہیں لیکن اس میں چند بہت کمال کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ وہ اپنے دشمن کی خوبیاں بھی کھلے دل سے بیان کرتا ہے۔

اسی طرح اگر میں کسی ایسی محفل میں موجود ہوں اور وہاں کسی غیر موجود شخص کے بارے میں ایسی بات کی جاری ہے جو درحقیقت اُس کے کردار یا ذات کا حصہ نہیں اور مجھے اس بارے علم بھی ہے تو بطور ایک مسلمان میری شان یہ ہے کہ میں واضح طور پر کہوں کہ اگرچہ وہ شخص میرا دشمن ہے لیکن جس خامی کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ اس میں موجود نہیں۔

ہمارے ہاں ایک بات عام ہے۔ ہم شکوہ کرتے ہیں کہ دیکھیے صاحب! میں جا رہا تھا فلاں شخص نے مجھے گالی دی...... میں کبھی نہیں کہوں گا کہ میں خود کہاں غلطی پر تھا۔ میں ہمیشہ صرف اُتنا ہی حصہ Quote کروں گا کہ جس میں کسی نے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا حالانکہ سڑک پر جانے والا شخص پاگل تو نہیں تھا۔ یقیناً کہیں نہ کہیں میرا قصور بھی ہوگا۔ میری گاڑی یا موٹر سائیکل کی Speed سے راہ چلتے اُسی شخص کے کپڑوں پر چھینٹے پڑ گئے جس پر اُس نے غصے میں آ کر مجھے گالی دی۔

یہ مسلمان کی شان ہے کہ وہ کوئی بھی واقعہ اس طرح بیان کرے گا جس طرح درحقیقت وہ ہوا تھا۔ اگر ہم اپنی گواہی درست کر لیں تو ہمارے معاشرے میں پیدا ہونے والی بہت سی بُرائیاں از خود درست ہو جائیں گی۔

ایک صاحب نے بہت عرصہ پہلے میری گفتگو پر بنی ایک آرٹیکل لکھا تھا "اصلاحِ معاشرہ کا ایک نکاتی پروگرام...... گواہی"

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی اصلاح کرنے میں سچی گواہی کو بڑا دخل ہے۔ جب انسان کسی واقعے کی اصلیت کو چھپاتا نہیں تو گواہی کی یہ صحت معاشرے کی اصلاح کا باعث بنتی ہے۔

واقعہ معراج ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے آئے ہیں لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ معراج شریف پر آپ ﷺ کو بلانے کا کوئی تو مقصد رہا ہوگا۔ میرے نزدیک آپ ﷺ کو معراج پر بلانے کے مقاصد میں سے ایک Main objective 'شہادت الحق' گواہی تھا۔ یاد رکھیے اس روئے زمین اور عالم الاسباب کے علاوہ بھی بہت سے عالم اور جہان ہیں، جہاں بہت کچھ موجود ہے۔ ہمارے آسمان کے علاوہ اور بھی آسمان موجود ہیں۔ جب اللہ نے یہ سب کچھ آپ ﷺ کو دکھانا چاہا تو آپ ﷺ کو معراج پر بلا لیا۔

یہاں یہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوگا کہ آپ ﷺ کی روح تو سب سے پہلے تخلیق ہوئی۔ ہر شے کی تخلیق کے وقت تو آپ ﷺ موجود تھے پھر آپ ﷺ کو معراج پر بلایا جانا کیوں ضروری تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے جو مشاہدہ کیا تھا وہ روحانی مشاہدہ تھا جب کہ شبِ معراج آپ ﷺ نے جسمانی مشاہدہ کیا۔

واقعہ معراج سے فوراً پہلے طائف کا واقعہ ہو گزرا تھا۔ بدبخت اہلِ طائف نے آپ ﷺ کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ آپ ﷺ جسمانی لحاظ سے اس قدر زخمی ہو گئے کہ خون ایڑیوں تک بہنے لگا۔ اس وقت اندرونی طور پر آپ ﷺ بہت دکھی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ ﷺ بشریت کی اعلیٰ ترین بلندیوں کو پہنچے ہوئے تھے۔ کوئی عام انسان دکھ کی ایسی کیفیت میں شاید زیادہ اچھے الفاظ نہ کہتا لیکن آپ ﷺ نے اہلِ طائف کے

حق میں ایک طویل دعا فرمائی۔

کون جانے کہ آپ ﷺ کا مبارک خون اس طرح بہتا دیکھ کر رحمت خداوندی کس درجے جوش میں آئی کہ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معراج شریف پر بلا لیا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کا جسمانی وجود بھی ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کر کے ان کی شہادت دے جن چیزوں کا مشاہدہ آپ ﷺ کا رُوحانی وجود روزِ ازل سے کرتا چلا آیا تھا۔ سفرِ معراج کے دو حصے تھے

1۔ مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

2۔ مسجد اقصیٰ سے عرش تک۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ آپ ﷺ کو مسجد الحرام سے براہِ راست عرش پر بلا لیا جاتا۔ لیکن مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر میں دو طرح کی حکمت پوشیدہ تھی:

1۔ تمام ملائکہ اور انبیا پر یہ Establish کرنا کہ آپ ﷺ امام الانبیا ہیں۔

2۔ آپ ﷺ کو یاد کروانا کہ آپ ﷺ انبیا کے سردار ہیں۔

اللہ کے حکم سے آپ ﷺ نے مسجد اقصیٰ میں انبیا کی امامت کرائی تو یہ بات پردۂ شہود پر آ گئی کہ آپ ﷺ واقعتاً امام الانبیا ہیں۔

دوسرا سفر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی جانب تھا۔ جو پہلا آسمان ہے اس پر دُنیا کا دروازہ ہے۔ پہلے آسمان کے دروازے سے جب ہم داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے دریائے توحید پر ہماری نظر پڑتی ہے۔ اس کے بعد بحرِ قیوم آتا ہے۔ براق کا پہلا قدم دریائے توحید پر جب کہ دوسرا قدم بحرِ قیوم پر تھا۔ اس آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام انچارج ہیں۔ تمام آسمانوں پر مختلف انبیا انچارج ہیں۔ ہر آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات مختلف انبیا سے ہوئی اور ان سب نے آپ ﷺ کو "اے فرزندِ صالح" کہہ کر پکارا۔

یہ قصہ معترضہ تھا۔ بات گواہی اور شہادت کی ہو رہی تھی۔ رب تعالیٰ نے بھی شہادت قائم کی اور واقعہ طائف کے بعد آپ ﷺ کو معراج پر بلا لیا تاکہ رُوحانی جسم کی طرح آپ ﷺ کا جسمانی وجود بھی تمام مقامات کا مشاہدہ کر لے۔

ساتویں آسمان کے انچارج حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور مقامِ محمود وہیں پر ہے۔ وہی مقامِ محمود جس کے بارے میں ہم اذان کے بعد دعا کرتے ہیں "یا اللہ! آپ ﷺ کو اس مقامِ محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان ﷺ سے وعدہ کیا ہے۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔"

معراج شریف کے ضمن میں ایک بات کہیں لکھی دکھائی نہیں دیتی اور وہ یہ کہ عرش پر موجود بیت المعمور جہاں فرشتے ہمہ وقت مصروفِ طواف رہتے ہیں، شبِ معراج آپ ﷺ نے بھی اس کا طواف کیا۔

جس طرح اس زمین پر موجود خانہ کعبہ کے عین اوپر عرش پر بیت المعمور ہے بالکل اسی طرح یہ جو ہم دُنیا

میں اکٹھے رہتے ہیں یہ دراصل ہمارے گچھوں اور اکٹھے رہنے کا نتیجہ ہے۔ آسمانوں پر ایک مقام "عالمِ رُوح" کہلاتا ہے۔ در حقیقت روح ان کرنوں کا نام ہے جو نورِ الٰہی سے متعلق ہیں اور Droplets کی صورت میں برستی ہیں۔ یہ Droplets بعد میں گچھوں کی صورت اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ انسان کا دنیا میں مل جل کر رہنا در حقیقت ان Droplets کے گچھوں کی صورت میں اکٹھے ہونے کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے انسان کو Social animal کہا جاتا ہے۔

یاد رکھیے! اس عالم الاسباب کا کاروبار Independent نہیں بلکہ یہ کسی اور جگہ کچھ چیزوں اور حالات و واقعات کے کارفرما ہونے کا Result ہے۔

'گواہی اور شہادت' کا ذکر ہو رہا تھا۔ علم لدنی، رُوحانیت یا تصوف کے حصول کے لیے ہمیں پہلے Prerequisites پوری کرنا ہوں گی۔ اگر ہم وظائف، ذکر اذکار اور مجاہدوں سے پہلے ان کی Pre-conditions پوری کر لیں تو ہمیں ان ذکر اذکار اور اوراد و وظائف کے اصل ثمرات حاصل ہونا شروع ہو جائیں گے اور علم بھی مل جائے گا۔

جہاں ہم تصوف کی دیگر Pre-conditions اور Prerequisites کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہاں ہم اپنی گواہی کو بھی درست کر لیں۔ ہم اپنے دشمن کی خوبیاں بھی اسی ذوق و شوق سے بیان کریں جس ذوق و شوق سے خود اپنی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہم اپنی خامیوں اور بُرائیوں کو اسی طرح Condemn کریں جس طرح ہم اپنے مخالفین کی خامیاں Condemn کرتے ہیں۔

ایک بار کسی نے سوال کیا تھا کہ رُوح کو لطیف بنانے کے لیے کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ جب ہم اپنی گواہی درست کر لیں گے تو اس سچائی اور پاکیزگی کے نتیجے میں ہماری رُوح میں لطافت پیدا ہوتی چلی جائے گی جو رُوحانی سفر کے لیے بے حد ضروری ہے۔

سوال: کیا رُوحانیت کے ہر درجے کی Pre-conditions علیحدہ ہیں یا رُوحانیت کی سیڑھی پر قدم رکھنے کے لیے پہلے ایک Certain level of Pre-conditions کو پورا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: آپ سول سروس آف پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ اس میں Entry کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس ایک مخصوص معیار کا علم (Knowledge) اور Intelligence ہو جسے گورنمنٹ Written Test اور Viva کے ذریعے جانچتی ہے۔ اگر آپ مطلوبہ معیار پر پورا اترتے ہیں تو آپ کو Training کے لیے بھیج دیا جاتا ہے جس میں آپ کو مختلف مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ آخر میں Exam ہوتا ہے جس میں ایک بار پھر آپ کو پرکھا جاتا ہے کہ کیا آپ مطلوبہ معیار تک پہنچے ہیں یا نہیں؟ کامیابی کی صورت میں ایک سال کی Practical Training ہوتی ہے۔ (اسے On-job training یا Hands-on training بھی کہا جاتا ہے۔) پھر آپ کو سول سروس میں Induct کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنی کارکردگی، اپنے Behaviour، مختلف Courses اور Departmental exams کی بنیاد پر آپ ترقی پاتے چلے

جاتے ہیں جن میں اہلیت کے Test دوبارہ نہیں ہوتے۔ فوج میں ٹریننگ سے پہلے آپ کی اہلیت جانچنے کے لیے Written اور Physical Test کے بعد Viva ہوتا ہے جس میں پاس ہو جانے پر آپ کو اکیڈمی بھیج دیا جاتا ہے۔ ڈھائی سال کی Training کے بعد جب آپ Final Exams میں پاس ہو جاتے ہیں تو آپ افسری کے لیے اہل قرار پاتے ہیں اور افسری کا Tag ایک بار لگ گیا تو اس کے بعد آپ کے Behaviour, Attitude, Performance اور Conduct کا تجزیہ ہوتا رہتا ہے اور ان کی بنیاد پر لکھی جانے والی Annual Confidential Report (ACR) کی روشنی میں آپ کی Promotion ہوتی چلی جاتی ہے۔

بعینہٖ روحانیت میں تمام Pre-conditions پوری کرنے کے بعد آپ کو علم ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کے Behaviour کی بنیاد پر آپ کی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان Behaviours کا بنیادی معیار شروع ہی میں طے کر لیا جاتا ہے جسے آخر تک قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

سوال: زندگی گزارنے کا کیا طریقہ ہے؟ قبر و حشر کا معاملہ کیسے بہتر ہو سکتا ہے؟

جواب: دنیاوی زندگی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ہماری آخرت کی زندگی، قبر کا عذاب اور حشر کا انجام اسی دنیاوی زندگی پر ہی ہے۔

یوم حشر اخروی زندگی کا ابتدائی دن ہے۔ اسے یوم حساب بھی کہا جاتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ جس زندگی کا آغاز ہی ابھی ہوا ہو اس کا حساب کتاب کیسے ممکن ہے۔ وہ حساب کتاب اس دنیا میں کیے جانے والے اعمال کا ہوگا۔ جو کچھ ہم نے یہاں بویا ہوگا یوم حشر کو وہی کچھ وہاں ہم کاٹ لیں گے۔ اس لیے اگر ہم اپنی اس زندگی کی فکر کریں اور اوامر و نواہی کی پیروی کرتے ہوئے یہ زندگی گزار لیں تو اخروی زندگی خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ اس زندگی کو سنوار لیجیے وہ زندگی خود ہی سنور جائے گی اور زندگی کو سنوارنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ Dos اور Do nots کو ہم Follow کرتے چلے جائیں۔

اگر یہ کرنا مشکل لگے تو پھر ایک کام ہم کر لیں کہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کی نقل کر لیں۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے، کوئی بھی Reaction ظاہر (Show) کرنے سے پہلے ہم سوچ لیا کریں کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کا عمل کیا ہوتا۔ یہ رویہ اپنانے کے بعد ہماری دنیاوی و اخروی زندگی بہتر ہو جائے گی اور قبر و حشر کا معاملہ Automatically درست ہو جائے گا۔

سوال: خانہ کعبہ کے عین اوپر اس کا Projection بیت المعمور ہے۔ زمین اپنے محور پر سورج اور مختلف کہکشاؤں کے گرد گھوم رہی ہے۔ کیا اس سے اس Projection کا مقام تبدیل نہیں ہوتا؟

جواب: زمین اپنے Axis پر گھوم رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ Orbit میں گھوم رہی ہے۔ ایسے میں یہ تو بہت آسان کام ہے کہ میں بجلی کا بلب لوں اور زمین سے 100 فٹ کی بلندی پر اسے معلق کر دوں۔ اب

زمین تو گھوم ہی رہی ہے۔ دو تین گھنٹے بعد اس Location پر امریکہ آ جائے گا اور میں وہاں Land کر جاؤں گا۔ یوں مجھے پرواز کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ جتنی چیزیں بھی Gravitational Force کے دائرے میں آتی ہیں وہ اسی کے ساتھ اسی کی Speed میں Rotate ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس کا ادراک نہیں ہوتا کیوں کہ ہر چیز یکساں Speed کے ساتھ محوِ حرکت ہوتی ہے اس لیے ہمیں ساکن معلوم ہوتی ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا کہ سورج، چاند، ستارے سب اپنے اپنے محور پر گردش کر رہے ہیں۔ اسی طرح آسمان بھی گردش کر رہا ہے۔ تمام چیزیں گردش میں ہیں پھر بھی اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں۔

Projection سے مراد یہ نہیں ہے کہ جیسے ہم ڈرائنگ کرتے ہوئے ایک Object کی Projection لینے کے لیے لائنیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ خانہ کعبہ کا عکس اوپر پڑ رہا ہے تو ہم اسے Projection کہہ رہے ہیں۔ بیت المعمور آسمان پر قائم ہے۔ آسمان اپنی Speed پر گردش میں ہے۔ اسی طرح سورج، چاند، ستارے، زمین سب گردش میں ہیں۔ اگر اس گردش کو روک دیا جائے تو خانہ کعبہ اور بیت المعمور ایک دوسرے کے اوپر تلے آ جائیں گے۔ Projection کا لفظ اسی Sense میں استعمال ہوا ہے۔

احسان اور شکر

سوال: احسان سے کیا مراد ہے؟ اگر کوئی کام کسی کے ذمے لگایا جائے تو اُسے احسان کے طریقے پر کیسے کیا جاسکتا ہے؟

جواب: عربی دُنیا کی سب سے زیادہ فصیح و بلیغ زبان ہے۔ ایک ہی لفظ کو مختلف مفاہیم کے ساتھ مختلف مواقع پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہم عجمی ہونے کے باعث بہت سی باتوں اور لفظوں کو اُن کے صحیح Context میں سمجھ نہیں پاتے۔ احسان لفظ "حسن" سے نکلا ہے لیکن یہ مختلف مقامات پر مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جب ہم اس لفظ کو اس کے اصل Context میں دیکھتے ہیں تو مفہوم واضح ہو جاتا ہے:

اسلام کو ہم دو Dimensions کے لحاظ سے جانتے ہیں:

1۔ ایک عام شخص کے نزدیک اسلام سے مراد ہے "عبادات"۔

2۔ علما حضرات کے نزدیک اسلام ایک Penal Code ہے۔ اللہ تعالیٰ کاہلی، سستی اور محنت سے جی چرانے والے لوگوں کو پسند نہیں کرتا بلکہ ان لوگوں کو عزیز رکھتا ہے جو مجاہدوں کی طرح ہر وقت عمل کے لیے کمر کس کے رکھتے ہیں۔ اسلام نے فرائض کی انجام دہی پر بہت زور دیا ہے لہٰذا جو ڈیوٹی بھی ہمارے ذمے لگائی جائے اور ہم اُسے قبول کرلیں تو پھر بہت دل جمعی سے سرانجام دیں۔ ذوق و شوق سے کیے جانے والے کام کا اجر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

ایک مزدور سر پر اینٹوں کا بوجھ اٹھا کر دو تین منزلیں اوپر چڑھتا ہے۔ سیڑھی بھی کمزور ہے، دھوپ بھی تیز ہے، وزن بھی زیادہ ہے لیکن اس قدر محنت و مشقت کے باوجود وہ صرف 300 روپے اُجرت حاصل کرتا ہے جب کہ معمار Scaffolding باندھے تیسری منزل پر آرام سے بیٹھ کر دیوار بنا رہا ہے۔ وہ ہزار بارہ سو معاوضہ وصول کرتا ہے۔ جب کہ آرکیٹیکٹ جو ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر چند لائنیں کھینچ کر نقشہ بناتا ہے وہ سب سے زیادہ فیس وصول کرتا ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ دراصل مزدور اینٹیں اٹھانے میں ذہنی صلاحیتیں نہیں بلکہ صرف جسمانی قوت استعمال کرتا ہے جب کہ معمار جسمانی طاقت کے ساتھ ساتھ اپنا ہنر بھی استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح آرکیٹیکٹ اپنا

مائنڈ بھی Apply کر رہا ہے اور نقش بناتے ہوئے اپنی حس جمالیات اور ذوق و شوق بھی استعمال کر رہا ہے۔
جس کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ معاوضہ حاصل کرتا ہے۔

اسی طرح جب ہم اپنی ڈیوٹی صرف ڈیوٹی سمجھ کر ادا کر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں کوئی Appreciation نہیں ملتی سوائے اس جملے کے کہ ''اس شخص کے ذمہ جو کام لگا وہ وہ یہ کر دیتا ہے۔'' لیکن اگر ہم نے اپنی ڈیوٹی ذمہ داری اور محنت سے پوری کی تو ہم محنتی کہلائے گے اور اگر ہم اپنی ڈیوٹی ذوق و شوق اور لگن سے سرانجام دیتے ہیں تو ہمیں تحفے بھی ملتے ہیں اور ترقی بھی۔ اگر وہی ڈیوٹی ہم Beyond the call of duty سرانجام دیں تو یہ احسان ہے۔ اسی کی دنیا اور رب دونوں کی طرف سے تحسین ملتی ہے۔

"Beyond the call of duty" کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایک صاحب جو گورنمنٹ جاب میں ریٹائرمنٹ کے قریب تھے، ہم اکثر یہ سوچ کر اُن سے ملنے چلے جایا کرتے تھے کہ وہ بہت نیک انسان ہیں۔ اُن کے قریب ہو کر ہم بھی شاید اللہ سے قریب ہو جائیں۔ ایک بار کسی سے پتا چلا کہ وہ عموماً دفتر میں کسی سے ملنے سے گریز کرتے ہیں اور جب بھی وہ دفتر میں کسی کو ملاقات کا وقت دیتے ہیں تو اُس روز وہ دیر تک دفتر میں بیٹھ کر تمام دفتری امور کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد گھر روانہ ہوتے ہیں۔

ایک روز ہم نے اُن سے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے ''میرے دفتری اوقات آٹھ سے دو بجے تک کے ہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ جو کام بھی میری میز پر آ جائے اسے میں اسی روز ختم کر کے گھر جاؤں۔ جب کوئی مہمان آ جاتا ہے تو کام Pending ہو جاتا ہے اس لیے میں اُس وقت تک گھر نہیں جاتا جب تک اُس دن کا آیا ہوا کام میری Table پر Clear نہ ہو جائے۔ خواہ اس کام کی تکمیل میں مجھے رات ہی کیوں نہ ہو جائے۔''

ہم نے اُن صاحب کو دفتر پہنچنے میں بہت Punctual پایا۔ دفتر لگنے سے پانچ منٹ قبل وہ وہاں پہنچ جاتے۔ ان پانچ منٹوں میں تلاوت کلام پاک کرتے اور جیسے ہی دفتری اوقات شروع ہوتے، کام میں لگ جاتے۔

کام کرنے کے زمرے میں یہ رویہ 'احسان' کہلائے گا۔

حضرت امام زین العابدینؒ فرمایا کرتے تھے

''کاش میں اللہ تعالیٰ کے احسانوں کا شکر ادا کر سکوں۔''

ہر لمحہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اس قدر ہوتے ہیں کہ ہم اُس کے کسی احسان کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتے۔ ساری چیزوں کو چھوڑیں۔ یہ جو ہم سانس لیتے ہیں تو آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو رب تعالیٰ ایسا آمیزہ بناتا ہے اور اس کے ساتھ چھ سات مزید Gases کی Proportion کے ساتھ ایک Ratio بناتا ہے کہ جب ہم اسے Inhale کرتے ہیں تو ہمارے جسم اور دماغ کو ایک نئی توانائی اور زندگی ملتی ہے۔ اگر یہ Ratio کسی وجہ سے Out ہو جائے تو ہمارے لیے زندہ رہنا دشوار ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ اس Balance کو قائم رکھتا ہے اور

یوں ہمارے لیے زندہ رہنا آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر لمحہ ہم پر احسانات کی بارش کر رہا ہوتا ہے لیکن ہم اس کا ادراک تک نہیں کر پاتے۔ اُسے For granted لیتے ہیں۔ اسی لیے حضرت امام زین العابدینؒ نے فرمایا تھا "کاش میں اللہ کے احسانات کا شکر ادا کر سکوں۔"

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اہلِ فقر کو اگر آپ کبھی ایک گھونٹ پانی پلا دیں خواہ وہ پانی اُن کے اپنے گھڑے سے ہی لیا گیا ہو تو وہ آپ کا احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ ہمیشہ آپ کے شکر گزار رہیں گے۔ اس کے پیچھے حکمت وہ فرمان ہے:

"جو لوگوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں۔"

(جامع ترمذی، حدیث نمبر 1955)

اہلِ فقر میں جذبہ احسان مندی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ احسان کو نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ لوٹاتے بھی ضرور ہیں۔ احسان کا بدلہ دینے کے باوجود کہتے ہیں کہ میں آپ کے احسان کا بدلہ چکا نہیں پایا۔

سوال: اگر مرحوم شخص کی روح خواب میں آکر کچھ بتائے تو کیا اُسے صحیح سمجھنا چاہیے؟

جواب: لوگ اکثر خوابوں کی تعبیر جاننے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ میری اپنی زندگی میں دو مثالوں نے مجھے خوابوں کی اصل حقیقت سے روشناس کرایا۔

ایک بار دفتری ڈیوٹی کے سلسلے میں مجھے ایسے علاقے میں رہنا پڑا جہاں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا جس وجہ سے میری عبادت کے معمولات میں فرق آ گیا۔ اُن دنوں میں نے خواب میں جیٹ بلیک جرمن شیپرڈ کتا دیکھا۔ اتنی نایاب نسل کا کتا دیکھ کر میں بہت خوش تھا۔ واپس لاہور آیا اور مرشد صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں خواب سنا کر تعبیر پوچھی لیکن انھوں نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا "تمھیں دوپہر کی عبادت چھوڑے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟" میں نے اپنی مجبوری بیان کی تو کہنے لگے "خواب دراصل Warning ہے۔ عبادات چھوڑنے کی وجہ سے تمہارا نفس پھل پھول گیا ہے لہٰذا بلا تاخیر عبادات شروع کرو۔"

اسی طرح 1966ء میں جب میری عمر 22 سال تھی اور میں صبح و شام 40,42 وظائف کرنے کا عادی تھا۔ اُن دنوں میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک حویلی میں آپ ﷺ تشریف فرما ہیں۔ میں حویلی کے اندر جانا چاہتا ہوں لیکن دروازے پر موجود دربان فرشتہ مجھے یہ کہہ کر روک دیتا ہے "آپ کے داڑھی نہیں اس لیے آپ نہیں مل سکتے۔" میں نے فرشتے سے کہا "آپ ﷺ نے مجھے تو داڑھی معاف فرما دی ہے۔ یقین نہیں آتا تو میں آپ کو ابھی Confirm کروا دیتا ہوں۔" جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے میں نے فوراً کہا "حضور ﷺ اسے مان نہیں رہے کہ آپ ﷺ نے مجھے داڑھی معاف فرما دی ہے۔" میری اس بات پر آپ ﷺ نے Broad smile دی۔ فرشتے نے Affirmative سمجھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس خواب کے چند دن بعد میرے آفس میں ایک بہت ہی نیک صاحب کسی کام کے سلسلے میں تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران میں نے اُن سے اپنا خواب بیان کیا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے "بیٹا! کیا تم درود پاک کثرت سے پڑھتے ہو؟" میں نے کہا "جی۔" پھر بولے "کیا اس میں ناغے کیے ہیں؟" میں نے کہا "جی۔" کہنے لگے "تمہاری یہ کوتاہی اس بار تو معاف ہو گئی ہے آیندہ محتاط رہنا۔"

یوں پتہ چلا کہ خوابوں کی تعبیر بعض اوقات وہ نہیں ہوتی جو ہم فرض کیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں خوابوں کی تعبیر میں بہت سے Factor دیکھے جاتے ہیں۔ مثلاً خواب دیکھنے والے کی رُوحانی کیفیت کیا ہے؟ وہ تقویٰ و پرہیزگاری کے کس مقام پر ہے؟ رات کے کس پہر میں خواب دیکھا، سونے سے پہلے کے معمولات و معاملات کیا تھے؟

میں تو آپ سے یہی گزارش کروں گا کہ خواب دیکھیے اور قہقہہ لگا کر اُسے فراموش کر دیجیے۔ یہ مسلمان کی شان نہیں کہ وہ شگون لیتا پھرے اور ہر وقت خوابوں کی تعبیر کے پیچھے دوڑتا پھرے۔ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ ہر حال میں رب پر بھروسا اور یقین رکھے اور اس ایمان کے ساتھ جیے کہ میرا رب موجود ہے۔ وہ سب سے بڑھ کر مہربان ہے۔ ہر وقت میرا خیال رکھتا ہے اور اپنی رحمت کا سایہ مجھ پر کیے ہوئے ہے۔ انسان کے دلیر ہونے کے لیے رب تعالیٰ پر یہ بھروسا ہی کافی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی چیز انسان کو پریشان نہیں کر سکتی اور نہ ہی اُسے واہموں اور وسوسوں کا شکار کر سکتی ہے۔

سوال: مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: مرحومین کے لیے ہم مغفرت کی دعا کریں اور نیک کاموں کا ثواب مرحومین کی رُوح کو بخش دیں۔ بھوکے کو کھانا کھلانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت پسندیدہ عمل ہے۔ ہمارے گھر میں روزانہ جو کھانا پکتا ہے اگر اس میں سے روز ہم ایک دو مستحقین اور مساکین کے لیے کھانا نکال لیا کریں تو یہ اللہ کو بہت بھائے گا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جن لوگوں کا دسترخوان وسیع ہوتا ہے اور جو لوگوں کو گھیر گھار کر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے رزق میں بہت برکت عطا فرماتا ہے وہ نا گہانی آفات سے بچے رہتے ہیں۔

اگر ہم لوگوں کو اللہ کے نام پر کھانا کھلا دیں اس نیت کے ساتھ کہ اس کا ثواب ہمارے مرحوم عزیز، دوست یا رشتہ دار کی رُوح کو پہنچے تو اُن مرحومین کو بھی فائدہ ہو جائے گا اور ہمیں بھی بے پناہ اجر عطا ہوگا۔

ایک اور کام بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو حالات کے جبر کے تحت مقروض ہو گئے ہوں، ہم حسبِ توفیق نہایت عاجزی اور خوب صورتی سے اُن کا قرض ادا کر دیں۔ اللہ کو ہمارا یہ عمل بھی بہت پسند آئے گا۔ ہم اس کا ثواب بھی مرحومین کی رُوح کو پہنچا سکتے ہیں۔

علم لدنی

سوال: علم لدنی کا منبع کیا ہے؟

جواب: علم لدنی کے بہت سے حصے کو مخفی رکھنے کا حکم ہوتا ہے۔ علم لدنی پر بات کرنا گویا دو دھاری تلوار پر چلنا ہے کہ کہیں کوئی مخفی بات عیاں نہ ہو جائے۔

جہاں تک علم لدنی کے منبع کا تعلق ہے۔ عرش معلی پر جہاں مقام محمود ہے اس کی ایک سائیڈ پر لوح محفوظ ہے اور وہاں ایک مقام "بحر نور" بھی ہے یہ نور کا ایک سمندر ہے۔ اسی سمندر سے علم لدنی جاری ہوتا ہے۔

بحر نور سے 118 علوم کی شاخیں جاری ہوتی ہیں جن میں سے چار کا تعلق خالصتاً علم الغیب و الشھادۃ سے ہے جو قطعی طور پر مخفی ہے۔ بقیہ 114 شاخوں سے مزید ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ علوم کی شاخیں نکلتی ہیں۔ موجودہ دور جسے ہم ترقی یافتہ دور کہتے ہیں اور دنیا کو گلوبل ولیج (Global Village) کا نام دیتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ علوم میں سے صرف 18 ہزار علوم انسان ابھی تک دریافت کر پایا ہے۔

مصری اور رومی تہذیبیں کسی زمانے میں اپنے عروج پر تھیں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق ان تہذیبوں کے آثار بتاتے ہیں کہ وہ قومیں ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھیں اور ہم سے کہیں زیادہ Advanced technology سے استفادہ کر رہی تھیں۔

یہ دونوں تہذیبیں اپنے اپنے وقت میں صرف 50 ہزار علوم دریافت کر پائی تھیں اور علم کی اس معراج پر پہنچ گئی تھیں جہاں علم کی زیادتی کے باعث وہ بھٹک گئیں اور تباہ ہو گئیں۔ اگر آج ہم علم لدنی کے سمندر سے نکلنے والے ان علوم کی 50 ہزار کی تعداد تک پہنچ جائیں تو ہم اس مقام پر جا پہنچیں گے جہاں ایک چرواہے نے زمین پر چند لکیریں کھینچنے کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام سے کہا تھا "زمین و آسمان میں چہار جانب حضرت جبرائیل علیہ السلام کہیں موجود نہیں۔ اب وہ یا تو تم ہو سکتے ہو یا میں۔"

آپ ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے اور رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شاہد کرنے کے لیے ان مقامات کی جسمانی طور پر سیر کرائی جن سے آپ ﷺ روحانی طور پر پہلے ہی واقف تھے۔ جب آپ ﷺ

اللہ تعالیٰ سے روبرو ملاقات کے لیے مقام محمود پر تشریف فرماتے تب آپ ﷺ نے اس عرش پر بھی نظر ڈالی تھی۔ اس ملاقات میں آپ ﷺ کو حروف مقطعات پر مبنی کائنات کے اسرار کا تحفہ عطا فرمایا گیا تھا۔ ان حروف مقطعات کی کل تعداد 14 ہے اور 29 سورتوں کا آغاز ان حروف سے ہوتا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سورتوں کی تعداد 29 ہی کیوں ہے؟ علم جفر کی رو سے 29 کا مجموعہ 11 ہے جو مزید ایک برابر دو ہو کر واحد ہندسہ میں تبدیل نہیں ہوتا بلکہ ایک جمع ایک ہی ہوتا ہے۔

پہلے ایک سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اور دوسرے ایک سے مراد آپ ﷺ ہیں۔

رب تعالیٰ نے کائنات کے اسرار جب آپ ﷺ پر واضح فرمائے تو ان میں اسماء الحسنیٰ بھی شامل تھے۔ اسماء الحسنیٰ میں بعض نام ایسے ہیں جن کے ورد سے چھوٹے موٹے امراض پلک جھپکنے میں دور ہو جاتے ہیں۔ کچھ اسماء الحسنیٰ کے ورد سے رب تعالیٰ کی رحمت سے بڑی بڑی مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔ اسماء الحسنیٰ میں سے ایک ایسا بھی اسم ہے جسے اسم اعظم کہا جاتا ہے اور جس سے رب تعالیٰ بڑی سے بڑی مشکل پلک جھپکنے میں دور فرما دیتا ہے۔

حروف مقطعات کے اسرار کو واضح نہیں کیا گیا۔ اس کا مکمل علم کسی کو بھی عطا نہیں کیا گیا۔ بڑے سے بڑا ولی اللہ بھی اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پاتا ہے۔ اس کے تمام اسرار صرف ایک ہستی یعنی آپ ﷺ پر عیاں کیے گئے کیوں کہ آپ ﷺ انسان کامل ہو کر انسان مدلل بن گئے اس لیے آپ ﷺ پر علم کامل واضح کر دیا گیا۔

ولایت کے دس درجے ہیں لیکن تصوف کے چاروں سلاسل میں ان درجوں کی گریجویشن مختلف انداز میں ہوئی۔ سلسلہ چشتیہ میں 100 درجے ہیں لیکن ان کی گریجویشن دس کی ہے۔ یوں درحقیقت تو وہ دس درجے ہی بنتے ہیں۔ کسی سلسلے میں کل درجات 50 ہیں اور گریجویشن 5 کی ہے۔ یوں وہ بھی 10 درجے ہی بنتے ہیں۔ اسی طرح علم لدنی جن لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے ان کی بھی دس ہی اقسام ہیں۔ اعلیٰ ترین مقام آپ ﷺ کا ہے۔ اس کے بعد ان انبیا کا درجہ ہے جو صاحب کتاب ہیں۔ پھر ان پیغمبروں کا درجہ ہے جن پر مختلف صحائف نازل ہوئے۔ اس کے بعد ان انبیا کا درجہ ہے جو صاحب کتاب تو نہیں تھے لیکن انھوں نے پہلے سے نازل ہونے والی شریعت کو Endorse کیا۔ اس کے بعد اولیائے کرام میں سے سب سے بلند پایہ ولی اللہ کا درجہ ہے۔ باقی پچھلے درجے کے اولیائے کرام اس کے بعد والے درجے میں آتے ہیں حتیٰ کہ نواں درجہ شہداء کا ہے۔ اس کے بعد عام ولی اللہ آتے ہیں۔ یوں علم لدنی کے دس درجات ہیں اور ہر ایک پر اس کے درجے کے لحاظ سے علم وا ہوتا ہے۔

تصوف سے متعلق کوئی ایسی جہت نہیں جو ان حروف مقطعات سے پوری نہ ہوتی ہو۔ حروف مقطعات میں سے ایک حرف ایسا ہے جسے پڑھنے سے دست غیب حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ دست غیب دو طرح کا ہے۔

1۔ غیب سے اتنے وسائل میسر آنے لگتے ہیں کہ بنیادی ضروریات پوری ہونے لگتی ہیں اور جسم و روح کا

رشتہ قائم رکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ یہ دستِ غیب Safe ہے۔ اس میں کوئی خطرہ نہیں۔

2۔ دستِ غیب کی دوسری قسم میں بہت وسیع رزق ملتا ہے لیکن اس میں پابندی بہت ہے۔ اگر آپ نے پیسے کو لی یا پیسہ کسی ایسی جگہ خرچ کر دیا جہاں ایسا کرنا مناسب نہیں تھا تو اس کی سزا بعض اوقات موت کی صورت میں ملتی ہے۔ اس لیے اس دستِ غیب کو خطرناک کہا جاتا ہے۔

حروفِ مقطعات میں سے ایک ایسا حرف ہے جس کو پڑھنے سے رزق وسیع ہونے لگتا ہے۔ انہی حروف میں ایک ایسا حرف بھی ہے جس کو پڑھنے سے کشف جاری ہو جاتا ہے اور کرامات حاصل ہونے لگتی ہیں۔ ان حروفِ مقطعات کو پابندی کے ساتھ ایک مخصوص تعداد میں مکمل شرائط کے ساتھ پڑھا جائے تو سب کچھ حاصل ہونے لگتا ہے۔

یہاں عرض کرنا چاہوں گا کہ شہداء کے بعد جن اولیاء اللہ کا درجہ ہے انھیں علمِ لدنی کی محض ایک ہلکی سی جھلک عطا ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک ہلکی سی جھلک بھی انسان کو علم کی ایسی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے جو Beyond Imagination ہے۔ یہ وہ ولی اللہ ہوتے ہیں جن کا دل رحم سے بھرا ہوتا ہے، جو کسی کا دکھ اور درد نہیں دیکھ سکتے، کسی کو دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر اپنا سب کچھ ان پر لٹا دیتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے کہ جس کو اپنانے سے اللہ کی مہربانیوں کی بارش میں انسان بھیگنے لگتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی علمِ لدنی کی راہ پر قدم رکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ خلقِ خدا پر مہربان ہو جائے۔ رب اس پر مہربان ہوگا۔

سوال: Gem اور Stones کا انسانی زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے؟

جواب: اسلام میں شگون لینے کی اجازت نہیں۔ مسلمان تو بہت پختہ عقیدہ کا مالک ہوتا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جس چیز سے Avoid کرنا چاہتا ہے وہ ہے 'موت'۔ موت جیسی چیز کے بارے میں بھی اسلام نے مسلمان کو ایک زبردست عقیدہ فراہم کیا کہ موت اٹل ہے۔ اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ ہر وہ جاندار جو اس دنیا میں آیا ہے اسے موت کا ذائقہ ایک روز ضرور چکھنا ہے۔

انسان جب یہ اٹل حقیقت جان جاتا ہے تو موت کے حوالے سے اُس کا عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ مجھے آج نہیں تو کل اپنے رب کے حضور حاضر ہونا ہے۔ یوں وہ موت سے ہر وقت خوف زدہ رہنے کے بجائے اُس کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ انسان کو موت کے مقررہ وقت سے بے خبر رکھنے میں بھی ایک حکمت پوشیدہ ہے۔

اگر ایک فوجی سے یہ کہہ دیا جائے کہ جنگ اٹل ہے اور تمھیں ہر صورت محاذ پر جانا ہے تو وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو جائے گا لیکن اگر اسے یہ کہا جائے کہ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ابھی اسی لمحے یا کچھ عرصے بعد تمھیں جنگ پر بھیج دیا جائے۔ ایسی صورت میں وہ فوجی ہر لمحہ محاذ پر جانے کے لیے تیار رہے گا کہ نہ جانے کب مجھے بلا لیا جائے۔

مسلمان موت کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے کہ نہ جانے کب اللہ کی طرف سے بلاوا آ جائے اور مجھے

یہ دُنیا چھوڑ کر جانا پڑے۔ اسی سوچ کے تحت وہ اپنا نامۂ اعمال اور تمام معاملات درست حالت میں رکھنے لگتا ہے۔

یوں موت جیسی اٹل حقیقت کے بارے میں بھی رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو عقیدہ عطا فرمایا اور انھیں شگون لینے سے منع کیا۔ اس لیے ہم Gem اور Stone سے شگون نہیں لے سکتے کہ فلاں پتھر پہننے سے ہماری تقدیر بدل جائے گی۔ تقدیر بدلنے پر صرف رب قادر ہے۔ کوئی ولی اللہ خواہ کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو اس کے اختیار میں نہیں کہ رب کی مرضی کے خلاف ایک تنکا بھی توڑ سکے۔ کسی بندے سے یہ کہنا شرک ہے کہ تمہارے اختیار میں ہے جو چاہے کام کرو۔

تمام قوتیں اللہ ہی کے پاس ہیں۔ صرف وہی ہے جو لوگوں کے دُکھ درد دور کرسکتا ہے اور لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

دُنیا کا کوئی ولی اللہ کسی چیز پر قادر نہیں۔ وہ بھی اسی رب کا محتاج ہے جس کے ہم سب محتاج ہیں۔ تو جو خود محتاج ہو وہ دوسرے محتاجوں کی کیا مدد کرے گا۔ اس لیے اس دھوکے سے نکل آئیے۔ کوئی ولی اللہ کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ تمام قوتیں تمام اختیارات صرف رب تعالیٰ کے پاس ہیں البتہ وہ جسے چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ اگر رب تعالیٰ کسی انسان کو مستجاب الدعوات کے مقام پر فائز کر دے تو یہ رب تعالیٰ کی عنایت ہوگی۔ اس شخص کا استحقاق نہیں ہوگا۔

یہ پتھر تو پھر بے جان ہیں۔ یہ کسی کے لیے کیا کریں گے؟ رب تعالیٰ نے یہ دُنیا عالم الاسباب بنائی۔ ہر شے کا ایک سبب بنا دیا۔ جب وہ کسی کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے لیے موافق حالات اور اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

رب تعالیٰ نے کچھ چیزوں میں خاصیت رکھی ہے جیسے نیم کے درخت کے پھل میں ایسی تاثیر رکھی ہے کہ اس کو کھانے سے انسان بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ نیم کے پتے کمرے میں رکھ دیے جائیں تو وہاں مکھیاں اور مچھر نہیں آتے۔ بظاہر تو ہم کہتے ہیں کہ نیم کے پتوں اور شہد میں بہت تاثیر ہے لیکن درحقیقت سب کچھ کرنے والی ذات تو صرف رب ہی کی ہے۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے رنگوں اور شعاعوں میں انسان کے لیے شفا رکھی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہے۔ جو چیز ہمیں کسی خاص رنگ میں دکھائی دیتی ہے وہ ایک رنگ کو جذب کر کے باقی رنگوں کو Reflect کر رہی ہوتی ہے۔

رب تعالیٰ نے ان رنگوں اور شعاعوں میں ایسی تاثیر رکھی ہے کہ ان سے انسان صحت مند ہو جاتا ہے۔ پرانے گھروں، چرچ اور مندروں میں آپ نے رنگین شیشوں والی کھڑکیاں دیکھی ہوں گی۔ وہ رنگ بہت سوچ سمجھ کر منتخب کیے جاتے ہیں۔ ان میں عموماً سفید رنگ نہیں ہوتا۔ زیادہ تر نیلے شیشے کا استعمال ہوتا ہے جس میں سرخ Patches لگے ہوتے ہیں۔ جب سورج کی شعاعیں ان شیشوں پر پڑتی ہیں تو اندر جانے والی روشنی ان

شیشوں سے Filter ہو کر جاتی ہے۔ چونکہ شیشے کا زیادہ تر حصہ نیلے رنگ پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے اندر سکون کا ایک ماحول بن جاتا ہے اور ایسے ماحول میں اگر عبادت کی جائے تو یکسوئی بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیلے شیشوں میں سرخ رنگ کے Punctuation کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کہیں نیلے رنگ سے اتنا سکون نہ پیدا ہو جائے کہ انسان کو نیند آنے لگے۔ سرخ رنگ انسان کو Active رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض عمارتوں میں سبز شیشوں کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ رنگ پاکیزگی کا احساس دلاتا ہے۔

شعاعوں کی طرح رنگوں سے بھی باقاعدہ علاج کیا جاتا ہے۔ پانی کو نیلے رنگ کی بوتل میں دھوپ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے اسے دوبارہ کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے اور اگلی صبح سورج نکلنے کے بعد دوبارہ دھوپ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ سات دن تک جب یہی عمل دہرایا جاتا ہے تو سورج کی جو شعاعیں نیلی بوتل کے شیشے سے Filter ہو کر پانی تک پہنچتی ہیں اور اس پانی کے اندر ان شعاعوں کے اثرات داخل ہوتے ہیں۔ یہ پانی بعض امراض میں شفا دیتا ہے۔

اسی طرح جن لوگوں کے سر کے بال گرتے ہیں وہ تیل کو ایک مخصوص رنگ کی بوتل میں بھر کر سورج کی شعاعوں میں سات دن تک رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اسی تیل کو کسی اور رنگ کی بوتل میں ڈال کر مزید سات دن تک سورج کی شعاعوں میں رکھا جاتا ہے۔ پھر اس تیل کو دو دن کے لیے اوس میں رکھا جاتا ہے تاکہ اس میں ٹھنڈک پیدا ہو جائے۔ اس تیل کے استعمال سے بال گرنا بند ہو جاتے ہیں۔

انسان کی ذہنی صلاحیتیں بیدار کرنے میں رنگوں کا کردار بہت اہم ہے۔ اسی طرح جب ہم کوئی پتھر انگلی میں پہنتے ہیں تو سورج کی شعاعیں اس پتھر سے Filter ہو کر براہِ راست ہمارے جسم میں جذب ہو جاتی ہیں۔ جس سے ہماری Body chemistry اور ذہنی کیفیت تبدیل ہونے لگتی ہے۔ ہمارے رویے بدلنے لگتے ہیں۔ رویوں کی تبدیلی سے احوال بھی تبدیل ہونے لگتے ہیں اور تب ہم کہتے ہیں کہ فلاں پتھر بہت مبارک ہے۔ اس کے پہننے سے ہمارے حالات خوشحال ہو گئے۔ یہ اس کی سائنسی توجیہ ہے لیکن بحیثیت مسلمان ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں پتھر مبارک اور فلاں پتھر نحس ہے اور اس کے پہننے سے فائدہ یا نقصان ہو گا۔

سوال: علم لدنی کیا خالصتاً عطا ہے یا محنت کے انعام کے طور پر ملتا ہے یا کسی مقام پر عطا ہوتا ہے؟

جواب: علم لدنی دو طرح سے ملتا ہے

"آپ اسے Earn کرتے ہیں اور اس Earn کرنے میں بھی فیصلہ رب کا ہے کہ دینا ہے یا نہیں دینا۔ ایسا نہیں کہ جس طرح ایک مزدور جب صبح سے شام تک سر پر اینٹیں اٹھا کر مزدوری کرتا ہے تو شام کو اسے اجرت ضرور ملتی ہے۔ علم لدنی کو دینا یا نہ دینا خالصتاً اللہ کا اپنا استحقاق ہے لیکن بہر حال یہ محنت سے ملنا ممکن ہے۔

علم لدنی کے حصول کا دوسرا طریقہ خالصتاً عطا ہے۔ اللہ رب العزت جسے چاہے علم لدنی عطا کر دے۔

جہاں تک کسی خاص مقام پر پہنچنے کے بعد علم لدنی عطا ہونے کی بات ہے جس طرح ہم پانچ سال کے

بچے کے سر پر بھاری گٹھڑی نہیں رکھ سکتے کیوں کہ اُس کا نرم و نازک جسم اس بوجھ کو اُٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ البتہ جب وہی بچہ دس بارہ سال کا ہو جائے تو آٹھ دس کلو وزنی گٹھڑی اُٹھا کر حرکت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح جب تک ہماری رُوح لطافت اور بالیدگی کے اُس مقام تک نہیں پہنچ جاتی جہاں ہمیں علم دے دیا جائے۔ جب تک ہمارے طور طریقے اور زندگی گزارنے کا ڈھب ایسا نہیں ہو جاتا کہ ہم علم کو وصول کرنے کے قابل ہو جائیں تب تک علم لدنی ہمیں عطا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ہم محنت کرتے رہیں اور اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لیں تو پھر بالآخر ہمیں علم عطا ہو جاتا ہے۔

باتیں علم کی!

عرش پر بحرِ نور اللقاء ہے .... اس نور کا تعلق رب تعالیٰ سے ہے۔ بحرِ نور اللقاء سے Initially 118 علوم کی نہریں برآمد ہوتی ہیں۔ چار کا تعلق خالصتاً علم الغیب و الشہادۃ سے ہے۔ یہ علم خالصتاً اللہ کے پاس مخفی ہے۔ باقی 114 علوم کا تعلق مخلوق سے ہے۔ اگر اللہ چاہے تو مخلوق میں سے جسے جتنا چاہے اس میں سے عطا کر دے۔ ان 114 علوم میں سے Further ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ علوم برآمد ہوتے ہیں۔

مخلوق سے متعلق علوم کی تعداد 114 ہے۔ قرآن پاک کی سورتوں کی تعداد بھی 114 ہے۔ اس تعداد کا یکساں ہونا بے معنی نہیں ہے۔ اس راز سے پردہ اٹھانے اور اس پر تفصیلی گفتگو کرنا منع ہے۔ البتہ ایک جھلک ضرور پیش کی جا سکتی ہے۔

ہر سورت سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم انیس 19 حروف پر مشتمل ہے۔ اگر آپ 114 سورتوں کو 19 پر تقسیم کریں تو جواب 6 چھ آئے گا۔ چھ کا ہندسہ Formation of Universe سے تعلق رکھتا ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بارے میں تصوف میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہم اسے ایک دائرے میں اس طرح لکھیں کہ Upper Hemisphere میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھیں اور Lower Hemisphere میں آپ ﷺ سے متعلق کلمہ طیبہ کا حصہ لکھ دیں اور درمیان میں اللہ لکھ دیں تو یہ اللہ کی مہر بن جاتی ہے۔ تصوف کے علاوہ ایک کے سوا ہر سورہ سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے میں ایک حکمت پوشیدہ ہے۔ یہ دراصل تصدیق ہے کہ بعد میں کہا جانے والا کلام درحقیقت کلام الٰہی ہے۔

جہاں تک بسم اللہ الرحمن الرحیم کے 19 حروف کا تعلق ہے۔ ان 19 حروف کو اگر Single digit میں لے جائیں تو یہ ایک بنتا ہے اور وہ ایک رب تعالیٰ کو ظاہر کرتا ہے جو توحید کی طرف اشارہ ہے۔ توحید کے تین حصے ہیں۔

ایک سے تو ہم بھی واقف ہیں کہ توحید کے معنی اللہ کی یکجائی، وحدانیت اور احدیت ہے۔ توحید کا پہلا

حصہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کو ایک جانا جائے۔ وہ یکتا و لاثانی ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں۔

توحید کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ہم رب تعالیٰ کو اس کی تمام تر صفات کے ساتھ دل سے تسلیم کر لیں کہ وہ یکتا ہے اور یہ سب اس کی صفات ہیں۔ اس کو ہم ان تمام صفات کے ساتھ اپنا رب مانیں۔

توحید کا تیسرا حصہ یہ ہے کہ ہم رب تعالیٰ کو عقل کے دائرے میں نہ لائیں۔ انسانی عقل محدود ہے۔ محدود چیز لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ہماری محدود عقل بھی نور بصیرت کی محتاج ہے کہ جس کو جتنا نور اور علم عطا ہوا اتنی ہی اس کی عقل ہوگی۔ چونکہ ہماری عقل نور بصیرت کی محتاج ہے اس لیے اگر ہم کسی کسوٹی پر رب تعالیٰ کو پرکھنے کی کوشش کریں گے تو بھٹک کر رہ جائیں گے۔ لہٰذا توحید کا تیسرا حصہ یہ ہے کہ ہم رب تعالیٰ کی احدیت اور صفات کو عقل کے حالے میں نہ لائیں۔

سوال: اللہ الصمد کے معنی ہیں "اللہ بے نیاز ہے"۔ ہم اللہ کو الصمد بھی کہتے ہیں اور رحمٰن و رحیم بھی۔ جو صمد ہے وہ رحمٰن و رحیم کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب: ابھی میں نے گزارش کی ہے کہ ہم رب تعالیٰ کی وحدانیت و صفات کو عقل سے نہ پرکھیں۔ یہی توحید ہے کیونکہ ہماری عقل محدود اور رب تعالیٰ لامحدود ہے۔

اللہ الصمد کے معنی ہیں "اللہ بے نیاز ہے"۔ الصمد یا صمد اور اللہ الصمد تینوں الفاظ ایک ہی وزن پر پڑھیں جائیں تو ان کے یکساں اثرات حاصل ہوتے ہیں۔

اللہ کے اس صفاتی نام کے ورد کے اثرات یوں تیزی سے مرتب ہوتے ہیں کہ پہلے وہ شخص دنیا سے ملنے جلنے سے جاتا ہے، پھر کھانے پینے سے بے رغبتی اختیار کرتا ہے اور پھر وہ وقت آتا ہے جب وہ اپنے لباس تک سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اہل فقر اور صاحبان علم کسی شخص کو اللہ کے اس صفاتی نام الصمد کے ورد کی تلقین نہیں کرتے کیونکہ اس سے انسان میں تارک الدنیا ہونے کی صفات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ جو خلاف سنت ہے۔

سنت طریقہ تو یہ ہے کہ انسان تمام دنیاوی معاملات اس خوش اسلوبی سے سرانجام دے جس خوش اسلوبی سے آپ ﷺ نے سرانجام دیے۔

الصمد کا مطلب "بے نیاز" ہے۔ بے نیاز سے مراد یہ نہیں کہ رب کسی بندے کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ بے نیاز سے مراد یہ ہے کہ اسے انسان سے کسی چیز کی حاجت نہیں حتیٰ کہ وہ ہماری عبادات تک کا محتاج نہیں۔ اسے ہماری عبادات کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی اسے اس چیز کی حاجت ہے کہ ہم اس کی تعریف بیان کریں۔ وہ اس چیز سے بھی بے نیاز ہے کہ کوئی اسے مانتا ہے یا نہیں، کوئی اس کی تعریف کرتا ہے یا نہیں۔ وہ ہر شے، ہر رشتے اور ہر حاجت سے بے نیاز ہے۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اسے کسی عزیز، رشتے یا اولاد کی ضرورت نہیں۔ وہ ان تمام حاجات سے بے نیاز اور ان سب سے بہت بلند ہے۔

اللہ ان معنوں میں الصمد ہے۔ ان معنوں میں نہیں کہ وہ اپنے بندوں سے (معاذ اللہ) بے پرواہ ہے۔

وہ اپنے بندوں سے ہر ماں کی نسبت 70 گنا زیادہ پیار کرتا ہے۔ وہ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی۔ وہ اس دنیا میں رحمٰن ہے کہ دیتے ہوئے دیکھتا نہیں کہ کون اسے مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، کون مشرک اور سرکش ہے اور کون فرماں بردار ——— وہ سب کو دیتا ہے اور بغیر حساب کے دیتا ہے۔

یوم حساب وہ رحیم ہوگا۔ وہاں وہ انسان کے اعمال، اس کا عقیدہ اور ایمان سب کو پرکھنے کے بعد فیصلہ دے گا۔ پس اللہ صمد بھی ہے اور رحمٰن ورحیم بھی۔ ان تمام صفات کا آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

سوال: کیا Stock Exchange میں Shares کی خرید وفروخت جائز ہے؟ کیا اس پر زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

جواب: علما اور مفتی حضرات کے مطابق شیئرز کا کاروبار جائز نہیں۔ جب کاروبار ہی جائز نہیں تو پھر اس پر زکوٰۃ بھی نہیں بنتی۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی شخص لاٹری کے نتیجے میں حاصل ہونے والی آمدنی پر زکوٰۃ ادا کر کے اُسے جائز سمجھنا شروع کر دے۔ حالاں کہ وہ جائز نہیں۔

سوال: اللہ ایک طرف قہار ہے تو دوسری طرف رحمٰن ورحیم بھی۔ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: صرف آپ کو سمجھانے کے لیے مثال دے رہا ہوں ورنہ اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق ایک سطح پر نہیں لایا جا سکتا۔ ہم میں سے کوئی صاحب اگر دوسروں کا ہر قصور اور ہر خطا آخری حد تک درگزر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بے پناہ سخی اور رحم دل ہیں لیکن اگر کوئی شخص مسلسل انھیں تنگ کرے، مسلسل نافرمانی کرے، بات نہ مانے تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اس رحم دل اور مہربان صاحب کو غصہ آجائے گا اور ان کی تمام صفات پردے کے پیچھے چھپ جائیں گی۔

رب تعالیٰ بلاشبہ بے پناہ رحیم وکریم ہے لیکن جب کوئی شخص اس کی نافرمانی سے باز نہیں آتا۔ بار بار مہلت دینے اور رسی دراز کیے جانے کے باوجود غلط راستہ نہیں چھوڑتا تو پھر وہ سزا دیتا ہے۔ رب کے رحمٰن ورحیم ہونے کی خوبی وصفت تو اس کے اندر تب بھی موجود ہوتی ہے لیکن ایسے وقت میں اس کی صفت قہاریت Exercise ہو رہی ہوتی ہے۔

یاد رکھیے! کوئی شخص اس وقت تک اچھا Administrator نہیں ہو سکتا جب تک وہ سزا دینا نہ جانتا ہو۔ صرف سخاوت اور رحم سے Administration نہیں چلائی جا سکتی۔ رب تعالیٰ تو ساری کائنات کا نظام بہت خوش اسلوبی سے چلا رہا ہے اس لیے وہ قہار بھی ہے۔

سوال: چودہ حروف مقطعات کے Combination سے اُنیس Compound words بنتے ہیں لیکن کچھ صاحبانِ علم اپنی Calculation میں کچھ حروف مقطعات کو Exclude کر دیتے ہیں۔

جواب: حروف مقطعات کی تعداد مقرر ہے اور کسی بھی حرف کو اس میں سے Exclude نہیں کیا جا سکتا۔ جب کچھ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں کوئی خاص سورہ بطور وظیفہ پڑھنے کے لیے دی جائے تو میں ان سے گزارش کیا کرتا ہوں کہ قرآن پاک کے نزول کا اصل مقصد دراصل رب تعالیٰ کا پیغام بندوں

تک پہنچانا تھا۔ اس پیغام میں اس زندگی کے بارے میں بتایا گیا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ قرآن پاک دنیا سے رغبت نہیں بلکہ دوری اور بے رغبتی کا درس دیتا ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ ہم اپنی دنیاوی ضروریات و حاجات کو قلیل رکھیں تاکہ لالچ سے بچے رہیں اور اپنی آخرت کو سنوار لیں۔ لیکن افسوس کہ ہم نے اس قرآن پاک جو دنیا سے بے رغبتی کا درس دیتا ہے، کی مختلف سورتوں، آیات اور حروف کو دنیا کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ سرکشی کی انتہا ہے۔ مختلف جگہوں پر حروف مقطعات پر بھی مختلف نقش آپ دیکھتے ہوں گے۔ جنات کو دور بھگانے، حصول رزق، دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے مختلف نقش بنائے جاتے ہیں۔ ایسی Calculations کرنے والے اور نقش بنانے والے حضرات کے نزدیک حروف مقطعات کو اگر ایک خاص ترتیب اور انداز میں لکھا جائے تو ایک خاص مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ حروف مقطعات کو دنیاوی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہوتے ہیں۔

ہم اس نشست میں کوشش کرتے ہیں کہ جب حروف مقطعات کو بیان کیا جائے تو اس کا مقصد صرف علم کو Pass on کرنا ہو۔ حروف مقطعات 14 ہی ہیں اور ان حروف کے مختلف Combinations سے 19 Compound words بنتے ہیں جن سے 29 سورتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

مختلف لوگ جو حروف مقطعات کو مختلف نقش بنانے یا دنیاوی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ ان Compound words کو اپنے حساب کی خاطر کم و بیش کر لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوح قرآنی میں حرف "ز" نہیں ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لوح قرآنی دیکھنے یا پڑھنے سے رزق میں وسعت آتی ہے۔

لوح قرآنی میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جو چار یا پانچ حروف مقطعات کا مرکب ہیں۔ اگر ان حروف کو علیحدہ علیحدہ دیکھا جائے تو کہیں یہ لوح قرآنی پانچ حروف اور کہیں تو حروف کے مختلف مرکبات پر مشتمل دکھائی دیتی ہے۔

سوال: سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر 5 کا ترجمہ ہے "رحمٰن عرش پر ہے۔"

مفسرین نے عرش کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس پر ملائکہ کھڑے ہیں۔ یہ ایک قصر، ایک دربار اور محل ہے۔ یہ اتنا بلند ہے اور اس میں اتنے ستون ہیں۔ جب کہ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عرش کا مطلب کمال علم الٰہی ہے۔

رب تعالیٰ نے بندوں کے لیے قرآن میں تجلی کی ہے۔ یہ قرآن پاک کی آیات نہیں بلکہ تجلیات ہیں۔ جب قلب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلیاں آ رہی تھیں تو ان تجلیوں کا ترجمہ اور تفسیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے۔ یہی علم الٰہی ہے۔ کائنات میں صرف ایک ہستی کو چن کر کہا گیا کہ یہ میری تجلی ہے۔ سوال یہ ہے کہ فی زمانہ وہ تجلی کون ہے؟ کہاں ہے؟ اور اس تجلی سے کیسے فیض یاب ہوا جا سکتا ہے؟

جواب: حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فصاحت و بلاغت کے بہت بلند درجے پر فائز ہیں۔

ان کی فصاحت و بلاغت کے کیا کہنے۔ میں تو سادہ سے لفظوں میں عرض کر سکتا ہوں کہ عرش معلی پر بیت المعمور ہے، لوح محفوظ ہے جس کے قریب بحرِ نور القاء ہے۔ جس میں سے 118 علوم کی نہریں نکلتی ہیں۔ جن میں سے چار کا تعلق علم الغیب و الشھادۃ سے ہے جب کہ 114 علوم رب تعالیٰ جس پر چاہے عیاں کر دے۔

قرآن پاک کلام الٰہی ہے۔ جو آپ ﷺ کی وساطت سے ہم تک پہنچا۔ اس کی 114 سورتیں ہیں۔ یہ سورتیں درحقیقت اُن علوم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جو بحرِ نور القاء سے نکلتا ہے۔

قرآن پاک کے ایک معنی ظاہری ہیں جب کہ دیگر دس مفاہیم صاحبان علم پر ہی عیاں ہوتے ہیں۔ جو صاحب علم، علم کے جس مقام پر ہوگا اسی درجے کا قرآنی مفہوم اُس پر ظاہر ہو جائے گا۔

تصوف وہ راہ ہے جس پر چلنے والا ہر شخص راہی، مسافر اور راہ رو ہے۔ منزل پر کوئی نہیں پہنچتا۔ صرف آپ ﷺ وہ ہستی ہیں جو منزل تک پہنچ پائے۔ آپ ﷺ کو معراج پر بلایا گیا۔ آپ ﷺ پہلے اور آخری بشر ہیں جنہوں نے رب تعالیٰ کو مقام محمود پر رُو برو دیکھا ہے۔ درمیان میں صرف ایک مہین سا پردہ تھا۔

تمام علوم کی معراج کو صرف آپ ﷺ ہی پہنچے۔ آپ ﷺ کو معراج کے موقع پر عطا ہونے والے 29 القابات بے وجہ نہیں تھے۔ ان القابات کے اثرات آپ ﷺ کی حیات طیبہ پر مرتب ہوئے اور آپ ﷺ نے ساری عمر ان القابات کے مطابق Behave کیا۔

سوال: حجیرہ کسے کہتے ہیں؟

جواب: حجیرہ سے مراد ایک چوکور چار دیواری ہے جس پر چھت نہ ہو۔ ہزاروں سال قبل خانہ کعبہ پر بھی چھت نہ تھی اس لیے اسے حجیرہ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قبلہ اوّل اور روضہ مبارک بھی حجیرہ کہلاتے ہیں۔

صراطِ مستقیم

سوال: جب کوئی ہم سے حال احوال پوچھتا ہے تو ہم شکایتوں کی ایک لمبی فہرست لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شکوے کو شکر میں کیسے بدلا جائے؟

جواب: جب کوئی ہم سے حال احوال پوچھتا ہے تو ہم شکایتوں کی ایک لمبی فہرست لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی یہ کہہ بھی دیں کہ اللہ کا شکر ہے تو بین السطور ایک ہلکی سی آواز پوشیدہ ہوتی ہے۔ ''شکر کا ہے کا، دیا کیا ہے؟''

دعا تمام مذاہب کا حصہ ہے ــــ سکھ، زرتشت، مسلمان غرض یہ کہ ہر مذہب کا انسان جب دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سنتا اور قبول کرتا ہے۔ جب برصغیر میں Staunch ہندو اپنے سوا کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کو برداشت نہ کرتے تھے تو ایسے میں وہاں بزرگانِ دین کی آمد ہوئی اور انھوں نے ہندوؤں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے دعا کو ذریعہ بنایا۔ بالکل اس طرح جیسے مداری ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ بزرگانِ دین کے پاس لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے دعا کرانے آتے جس سے انھیں اولیاء اللہ کے کردار اور خصائل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا۔ اور یوں وہ ان کے اعمال و کردار کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جایا کرتے تھے۔

پاکستان ایک مسلمان ملک ہے اس لیے یہاں دعا کو بطور ڈگڈگی لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہاں لوگوں کے لیے دعا کا سلسلہ قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس طریقہ زندگی کی جانب راغب ہوں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ہماری زندگی میں شکوے کی جگہ شکر آ جائے۔ ہمیں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے اور اللہ سے دعا گو بھی رہنا چاہیے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ گناہ گاروں کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے۔ نیکو کاروں کو تو وہ رلاتا رہتا ہے کہ دعا مانگتے رہو کیوں کہ مجھے تمھارا دعا مانگنا بہت اچھا لگتا ہے۔

سوال: تصوف میں منزل اور درجے میں کیا فرق ہے؟

جواب: تصوف اور روحانیت کی راہ میں آپ ﷺ کے علاوہ سبھی راہ رو اور مسافر ہیں۔ صرف آپ ﷺ کو منزل ملی ہے۔

منزل اور درجے میں فرق ہے۔ ولایت کے دس درجے ہیں۔ یہ درجات ایک Measurement ہیں کہ کسی ایک مقام پر رہتے ہوئے آپ کے پاس کس درجے کا علم ہے۔

تصوف میں 19 منزلیں ہیں۔ پہلی منزل اخیار کی ہے۔ جنہیں اکثر خود اپنے مقام کا علم نہیں ہوتا۔ ان کی تعداد ایک وقت میں پوری دنیا میں 40,000 ہوتی ہے۔

اسی طرح 19 ویں منزل بنی نوع انسان کے لیے آخری منزل ہے۔ اس پر صرف ایک ہی ہستی فائز ہیں "آپ ﷺ"۔ آپ ﷺ کے علاوہ کوئی اس منزل پر نہ پہنچا اور نہ پہنچ سکتا ہے۔

اس سے پچھلی 18 ویں منزل ہے۔ اس منزل پر بھی ایک ہی شخصیت فائز ہیں "حضرت علی کرم اللہ وجہہ" جنہیں باب العلم اور ابوتراب کہا جاتا ہے۔ اس منزل پر فائز ہونے کی وجہ سے آپ امام طریقت کہلاتے ہیں۔

17 ویں منزل پر وہ بارہ ائمہ کرام فائز ہیں جن کا تعلق اہل بیت سے ہے۔ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ بھی انہی ائمہ کرام میں سے ہیں۔

یوں تصوف میں 19 منزلیں ہیں اور ہر منزل میں تصوف کے دس درجات ہیں جو علم کو Measure کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں کہ ایک منزل پر جو شخص بیٹھا ہے وہ علم کے کس درجے پر ہے۔ جیسے 'امام' کا مقام ہے، یہ 17 ویں منزل ہے لیکن اس کے اعلیٰ ترین درجے پر حضرت امام حسینؓ فائز ہیں۔ آپؓ کے پاس اس منزل کا دسواں درجہ ہے۔ حضرت امام حسنؓ اور دیگر ائمہ کرام اسی منزل پر ہیں لیکن ان کے علم کا درجہ مختلف ہے۔

سوال: صراط مستقیم کیا ہے؟

جواب: صراط مستقیم وہ ہے جس پر رب تعالیٰ ہمیں چلانا چاہتا ہے اور جس پر Dos اور Do nots صراحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان اوامر و نواہی کی پابندی سے ایک سیدھا خط کھنچ جائے گا جو صراط مستقیم کہلائے گا یوں بھی کہہ لیجیے کہ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ ہی صراط مستقیم ہے۔ اس کی پیروی کرلی جائے تو ہم صراط مستقیم پر چلنے لگیں گے۔ لیکن اسلامی احکامات میں ہم اپنی Hearing اور Vision کو Selective نہ کریں کہ ہم صرف وہ سنیں اور دیکھیں جو ہمیں پسند ہے اور جو ہمیں دشوار اور اپنے مفاد میں نہ لگے اسے ہم نظرانداز کر دیں۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کی پیروی کرتے وقت Selective ہونے کے بجائے ہر ہر معاملہ میں ہم آپ ﷺ کی تقلید کرتے چلے جائیں۔ یوں ہم صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں گے اور اللہ کے پسندیدہ بندے ٹھہریں گے۔

سوال: پہاڑ نے قرآن پاک کا وزن اٹھانے سے انکار کیا لیکن حضرت آدم علیہ السلام نے حامی بھرلی، ایسا کیوں؟

جواب: ایسا نہیں کہ قرآن پاک پہاڑ پر نازل کیا گیا اور اس نے انکار کر دیا۔ البتہ قرآن پاک میں یہ ضرور

واضح ہے کہ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ اس کی practical demonstration (عملی مظاہرہ) رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کر کے بھی دکھایا تھا۔

کچھ عرصہ قبل انگلینڈ میں ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا "پہاڑ پر رب تعالیٰ نے اپنی تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا جب کہ انسان نے اسے برداشت کیا اور Absorb کر لیا۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟"

میں نے عرض کیا "پہاڑ بے جان ہے۔ اس کے اندر سوائے پتھروں کے کچھ نہیں۔ اس کے برعکس پیغمبر نور الہدیٰ المتقین سے بنائے گئے ہیں اور یہ نور اللہ کے نور کا حصہ ہے۔ چونکہ اللہ کے نور سے انبیا کی ارواح تخلیق ہوئیں اس لیے اس نور پر اگر اللہ ہی کی تجلی پڑے گی تو فرق نہیں پڑے گا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ اگر بجلی کی ایک لائن جاری ہو اور اس میں 132kVA کا کرنٹ دوڑ رہا ہو اور آپ اس میں 220 وولٹ کی بجلی خود joint کر لیں تو کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔

ان دونوں کو Equalise کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ آپ کو ایک ٹرانسفارمر لگانا پڑے گا لیکن اگر اس بجلی کو زمین پر بکھرے پانی سے Touch کریں گے تو اس میں شعلے بھڑکنے لگیں گے یا پھر کسی اور چیز سے بجلی مس کر جائے تو وہ Earth ہو جائے گی۔

بالکل اسی طرح ایک نور کل اور دوسرا اسی نور کل کا حصہ ہے۔ فرق وہی ہے جو 132kVA کے کرنٹ اور 220 وولٹ کے کرنٹ میں ہے۔ کرنٹ کی شدت خواہ کم و بیش ہو لیکن رہتی وہ بجلی ہی ہے اور ٹرانسفارمر لگا کر آپ اسے joint کر لیں گے تو فرق نہیں پڑے گا۔ یوں انسان نے بھی اس تجلی کو Absorb کر لیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ قرآن اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا لیکن یہی قرآن جب آپ ﷺ پر نازل ہوا تو آپ ﷺ اس کے نزول کو برداشت فرما لیتے۔ اگرچہ وحی کے وقت آپ ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو جاتا تھا۔

سوال: قرآن ہی انسان کو عزت دلا سکتا ہے۔ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: قرآن اللہ کا پیغام ہے۔ یہ انسان کے لیے اس کی زندگی کا آئین ہے۔ یہ ایک ایسا Constitution ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ مثالیں دے کر Explain کیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بھی متعارف کرایا کہ میں کون ہوں، میری قدرت کیا ہے اور تمہیں کس نے تخلیق کیا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ تم نے اس دنیا میں زندگی کیسے گزارنی ہے۔ اگر اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارو گے تو انعام ملے گا اور اگر خلاف ورزی کی تو سزا کے مستحق قرار پاؤ گے۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ احکامات کی پیروی سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہوتا ہے۔

اگر ہم اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں تو ہمیں دنیا و آخرت میں عزت عطا ہو جائے گی۔ اس کی ایک بین مثال یہ ہے کہ اگر ہمیں کسی شخص کے بارے میں پتا چلے کہ وہ 100 فی صد کی Partially ہی اللہ کے احکامات کی پابندی کرتا ہے تو ہم بغیر اسے جانے اس کی عزت کرنے لگتے ہیں۔ ہم صاحبان علم اور

اولیا اللہ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پیغمبروں کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔

جو شخص بھی اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے اُسے عزت ضرور عطا ہوتی ہے۔ یوں قرآن پاک پر عمل کرنے کی صورت میں عزت ملنے سے مراد یہی ہے کہ قرآن پاک اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہے اور جو قرآن پاک میں بیان کردہ احکامات کی روشنی میں زندگی گزارتا ہے وہ دنیا و آخرت میں عزت پاتا ہے۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق زندگی گزارنے کا نتیجہ ہمیشہ مثبت نکلتا ہے جو عزت کا باعث بنتا ہے۔

سوال: سورہ مجادلۃ کی آیت نمبر 7 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "جہاں پانچ ہوتے ہیں وہاں میں خود ہوتا ہوں۔" اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: حواس خمسہ پانچ ہیں۔ ہم اپنے حواس خمسہ سے چیزوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو کیسے پہچانتے ہیں؟ عقل سے۔ لیکن اس میں بھی Reference مشاہدے کا ہے۔ ہم فطرت کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر اسے عقل پر پرکھتے ہیں اور خود کو جاننے لگتے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے وہ رب کو بھی پہچان لیتا ہے۔

ایک بات مشہور ہے کہ رب تعالیٰ شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اور دل میں رہتا ہے۔ اگر وہ شہ رگ سے قریب ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ انسان کے اندر ہی کہیں رہتا ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے اس کے پانچوں حواس خمسہ کام کرتے ہیں۔ انسان کے مرنے کے بعد یہ پانچوں حواس بے حس ہو جاتے ہیں۔ ثابت کیا ہوا؟ رب کہاں ہے؟ جہاں یہ پانچوں حواس ہیں۔

سورہ مجادلۃ کی آیت نمبر 7 کا مفہوم یہی ہے کہ رب تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہے۔ ہر چیز اس کے اندر سموئی ہے اور کوئی شخص اس سے باہر نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی Omnipresence کا دعویٰ کر رہا ہے کہ جہاں زندگی ہے وہاں میں موجود ہوں...... کوئی انسان مجھ سے باہر نہیں...... میں نے سب کو محیط کیا ہوا ہے اور ہر چیز پر حاوی ہوں۔

سوال: وہ اخیار جن میں سے بعض کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ولی اللہ ہیں، کیا ان سے کوئی خاص کام لیا جاتا ہے؟

جواب: جس طرح حروف مقطعات کو کھول کر بیان کرنے کی اجازت نہیں اسی طرح ولایت کی کچھ باتیں بیان نہ کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

ضروری نہیں چالیس ہزار اخیار ہی صاحب ایولی ہوں اور جو ڈیوٹی پر ہوتے ہیں ان کی ڈیوٹی کی نوعیت، چارٹر آف ڈیوٹی اور ان کے Rewards بتانے کی کسی طور اجازت نہیں ہوتی۔

اہل علم ایک دوسرے کے مقام کے بارے میں کوئی چیز بیان نہیں کرتے۔ کوئی صاحب علم جاننے کے باوجود نہ تو کسی ولی اللہ کے بارے میں اور نہ ہی اپنے مقام کو بھی Disclose کرے گا کیوں کہ اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ جہاں کوئی یہ کہہ دے کہ فلاں شخص اس مقام پر ہے اور میرا مقام فلاں ہے تو فوراً اندازہ ہو

جائے گا کہ اس طرح کہنے والا شخص صاحب ڈیوٹی اور صاحب مقام نہیں۔

اولیائے کرام تو بہت سے آپ کو مل جائیں گے لیکن صاحب ڈیوٹی ان میں سے کم ہی ہوں گے۔ جیسے Major General تو بہت ہوں گے لیکن Divisional Commanders کم ہوں گے۔ اسی طرح لیفٹیننٹ جنرل تو بہت ہوں گے لیکن کور کمانڈر کم ہی ہوں گے۔ ایک کور کمانڈر اپنے نام کے ساتھ لکھے گا لیفٹیننٹ جنرل کمانڈر 4 کور۔ اس میں ایک اس کا Rank اور دوسرا Designation ہے۔ Designation تبدیل ہوتا رہتا ہے لیکن Rank اسی وقت تبدیل ہوگا جب وہ Promote ہوگا۔ جس Rank میں ریٹائرڈ ہوگا وہ اس کا لائف لانگ رینک (Life - long rank) بن جائے گا۔

اولیائے کرام میں ولی اللہ Rank ہے لیکن اس Rank کے تحت جو ڈیوٹی وہ سر انجام دیتا ہے وہ بھی بتائی نہیں جا سکتی۔

سوال: ہم محبت میں بزرگ ہستیوں کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: عقیدتاً بزرگ ہستیوں کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں...... جب ہم بچوں کو ان ناموں سے پکاریں گے یا ڈانٹیں گے تو اس کا معاذ اللہ ہرگز ایسا مطلب نہیں ہوگا کہ ہم بزرگ ہستیوں کی شان میں کوئی گستاخی کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ ضرور ان ہستیوں کے ناموں پر بچوں کے نام رکھیں۔ یہ باعث برکت ہے۔

سوال: کیا معراج رُوحانی تھی یا جسمانی؟ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تجلی کو کیسے Absorb کر لیا؟

جواب: Greek Mythology دُنیا کی سب سے بڑی Mythology ہے اور اس کے بعد ہندو Mythology کا نام آتا ہے۔ اسلام کے مخالفین نے ایک زمانے میں واقعہ معراج کے حوالے سے شور مچایا کہ یہ Islamic Mythology ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی سچائی کو ثابت کرتا ہے۔ جوں جوں سائنس نے ترقی کی تو معلوم ہوا کہ روشنی کی سپیڈ (Speed) بے پناہ ہے لہٰذا خیال یہ ہوا کہ شاید معراج کا سفر روشنی کے دوش پر کیا گیا ہو۔ پھر چند سال بعد معلوم ہوا کہ سائنس کی نئی دریافت شدہ Rays روشنی سے کئی گنا زیادہ تیز رفتار ہیں۔ ابھی یہ ابتدا ہے۔ نئی Discoveries آئیں گی تو ثابت ہو جائے گا کہ اللہ یقیناً قادر ہے کہ وہ اپنے کسی بھی بندے کو جسمانی طور پر لمحوں میں زمین سے عرش تک کا سفر کروا دے۔ واقعہ معراج جسمانی تھا۔ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اپنے بندے، اپنے محبوب ﷺ کو جسمانی طور پر اپنے پاس بلایا۔ مقام محمود جہاں بیٹھ کر آپ ﷺ نے رب تعالیٰ سے گفتگو کی تھی، وہاں عرش معلی پر ایک خط کھنچا ہے۔ یہ دراصل ایک جھینی سا پردہ ہے جو درحقیقت حجاب تھا۔ وہاں بھی یہ اختیار دی کہ تجلی بالکل سامنے نہ ہو۔ تو جس سینے پر قرآن پاک اُتارا گیا اور جس سینے کو کھول کر اللہ کے نور سے غسل دیا گیا تھا، جس سینے کو نبوت عطا کرتے وقت کھولا گیا تھا اور اللہ کے نور سے غسل دیا گیا تھا۔ وہ اسی جسم کا ہی حصہ تھا۔ ایک رُوح جو اللہ کے نور کا حصہ ہے اور پھر رُوح جسم میں قید ہے جس کو اللہ کے نور سے غسل دیا گیا ہے۔ وہ رُوح اس قابل ہو جائے گی کہ اللہ

کی تجلی کو Absorb کر لے۔ یوں آپ ﷺ کے جسم نے اللہ کے نور کو Absorb کر لیا۔

سوال۔ قرآن پاک کے پندرھویں پارے کے آغاز میں جہاں واقعہ معراج کا ذکر ہے وہاں براق کا ذکر نہیں ملتا۔ براق سے کیا مراد ہے؟

جواب۔ قرآن پاک ضابطہ حیات ہے۔ قرآن پاک میں کچھ واقعات Symbolic انداز میں بیان ہوئے اور مفسرین واہل علم نے انھیں کھول کر بیان کیا جیسے براق کی مثال ہے۔ قرآن پاک میں ذکر ہے:

"پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ
اور پھر آسمانوں کی طرف۔" (بنی اسرائیل:1)

اب اللہ کیسے لے گیا، وہ وہاں جا کر واضح ہو جاتا ہے کہ جب آپ ﷺ کو مقامات دکھائے گئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اُن مقامات کی وضاحت کی لیکن سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر آگے جانے سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اس سے آگے میرے پر جلتے ہیں۔ براق اور اُس کی تصویر کشی میں بات نہیں کرتا کیوں کہ یہ فروعی چیزیں ہیں۔ میرا مقصد علم ہے اور اصل بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ آپ ﷺ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے عرش تک لے گیا اور سدرۃ المنتہیٰ تک آپ ﷺ جبرائیل علیہ السلام کی معیت میں تھے۔ میرے خیال میں تو بس اتنا جاننا ہی کافی ہے۔

رُوحانیت اور علم الاعداد

سوال: کیا حضرت عیسٰی علیہ السلام کو مصلوب کرنے سے پہلے ان پر کسی طرح کا جسمانی تشدد کیا گیا تھا؟

جواب: حضرت عیسٰی علیہ السلام کو جب آسمان پر زندہ اٹھایا گیا تو اس سے پہلے ان پر نہ صرف تشدد ہو چکا تھا بلکہ انھیں مصلوب بھی کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں مصلوب کرنے کا طریقہ بہت زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ہاتھوں اور پاؤں میں کیلیں ٹھونک کر صلیب پر لٹا دیا جاتا اور موسم کے حوالے کر دیا جاتا۔ جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں میں کیلیں ٹھونکی جائیں تو یہ تشدد ہی بہت ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام پر یہی جسمانی تشدد کیا گیا تھا۔

سوال: ''اللہ کو قرض حسنہ دو اور وہ بہترین قرض لوٹانے والا ہے۔'' اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: جب ہم اللہ کے نام پر کوئی نیکی کرتے ہیں یا کسی کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں تو چونکہ اللہ سب سے بڑا سخی اور دیالو ہے اس لیے وہ ہمارا یہ قرض کئی گنا بڑھا کر ہمیں لوٹا دیتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارے اس نیک عمل کے پیچھے کوئی غرض نہ ہو اور نہ ہی یہ لالچ ہو کہ اس سے ہمارے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ ہو جائے گا اور ہمیں ثواب ملے گا، ہمارے گناہ دھل جائیں گے۔ اس کے برعکس ہم صرف یہ سوچیں کہ میرا رب مجھے بغیر میرے کسی استحقاق کے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے لہٰذا مجھ پر لازم ہے کہ میں بطور اظہار تشکر اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے اللہ کے بندوں پر خرچ کروں۔ یہ بہترین قرض حسنہ ہے اور اسے اللہ کئی گنا بڑھا کر لوٹا دیتا ہے۔ جب ہمارے نیک عمل کے پیچھے صرف یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے اور تکلیف میں ہے تو یہ بھی قرض حسنہ ہے۔ یہ قرض حسنہ اللہ تعالیٰ اس طرح لوٹائے گا کہ ہمارے کام غیب سے وہ خود کر دے گا۔ اسی طرح اگر کوئی انسان شدید بھوکا ہے اور اسے بھوک سے کہیں کم کھانا میسر آیا ہے۔ ایسے میں وہ کسی دوسرے بھوکے انسان کو دیکھتا ہے اور وہ کھانا یہ سوچ کر اسے دے دیتا ہے کہ اللہ کے اس بندے کی بھوک کی شدت مجھ سے زیادہ ہے یہ کھانا کھالے۔ تب رب تعالیٰ اس انسان کو اپنے خزانے سے بہترین کھانا فراہم کر دیتا ہے۔ یہ قرض حسنہ کا لوٹانا ہے۔

اکثر اوقات میں نے لوگوں کو کہتے سنا کہ کچھ لوگوں نے ہم سے رقم ادھار لی اور واپس نہ کی۔ تب میری کوشش ہوتی ہے میں ان کی توجہ اس طرف مبذول کرادوں ''بھائی! یہ آپ ﷺ کی سنت ہے کہ جس کو قرض دیا

جائے اسے سہولت دے دی جائے۔" اس سے بھی بڑھ کر ایک کام کیا جا سکتا ہے کہ باوجود سخت ضرورت میں مبتلا ہونے کے ہم صرف یہ سوچ کر قرض کی واپسی کا تقاضا نہ کریں کہ یہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ مقروض کو قرض کی واپسی کے سلسلے میں سہولت دے دو۔ میں یہ سوچتے ہوئے کہ وہ جانتا ہے یہ کس وجہ سے کی سہولت ہے، قرض کی واپسی کا تقاضا نہ کروں۔ اس رویے کو اپنانے کے بعد مجھے یقین ہے کہ اللہ ہماری ضرورتیں غیب سے پوری کر دے گا لیکن یہاں دوبارہ عرض کر دوں کہ نیت آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق حتی الوسع سہولت دینے کی ہو۔

اہل فقر کا رویہ تو اس سلسلے میں یہ ہوتا ہے کہ کسی ضرورت مند کے پاس گئے اور جا کر کہا "یہ کچھ رقم میرے پاس فالتو پڑی ہوئی ہے۔ یہ رکھ لو تمہارے کام آ جائے گی۔" میرے خیال میں یہ بھی قرض حسنہ ہے کہ اللہ کے نام پر دیے جانے والے مال کا تعلق سے واپسی کا تقاضا نہ کیا جائے۔

زندگی کا اعلیٰ ترین معیار وہ ہوگا جہاں ہم ہر قدم پر آپ ﷺ کی حیات طیبہ کی نقل کرنے لگیں گے زندگی کے ہر معاملے میں آپ ﷺ کی نقل کر لیں اور اس نقل میں عقل کو دخل نہ دینے دیں۔ پھر زندگی کا رویہ کلیۃً قرض حسنہ کے زمرے میں آ جائے گا جس کا اجر دنیا میں عزت ہی نہیں بلکہ سہولت کی صورت میں بھی ملنے لگتا ہے اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ بے پناہ اجر عطا فرماتا ہے۔

سوال: رُوحانیت میں 7 کے عدد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ Numerology میں بھی 7 کو رُوحانیت کا عدد کہا جاتا ہے لیکن عدد 4 بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔ عدد 4 کی اہمیت بیان کر دیجیے۔

جواب: تمام Mystic sciences میں 7 کو رُوحانیت کا ہندسہ کہا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کائنات کی تخلیق کے لحاظ سے 6 کا ہندسہ بھی بہت اہم ہے۔ اسی طرح 4 کے عدد کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے چار پیغمبر بے حد نمایاں ہیں۔ تمام صحائف اور کتب میں سے چار الہامی کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔ اسی طرح بے شمار فرشتوں میں سے چار فرشتوں کی حیثیت بہت نمایاں ہے۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ انسان کی پیدائش کا عمل رُوحانیت کے مطابق ہے۔ انسان کی اصلیت کیا ہے؟ کہیں اسے نجس قطرہ، کہیں کھنکھناتی مٹی تو کہیں کیچڑ بتایا گیا ہے۔

رُوحانیت میں کہا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ مرد کی کمر سے نکلے ہوئے پانی اور عورت کے پانی سے۔ یہ دونوں Fluid پہلے چالیس دن آپس میں Mix ہو جاتے ہیں۔ آپس میں خوب Mix ہو جانے کے بعد یہ اگلے چالیس دن میں خون کی صورت گاڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس سے اگلے 40 دن یہ گاڑھا خون لوتھڑے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ انسانی شکل اختیار کرنے لگتا ہے اور ہاتھ پاؤں اور سر تشکیل پانے لگتا ہے اور یہ Process انسانی وجود کی تکمیل تک جاری رہتا ہے۔ پھر اس کے بعد انسان کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دل کے عین درمیان میں گہرائی میں رُوح رکھی جاتی ہے لیکن

اس عمل سے پہلے فرشتہ اس انسان کے ماتھے پر تین چیزیں تحریر کرتا ہے۔ جب روح ڈالی جاتی ہے۔ اس کے بعد انسان دنیا میں آتا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ عرف عام میں کہا جاتا ہے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے کراماً کاتبین مقرر ہیں۔ دراصل صرف دو نہیں بلکہ 160 فرشتے انسان کے ساتھ مقرر ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں سے نو فرشتے انسان کو Track پر رکھتے ہیں اور باقی فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

'4' کے ہندسے کا جہاں تک تعلق ہے تو انسانی تخلیق میں چار عناصر کار فرما ہیں۔ ہوا، مٹی، پانی اور آگ۔ انسان میں Chemically بھی چار ایسی چیزیں ہیں جن میں زیادہ اہم صفرا، پھر سودا، اس کے بعد خون اور بلغم ہے۔

روحانیت میں جب آپ بیماری Define کرتے ہیں تو سائنس کی طرح علامات کی بنیاد پر بیماری کی تشخیص نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ان چاروں کی Chemical properties کے Balance میں اگر فرق آئے گا تو اس فرق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے Reaction سے بیماری آئے گی۔ اگر ان Chemical properties کو دوبارہ سے Balance کر لیا جائے تو یہ بیماری غائب ہو جائے گی۔

یہاں یہ بات بھی آپ کو Clear ہو جائے گی کہ اہل فقر زیادہ تر جڑی بوٹیوں اور پانی سے علاج کیوں کرتے ہیں۔ فقیر تقریباً 80 فی صد بیماریوں کا علاج پانی سے کرتے ہیں۔ آج کی ماڈرن سائنس نے بھی شاید فقیر ہی سے ہائیڈرو تھراپی (Hydrotherapy) کا طریقہ علاج لیا ہے۔

سائنس یہ کہتی ہے کہ ہمارے جسم کے اندر چار قسم کے Salts ہیں اور 99 فی صد Basic elements ہیں جس میں Metals, Minerals اور ان کے Compounds شامل ہیں۔ اسی طرح جسم میں پانچ قسم کے Poisons ہیں۔ اگر ان کے Balance میں کوئی کمی یا زیادتی ہو جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ یہ ایلوپیتھی کا طریقہ علاج ہے۔

اسی طرح روحانیت کے چار Levels ہیں۔ سب سے پہلے نور اللقاء ہے جو رب تعالیٰ کا اپنا نور ہے۔ جس سے دوسرا نور نکلتا ہے جو نور المروارید کہلاتا ہے۔ اس نور المروارید سے نور الہدیٰ نکلتا ہے اور نور الہدیٰ سے نکلنے والے نور کی دو شاخیں ہیں۔

1۔ نور الہدیٰ المتقین

2۔ نور الہدیٰ العالمین

انسانی جسم میں روح پھونکنے کا جو ذکر ہوا تو یہ روح دراصل نور الہدیٰ ہے جسے انسانی جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔

اسی طرح انسانی زندگی کے بھی چار Levels ہیں۔ ایک دنیا کی زندگی، دوسری قبر کی خاموش مختصر زندگی، تیسری برزخ کی زندگی اور چوتھی آخری ابدی زندگی جو بروز قیامت جب انسان اپنے اعمال کی

بنیاد پر اپنے لٹکانے پر بھیج دیا جائے گا۔

سوال: برناباس کی انجیل میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہوداہ کی شکل دے دی گئی تھی۔ تمام اذیتیں یہوداہ کو دی گئیں اور وہی مصلوب ہوا۔

جواب: میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ قرآن پاک کی ہر بات کسی بھی دوسری کتاب سے زیادہ Authentic ہے۔ دینِ اسلام یہ بتاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ اٹھا لیا گیا تھا اس لیے میں بغیر کسی بحث میں پڑے اس پر آنکھیں بند کر کے ایمان اور یقین رکھتا ہوں۔

سوال: ہم اعداد سے روحانی طور پر کیا فوائد حاصل کر سکتے ہیں؟

جواب: میں ذاتی طور پر ان چیزوں سے دور بھاگتا ہوں۔ لوگ مختلف اعداد پر تحقیق کر رہے ہیں۔ پہلے انھوں نے بائبل پر تحقیق کی اور اب قرآن پاک کی طرف تحقیق کا رخ موڑ دیا۔

ایک صاحب میرے پاس آ کر کہنے لگے "قرآن پاک کی تمام بنیاد 9 کے ہندسے پر ہے۔" میں نے انھیں قرآن پاک کی بنیاد پہلے 4 کے ہندسے، پھر 6 کے ہندسے اور اس کے بعد 7 کے ہندسے پر Prove کر دی اور عرض کیا کہ ہم کسی بھی ہندسے کو لے کر تحقیق کریں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے اس کی بنیاد اسی ہندسے پر ہو۔ قرآن پاک کے Divine Book ہونے کا یہی ثبوت ہے۔

قرآن پاک کی تحقیق کسی بھی انداز میں کر لیں وہ اس پر پورا ہو جائے گا کیوں کہ جس چیز پر قرآن کی بنیاد ہے وہ کسی کے علم میں ہی نہیں۔ انسان بھٹکتا رہے گا اور اپنی جگہ سمجھے گا کہ میں نے تحقیق مکمل کر لی۔ یہ درحقیقت کلامِ الٰہی ہونے کا اعجاز ہے کہ آپ اسے کسی بھی میزان پر تولیے، یہ پورا اترے گا۔ کسی بھی Balance پر وہ Fit ہو جائے گا۔

اگر آپ سورتوں کے اعداد نکال کر کوئی کام لینا چاہیں تو مناسب نہیں البتہ آپ صرف معلومات میں اضافے کے لیے کر سکتے ہیں اور ایک نیا علم سیکھنے کے بعد اللہ کی قدرت اور قرآن پاک کے کلامِ الٰہی ہونے پر یقین مزید پختہ ہو جائے گا۔

سوال: جب ہم قرآن پاک یا نوافل کے ذریعے ارواح کو ثواب پہنچاتے ہیں تو اس کا Effect کہاں تک ہوتا ہے؟

جواب: جو انسان دنیا سے چلا گیا اس کا تعلق اعمال سے منقطع ہو گیا۔ چونکہ وہ کسی بھی عمل پر قادر نہیں اس لیے اپنے نامۂ اعمال میں کسی بھی ثواب میں اضافے پر بھی قادر نہیں رہا۔ جب ہم مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھتے ہیں یا کسی کو کھانا کھلاتے ہیں تو اس کا ثواب ہمیں تو ملتا ہی ہے لیکن رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے مرحومین کے حق میں ہماری یہ دعا قبول کرتا ہے "یا اللہ تو اس نیک کام کا ثواب اس روح کے نامۂ اعمال میں لکھ دے۔" اللہ تعالیٰ ہماری درخواست پر نہ صرف اس روح کے نامۂ اعمال میں ثواب کا اضافہ کرتا ہے بلکہ اس قرآن خوانی یا نیک عمل کے ثواب سے خود ہمیں بھی محروم نہیں رکھتا۔ لیکن یہاں بہت

احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہمیں شرک میں داخل کر دے گی۔ ہم عموماً کہتے ہیں کہ فلاں کے نام کا ختم دلا دیں۔ اگرچہ اس میں ہماری نیت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کا ختم دلا کر اس کا ثواب ہم فلاں شخص کی روح کے نامۂ اعمال میں بھیج دیں لیکن لفظوں کی بے احتیاطی ہمیں شرک میں داخل کرنے کا موجب بن سکتی ہے کیوں کہ ختم کسی غیر اللہ کے نام پر نہیں دلایا جا سکتا۔ ختم ہر حال میں اللہ کے نام ہی کا رہے گا لیکن اس کا ثواب ہم مرحومین کی روح کو بخش دیں گے۔ ختم میں ہم فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات کھانے پینے کی اشیا بھی ختم میں رکھی جاتی ہیں۔ اس میں ایک فلاسفی پوشیدہ ہے۔ بلاشبہ اللہ ہر ضرورت، ہر حاجت سے بے نیاز ہے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ میرے نام پر کس کو کھانا کھلایا گیا۔ وہ تو صرف جذبہ اور نیت دیکھتا ہے۔ جب ہم فاتحہ پڑھتے ہیں تو ہمیں تلاوت کلام پاک کا ثواب ملتا ہے اور جب ہم اللہ کے نام پر کم آمدنی والے لوگوں کو اچھا کھانا کھلاتے ہیں تو ان کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ جب آپ رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے بندوں کا دل خوش کریں گے تو رب آپ سے راضی ہو جائے گا۔ یوں آپ کے نیک عمل کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے اکثر قل خوانی وغیرہ پر کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہندوؤں کے ساتھ ایک طویل عرصہ رہنے کی وجہ سے ہم نے اس نیک عمل کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جس کی وجہ سے ہم پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہمارا جذبہ اللہ اور اللہ کے بندوں کو خوش کرنا ہو۔ ہم فاتحہ خوانی اور کھانا کھلانے کے بعد اللہ کے حضور درخواست کریں "یا باری تعالیٰ! ہمارے اس عمل کو قبول فرما اور اس کا ثواب فلاں مرحوم کی روح کو بخش دے۔"

سوال: اہل بیت کے ناموں کے اعداد کیا ہیں؟ سورہ الجن کی آیت نمبر 28 میں بھی اشیا کو اعداد میں تولنے کا اشارہ ہے۔

جواب: کچھ ہستیاں ایسی ہیں جہاں صرف ادب ہی ادب ہے جیسے آپ ﷺ کی ذات گرامی ..... اہل فقر کے ہاں ادب کا قرینہ اس قدر ہے کہ درویش آپ ﷺ کا اسم گرامی زبان پر لانے سے منع کرتے ہیں کہ یہ خلاف ادب ہے۔ میرے مرشد قبلہ سید یعقوب علی شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے "صرف 'ﷺ' کہنا ہی کافی ہے۔" لیکن میری زبان آپ ﷺ کہنے کے حوالے سے رواں ہے کیوں کہ بچپن ہی سے میں "آپ ﷺ" کہتا چلا آیا ہوں اس لیے باوجود Conscious effort کے زبان سے "آپ ﷺ" ہی پھسلتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی ہمارے لیے بے پناہ لائق احترام ہیں۔ میرے نزدیک یہ انتہائی گستاخی ہے کہ ہم ان کا ذکر کرتے ہوئے انھیں 'علی' کہنا شروع کر دیں۔ ہم تو ان کے غلاموں کے پاؤں کی خاک کے بھی برابر نہیں۔ ان کا امام طریقت ہونا تو ایک طرف ..... وہ صرف اپنی ہستی میں بھی اتنے قابل تعظیم ہیں کہ ان کو 'علی' کہہ کر پکارنا سخت گستاخی ہے۔

ائمہ کرام میں حضرت امام حسینؓ، حضرت امام حسنؓ اور دیگر تمام ائمہ بے حد قابل احترام ہیں لہٰذا ادب کا تقاضا یہی ہے کہ ان ہستیوں کو اعداد پر نہ تولا جائے۔

جہاں ان ہستیوں کے معاملے میں گستاخی یا بے ادبی ہوئی وہاں انسان راندۂ درگاہ ہو گیا۔ نہ دین کا رہا اور نہ دنیا کا۔۔۔ اس لیے اس بیت کو اعداد میں نہ تولیے۔

آپ نے سورہ جن کی آیت نمبر 28 کا حوالہ دیا ہے

''ہم نے ہر شے کو اعداد میں شمار کیا ہے۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اس دنیا کو میزان پر قائم کیا ہے اس لیے اس کی ہر چیز کو کسی شے یا پیمانے پر تولا جائے گا۔

یہ تمام کائنات ایک میزان اور Delicate balance پر قائم ہے۔ اگر اس نازک توازن میں ذرہ برابر بھی فرق آئے گا تو یہ سارا نظام Collapse کر جائے گا۔ اس لیے بڑے سے بڑا سائنس دان خواہ اس کا تعلق کسی بھی قومیت اور مذہب سے ہو کہتا ہے:

"Don't try to fiddle with nature."

جہاں کسی نے Nature سے Fiddle کرنے کی کوشش کی اور اس کا Balance تخریب کرنا چاہا، وہ تباہی کی طرف چلا گیا۔

ایک زمانہ تھا جب ہم یورپ یا امریکہ جاتے تھے تو چاروں طرف Hybrid سبزیوں اور پھلوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ وہاں کے باشندے بہت فخر سے یہ چیزیں دکھایا کرتے اور بتاتے کہ یہ ہماری کاوشوں کا ثمر ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ ان کی ایجادات اور دریافتیں سب کچھ چوری شدہ تھا۔ چوری شدہ اس Sense میں کہ جو کچھ Nature نے پیدا کیا ہم نے اس کے ساتھ Play کر کے Hybrid بنا دیا۔ جس سے مولی دو ڈھائی فٹ کی اور کھیرا ایک فٹ کا ہو گیا۔

یہ چیزیں دراصل انھوں نے پیدا نہیں کی تھیں بلکہ انھوں نے Nature کے ساتھ Play کیا تھا اور پھر Hybrid اور Inorganic بنا کر مارکیٹ میں لے آئے تھے۔ اب وہ دور ہے کہ آپ کسی بھی سپر مارکیٹ یا سپر شاپنگ مال میں چلے جائیں وہاں علیحدہ سے آپ کو ایک Portion ملے گا جہاں لکھا ہو گا Organic products جسے ہم دیسی کہتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک بار پھر فطرت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سورۃ الجن کی آیت نمبر 28 میں اسی میزان کا ذکر کر رہا ہے۔ ان اعداد سے مراد وہ میزان ہے جس پر یہ کائنات قائم ہے۔ رب تعالیٰ نے Planets کا ذکر کیا کہ وہ اپنے اپنے مقررہ راستے پر گھومتے ہیں۔ جس روز وہ اپنے مدار سے نکلیں گے اور محور سے دور ہو گئے اس روز قیامت برپا ہو جائے گی۔

قیامت کیا ہے؟ سورج سوا نیزے پر آ جائے گا۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ایسا اسی وقت ہو گا جب زمین و سورج اپنے Orbit سے نکل جائیں گے۔ یہ سب ایک میزان پر قائم ہیں اور ایک حساب کتاب کے تحت چل رہے ہیں۔

جدوجہد سے دُعا تک

World Islamic Economic Forum کی چار کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ پہلی دو ملائشیا، تیسری پاکستان اور چوتھی کویت میں ہوئی۔ پانچویں کانفرنس انڈونیشیا میں فروری 2009ء میں ہو گی (نوٹ: یہ لیکچر مورخہ 4 مئی 2008 کو Deliver کیا گیا۔)

کویت میں ہونے والی کانفرنس میں مسلم ممالک کے Heads of State، سرکاری اداروں کے سربراہان اور نمائندوں نے شرکت کی۔

میں اب تک کی چاروں کانفرنسوں میں شرکت کر چکا ہوں اور امید ہے کہ پانچویں کانفرنس میں بھی شریک ہوں گا۔ کانفرنس کے دوسرے دن کے Session کا موضوع تھا:

Energy and Future Challenges

اس موضوع پر سیر حاصل تقریریں ہوئیں۔ اعداد و شمار بھرپور طریقے سے Quote ہوئے۔ جس چیز نے بالخصوص میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی وہ بنگلہ دیش کے ایک مندوب کی گزارشات تھیں۔ کانفرنس کویت کے پرائم منسٹر Chair کر رہے تھے۔ تقاریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو بنگلہ دیش کے مندوب چیئرمین کی اجازت سے کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے اور یوں گویا ہوئے:

"As we enjoy the luxury of this conference hall at this hour and much of the energy we are going to consume for air-conditioning and lightening of this hall during these three hours, is surplus. The total population of five million people in Bangladesh will consume this surplus energy to lit their houses for a year. I am not asking for charity."

تب کویت کے ایک منسٹر نے کہا:

"The surplus we have at this moment is earning us more income than the income what we get from the sale of oil."

بعد ازاں بنگلہ دیش کے مندوب نے کویتی منسٹر کی بات کو ریفر کرتے ہوئے کہا:

"A few minutes back, Kuwaiti Minister said that the surplus energy they hold with them earns them more money than the revenue they are earning out of the sale of oil a year. I am not asking for charity. What I am requesting is that please invest that money in Bangladesh and it will get you more returns than what you are getting out of your surplus money wherever it is invested."

اس مندوب کی یہ بات انتہائی Moving (اثر انگیز) تھی کہ اس کانفرنس روم میں ہم صرف ڈھائی سو آدمی موجود ہیں اور تین گھنٹے میں یہ ڈھائی سو لوگ جتنی بجلی خرچ کر لیں گے، بنگلہ دیش میں 150 لاکھ لوگ اتنی بجلی ایک سال میں Consume کریں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ جو پرائم منسٹر یہ کانفرنس Chair کر رہے ہیں اور ان کے دائیں بائیں جو Ministers بیٹھے ہیں وہ سب اگر بنگلہ دیش میں Investment نہیں بھی کرتے تو کم از کم ان کی دل جوئی کے لیے کوئی مثبت جواب ضرور دیں گے لیکن مجھے اس وقت مسلمان کی Arrogance پر حیرت ہوئی جب Prime Minister نے کہا "OK! Next question"

تب کمبوڈین منسٹر نے کھڑے ہو کر کہا "جناب کمبوڈیا میں اس وقت دس لاکھ مسلمان ہیں۔ میں گورنمنٹ آف کمبوڈیا میں منسٹر اسی لیے ہوں کیوں کہ میں ان دس لاکھ مسلمانوں کو Represent کرتا ہوں اور اسی حیثیت سے مجھے اس کانفرنس میں Invite کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی ہے اور نہ پہننے کو کپڑا ہے۔ کمبوڈیا میں مسلمانوں کی حالت بہت خستہ ہے۔ اس Forum پر میری درخواست ہے کہ ان دس لاکھ مسلمان بھائیوں کا بھی خیال کریں۔"

لیکن کمبوڈین منسٹر کی بات کو بھی کوئی اہمیت نہ دی گئی جس پر حیرت کے ساتھ ساتھ انتہائی افسوس بھی ہوا۔

ہم اپنی ذات میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ ہمیں اپنی ذات کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ جب میں اللہ کے کسی بندے کے حضور دعا کروانے کے لیے حاضر ہوتا ہوں تو وہاں بھی میرا رویہ عموماً ناشکر گزاری لیے ہوتا ہے۔ میں جاتے ہی کہتا ہوں "صاحب! میں بڑا پریشان ہوں۔ میرا کوئی کام نہیں ہوتا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہ خراب ہو جاتا ہے۔"

اب میں کروانے تو دعا گیا تھا لیکن شکر کرتا آ گیا۔ وہ اس Sense میں کہ جب میں نے کہا کہ میرا تو کوئی کام ہوتا ہی نہیں تو یہ سراسر جھوٹ ہو گیا کیوں کہ صبح سے شام تک رب تعالیٰ میرے ہزارہا ایسے کام کرتا ہے جن کا مجھے ادراک ہی نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اللہ مجھے زندہ رہنے کے لیے آکسیجن فراہم کرتا رہا۔ سوتے ہوئے میں غیر محسوس انداز میں سانس لیتا اور آکسیجن Inhale کرتا رہا۔ صبح بیدار ہونے کے بعد میں نے ناشتہ کیا، چائے پی، مہمانوں کو Attend کیا، ضروری امور سرانجام دیے۔ کیا یہ سب اللہ کی نعمت نہیں؟

پھر ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ ہمارا تو کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ دراصل ہم اپنی ذات میں اس قدر گم ہیں کہ اللہ کی نعمتوں کا احساس ہی نہیں کر پاتے۔

ایک کام نہ ہوا تو شور مچانے لگے کہ مجھ پر تو دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ ہم ایک دکھ کو پہاڑ بناتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہزاروں کام بغیر ہمارے استحقاق اور محنت کے کر دیے۔ اگر کبھی میرا ایک کام نہیں ہوتا تو مجھے وہ ہزاروں کام یاد رکھنے چاہئیں جو رب نے کر دیے۔ یہی شکرگزاری ہے۔

جب ہم دکھوں سے گھبرائے پھرتے ہیں اور ذرا سی تکلیف پر ہم صاحبانِ دعا کے پاس بھاگے چلے جاتے ہیں، ایسے میں ہم یاد کر لیا کریں کہ ہم ان نبی ﷺ کے امتی ہیں جنھوں نے بڑی سے بڑی مشکلات بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور زبان و دل سے شکرگزاری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ آپ ﷺ کے تمام افعال شکرگزاری کا مظہر تھے۔ پھر ہم آپ ﷺ کے امتی ہونے کے باوجود ذرا سی تکلیف پر کیوں چلا اٹھتے ہیں؟

حضرت امام حسینؓ کی بہت خوب صورت دعا ہے:

"یا اللہ! میں تجھ سے اپنے دکھوں اور تکلیفوں کو کم کرنے کی گزارش نہیں کر رہا لیکن تو میری کمر کو ذرا مضبوط کر دے تاکہ میں ان دکھوں کو آسانی سے اٹھا لوں۔"

یہ دعا ایک فریاد ہی نہیں بلکہ کمال کی بندگی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ تیرے ہر حکم پر سر تسلیم خم ہے۔ تو نے مجھے جو کچھ بھی دیا وہ مجھے عزیز ہے۔ میں ان دکھوں اور تکلیفوں سے بھاگتا نہیں۔ بس تو میری سکت کو بڑھا دے تاکہ میں ان تکالیف کو آسانی سے جھیل لوں۔

ذرا غور کیجیے یہ رویہ بہتر ہے یا ہمارا رویہ اچھا ہے؟ بحیثیت مسلمان مجھے ذہنی طور پر اس قابل ہونا چاہیے کہ میں دکھ، تکلیف اور اپنے فرائض میں پہچان کر سکوں۔ بحیثیت باپ میرے کچھ فرائض ہیں کہ رب تعالیٰ کے عطا کردہ وسائل میں رہتے ہوئے میں اپنی اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت کروں اور یاد رکھوں کہ سیب کا درخت لگانے سے سیب اور کیکر کا درخت لگانے سے کیکر کے کانٹے ہی ہاتھ آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے جو اولاد ہمیں عطا فرمائی ہے پیدائش کے وقت وہ ایک صاف سلیٹ کی طرح ہوتی ہے۔ یہ میری مہارت اور اختیار ہے کہ اس سلیٹ پر آیات لکھتا ہوں یا کوئی نازیبا الفاظ تحریر کرتا ہوں۔ میں اولاد کی تربیت کی خاطر تکالیف اٹھاتا ہوں، اپنی خواہشات و تفریح قربان کر دیتا ہوں اور اولاد کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہوں تو اس کا انعام مجھے رب تعالیٰ ایک اچھی اولاد کی صورت میں عطا کرے گا۔ اگر میں غفلت کا شکار رہا اور اپنی اولاد پر محنت نہ کر سکا پھر اولاد کی نافرمانی کی صورت میں، میں کسی صاحبِ دعا کے پاس جا کر واویلا کرتا رہا تو یہ مناسب نہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم اپنے فرائض کو پہچانیں اور ان کی انجام دہی کے لیے بھرپور کوشش کریں۔

ہم اکثر اپنے بچے کو صاحبِ دعا کے پاس لے جاتے ہیں اور صاحبِ دعا سے درخواست کرتے ہیں کہ میرا بچہ کلاس 11 کا Exam دے رہا ہے، آپ دعا کر دیجیے کہ یہ پاس ہو جائے۔ یا پھر ہم اس بچے کو

Independently صاحب دعا کے پاس بھیج دیتے ہیں "جاؤ! جا کر دعا کروا لو"۔ یوں ہم اپنے بچوں کو بے عملی کی ترغیب دے رہے ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن میں بیٹھ جائے گا کہ مجھے محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ یا رکاوٹ ہوگی، جا کر دعا کروا لوں گا۔

کسی نے کہا تھا کہ خانقاہ بے عملی کی تربیت گاہ ہے۔ علامہ اقبال کے گھر ایک پیر صاحب مہمان ہوئے۔ ان کے ایک مرید بھی ملاقات کے لیے وہاں آ گئے اور درخواست کی کہ دعا کر دیجیے کہ مجھ پر جو 100 روپے کا قرض ہے وہ کسی طریقے سے اتر جائے۔ پیر صاحب نے کہا "ٹھیک ہے! کر دوں گا دعا۔" تب مرید نے رخصت ہوتے وقت دو روپے بطور نذرانہ پیر صاحب کی خدمت میں پیش کیے اور چل دیے۔ علامہ اقبال نے انھیں روکا اور کہا "بھائی! یہ کیسے پیر ہیں کہ جن کے پاس جب تم قرض سے فراغت کی دعا کرانے آئے تھے تو 100 روپے کے مقروض تھے۔ جا رہے ہو تو 102 روپے کے مقروض ہو۔"

صرف دعاؤں پر تکیہ کرنا بے عملی کی راہ ہے اور بے عمل لوگوں کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔ وہ تو ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو مجاہدوں کی طرح ہر وقت عمل کے لیے کمر کس کے رکھتے ہیں۔ اگر ہم بچے کو کم عمری ہی میں بے عملی کی راہ دکھا دیں گے کہ جاؤ صاحب دعا کے پاس جا کر دعا کرا لو تو پھر محنت سے ہی جی چرانے لگے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچے کو دعا کی ترغیب دیتے ہوئے ترتیب کی درستی کا خیال رکھا جائے۔ پہلے بھرپور کوشش اور محنت، اس کے بعد دعا "یا باری تعالیٰ! تو نے ہمیں جو بھی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں عطا کیں۔ ان سے بھرپور کام لے کر ہم نے محنت کر لی ہے۔ اب تو اس کا بہترین صلہ ہمیں عطا فرما دے۔"

یاد رہے کہ پہلے جدوجہد ہے اور پھر دعا۔ لیکن بدقسمتی سے ہم دعا کو پہلے اور جدوجہد کو بعد میں رکھتے ہیں اور اس میں بھی کوشش کرتے ہیں کہ دعا سے ہی بیڑا پار ہو جائے، محنت اور جدوجہد نہ ہی کرنی پڑے۔ جب ہم محنت کرنے کے بعد دعا کرتے ہیں تو اللہ ہماری محنت کا ثمر ہمیں ضرور عطا فرماتا ہے۔

سوال: کیا ورلڈ اکنامک فورم میں پاکستان کے مندوبین میں سے بھی کسی مندوب نے اظہار خیال کیا؟

جواب: پاکستان سے 18 لوگوں کا Delegation (وفد) وہاں موجود تھا۔ ان میں سے ایک صاحب جو چاروں کانفرنسوں میں شرکت کر چکے تھے، انھوں نے اس Forum پر کہا:

> "I've attended all the four conferences of this forum and I am really sorry, each time what I experienced was that we all talk about all and everything, we give very good suggestions but we never implement them. Instead of talking about all things, we should discuss just one point and then implement it. That would be more practical and beneficial."

رویوں کی اہمیت

ایک Civil servant ریٹائر ہوئے تو سوچنے لگے کہ ساری عمر تو میری لوگوں کو ستانے میں گزر گئی، اب تو کم از کم اللہ اللہ کر لی جائے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی جستجو میں رہنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کسی چیز کی جستجو میں لگ جائے تو اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔ ایک دفعہ جمعہ کے روز وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ تقریر کے دوران امام صاحب نے کہا "اللہ کو راضی کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان خدمت خلق کرے اس سے اللہ راضی ہو جاتا ہے اور انسان کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔" گھر جا کر Civil servant سوچنے لگے کہ پیسہ تو میرے پاس ہے نہیں کہ خدمت خلق کر سکوں ـــــ اب کیا کروں؟

ایک دم خیال آیا کہ جس مسجد میں میں نماز پڑھتا ہوں اور جہاں سے آج خدمت خلق کا نسخہ کیمیا میرے ہاتھ آیا ہے، وہاں واش روم تو بنے ہیں لیکن طہارت کا کوئی بندوبست نہیں ـــــ لہٰذا ایسا کرتا ہوں کہ 100 روپے کے 100 مٹی کے لوٹے خرید لیتا ہوں اور انھیں مسجد میں رکھ دیتا ہوں۔ اگلے روز ان صاحب نے مٹی کے لوٹے خریدے اور ان تمام لوٹوں کو بھر کر ایک قطار میں رکھ دیا ـــــ خود گھر سے منگوائی جانے والی میز کرسی پر بیٹھ گئے۔ جب کوئی صاحب غسل خانے کی طرف آتے، وہ سول سرونٹ اپنی جگہ سے اٹھتے اور بھرا ہوا لوٹا انھیں تھما دیتے۔ چند روز یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک روز ایک صاحب بہت تیزی سے آئے اور قطار کے درمیان سے لوٹا اٹھا کر چل دیے۔ یہ سول سرونٹ جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھے اور ڈانٹ کر بولے "آپ خود کیوں لوٹا اٹھا رہے ہیں؟ میں یہاں کس کام کے لیے بیٹھا ہوں؟"

یہ سارا قصہ سنانے کا مقصد محض یہ ہے کہ خدمت خلق ضرور کیجیے لیکن ساتھ ہی اپنے رویوں کو شائستہ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔

سوال: انسانی نظام اور الہامی نظام میں کیا فرق ہے؟

جواب: دنیا میں دو طرح کے نظام متعارف ہوئے۔ ایک انسانی نظام اور دوسرا آسمانی یا الہامی نظام۔

الہامی نظام وہ ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں تک بھیجا جب کہ انسانی نظام وہ ہے جو انسان نے اپنی عقل اور تجربات کو بروئے کار لا کر Introduce کروایا۔ انسان کی عقل بھی ناقص ہے اور

علم بھی اس لیے اس کا متعارف کردہ نظام بھی ہمیشہ Faulty ہوگا کیوں کہ کوئی عمل ہستی ہی مکمل اور بغیر کسی غلطی کے کوئی نظام متعارف کرا سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی انسان کوئی بہتر نظام Introduce کرتا ہے تو اس کی تعریف ضرور کی جانی چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے نظام عموماً زیادہ دیر پا نہیں ہوتے۔

آسمانی یا الہامی نظام پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعے Introduce ہوا اور وہ ہر دور میں انسانی ذہنی سطح کے مطابق تھا کیوں کہ رب تعالیٰ اور خود آپ ﷺ کی سنت ہے کہ جب بھی بات کریں تو مخاطب کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھیں۔ اس لیے اولین اسٹیج پر اللہ تعالیٰ نے جو پیغام اتارا وہ اس دور کی انسانی ذہنی سطح کے مطابق تھا۔ جوں جوں انسانی ذہن ارتقائی منازل طے کرتا چلا گیا، اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کو بھی Revise کرتا چلا گیا اور پہلے سے بلند سطح کا نظام متعارف کراتا چلا گیا۔

پہیے کی ایجاد اور لوہے کی دریافت کے بعد انسانی ذہن کا ارتقا مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد انسان کا ذہن ارتقا کے بجائے Polish کے مراحل سے گزرنے لگا۔ اس Stage کے بعد رب تعالیٰ نے اپنے پیغام اور نظام کو بھی مکمل کر دیا۔ چونکہ اس آخری پیغام کے بعد مزید پیغام کی ضرورت نہیں رہی اس لیے آپ ﷺ کے بعد مزید کسی نبی یا رسول کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

اگر ہم دیکھیں کہ جتنے بھی انسانی نظام تھے اُن کو متعارف کروانے میں انسان نے جبر سے کام لیا لیکن الہامی نظام کو متعارف کرانے والے پیغمبروں نے لوگوں پر جبر نہیں کیا بلکہ خود پر لوگوں کا جبر برداشت کیا۔ آپ کسی پیغمبر کی زندگی دیکھیں حتیٰ کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا جائزہ لیں تو ہر جگہ یہی پتا چلتا ہے کہ ان تمام ہستیوں نے لوگوں کا بدترین جبر برداشت کیا۔

الہامی نظام کی دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ سب نظام Gradual (بتدریج) آئے۔ تیسری خوبی یہ تھی کہ انھیں Personal example کے ذریعے پہنچایا گیا۔ پیغمبروں نے پہلے اس نظام کو اپنی ذات پر نافذ کیا اور پھر لوگوں تک پہنچایا۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے ابتدائی چالیس سال بھی Exemplary تھے حالاں کہ تب آپ ﷺ نے ابھی نبوت کا اعلان نہ کیا تھا۔ آپ ﷺ میں تمام پیغمبرانہ خصائل اعلانِ نبوت سے پیشتر بھی موجود تھے اسی لیے جب آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا تو انھوں نے گواہی دی کہ آپ ﷺ بچپن ہی سے راہِ راست پر ہیں۔

اگر اسلام کا پیغام اور نظام جبر کے ذریعے پھیلتا تو کسی بڑے جبر سے متاثر ہو کر مسلمان دین سے پھر جاتے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مکہ میں ایمان لانے والے مسلمانوں نے اہلِ قریش کی طرف سے دی گئی ہر قسم کی اذیت کو برداشت کیا کیوں کہ وہ جبراً مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اُن کے دل بدلے گئے تھے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد مسلمانوں کو مختلف جنگیں لڑنا پڑیں لیکن وہ سب غزوات دفاعی تھے۔ اسلام کبھی بھی، کہیں بھی جبر کے ذریعے نہیں پھیلا — حملہ آور ہوتے وقت مسلمانوں کا Action بھی Preemptive رہا۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ جب بھی مسلمان سپہ سالار غیر مسلموں کے علاقے میں داخل

ہوئے تو وہاں کے حکمرانوں کو خط میں تین Options دیں:

1۔ اسلام قبول کریں۔

2۔ جزیہ دیں۔

3۔ یا پھر لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔

یہ خط صرف حکمرانوں کو لکھے گئے، عوام کو نہیں۔ ساری Public مسلمانوں کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئی۔

مسلمانوں کے کردار اور حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ یروشلم کے عیسائی جو مسلمان حکومت کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے انھوں نے عدالت میں مقدمہ کر دیا کہ مسلمانوں نے یروشلم لڑائی سے نہیں بلکہ چال بازی سے حاصل کیا۔ عدالت کے چیف جسٹس نے دستور کے مطابق عیسائیوں اور مسلمانوں کے دلائل سنے اور فیصلہ یہ دیا کہ عیسائیوں کا موقف درست ہے۔ اس لیے یروشلم واپس کر دیا جائے۔ یروشلم کے گورنر نے فوراً اس دور کے مسلمان حکمران کو پیغام بھیجا اور یروشلم کے چیف جسٹس کے فیصلے سے مطلع کیا۔ اس حکمران نے چیف جسٹس سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا "میرے خیال میں عیسائی درست کہہ رہے ہیں۔" اس پر مسلم حکمران نے یروشلم کے مسلمان گورنر کو حکم دیا کہ علاقے کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ عیسائیوں کے سربراہان کو بلایا گیا اور کہا کہ یروشلم Take over کر لیجیے۔ انھوں نے علاقہ Take over کرنے کے لیے تین دن کی مہلت مانگی۔

تین دن کے بعد عیسائی سربراہان مسلمان گورنر کے پاس آئے اور کہنے لگے "بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ علاقہ ہم آپ ہی کے پاس رہنے دیں کیوں کہ جب یہ علاقہ ہمارے پاس تھا تو ہماری حالت آپ کے دور حکومت کی نسبت بدتر تھی۔ اب ہم زیادہ محفوظ، پُرامن اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں اس لیے ہماری خواہش ہے کہ یروشلم پر مسلمان ہی حکمران رہیں۔"

حضرت عمرو بن العاص لڑتے لڑتے مصر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک قلعہ فتح کیا۔ فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔ اس کے تیسرے دن ایک عیسائی نے شکایت کی کہ ان کی خواتین کی عزت پر حملہ کیا گیا ہے۔ حضرت عمرو بن العاص نے تحقیق کروائی تو واقعہ سچ نکلا۔ یہ وہ وقت تھا جب فوج میں بغاوت کی کیفیت تک پہنچی ہوئی Resentment تھی۔ لوگ گھروں کو جانا چاہتے تھے۔ اس قدر Resentment اور فوجیوں کی قلت کے باوجود واقعہ سچ ثابت ہونے کے بعد مجرم سپاہیوں کی سرعام گردنیں اڑا دی گئیں۔ اس حق پر انصاف رویے اور عمل کا یہ اثر ہوا کہ عیسائیوں کی ایک کثیر تعداد فی الفور مسلمان ہو گئی۔

جس زمانے میں مسلمان سلطنت بہت تیزی سے پھیل رہی تھی، اس زمانے میں بھی جو عیسائی مسلمان ہوئے وہ مسلمانوں کے کردار سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ آج کل بھی ہمارے ہاں تبلیغ کا کام بہت وسیع پیمانے پر جاری ہے لیکن اس کے اثرات اس طرح مرتب نہیں ہوتے جس طرح ہونے چاہئیں۔ وجہ کیا ہے؟

دراصل ہم Personal Example قائم نہیں کر سکے۔

جتنے بھی آسمانی و الہامی نظام ہیں، ان میں سے الہامی نظام کے پھیلنے میں کبھی کوئی جبر کارفرما نہیں رہا اسی لیے قرآن پاک میں فرمایا گیا کہ دین میں کوئی جبر نہیں —— جب کہ انسانی نظام کو متعارف کرانے میں ہمیشہ جبر کا دخل رہا۔

اسلام میں بہت سی چیزوں کا ہمیں علم تو ہے لیکن ہم انہیں Exercise نہیں کر پاتے۔ ہر غیر مسلم جو مسلمان ملک میں رہتا ہے اگر وہ جزیہ دے رہا ہے تو اس کے جان و مال کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی آزادی فراہم کرنا اور تمام حقوق دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں Warn کر دیا کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔

سوال: کیا ہمیں اپنا طریقۂ کار تبدیل کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا اس ترقی یافتہ دور کے Dynamics کے مطابق اسلامی Concepts بھی Dynamic ہیں؟

جواب: بنیادی نکتہ یہ ہے کہ یقیناً Dynamics تبدیل ہوتے ہیں۔ Dynamics وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہیں گے۔ اگر ہماری سوچ وہی ہوتی جو چودہ سو سال پہلے تھی تو ہم آج کی نسبت بہت بہتر مسلمان ہوتے۔ یہی ایک المیہ ہے کہ ہماری سوچ اتنی بہتر نہیں رہی۔ چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کی سوچ یہ تھی کہ ٹھیک ہے مسلمانوں میں غربت اور بھوک بہت ہے دنیاوی وسائل موجود نہیں ہیں۔ اس وقت انھوں نے یہ کیا کہ اپنی بھوک تقسیم کر لی۔ اگر دو روٹی کی بھوک تھی اور آدھی روٹی میسر آ گئی تو اس آدھی کو بھی تقسیم کر لیا۔

اس دور کی سوچ حضرت علیؓ کے اس قول سے بھی واضح ہو جائے گی

"میں نے اپنے اخراجات کو اتنا کم کر لیا کہ میں امیر ہو گیا۔"

یہ کتنا کمال کا وہ اصول ہے جو دنیا میں کہیں نہیں ملتا۔ چودہ سو سال پہلے ہم نے اپنے اخراجات اتنے کم کر لیے تھے کہ ہم امیر ہو گئے تھے۔ اگر ہم اس سوچ کو آج Apply کر لیں تو ہمارے ملک کے حالات اور اکنامکس فی الفور Change ہو جائے گی۔

اگر میں روزانہ شام کو اپنی Family کو کسی ریسٹورنٹ لے کر جاتا ہوں۔ وہاں مجھے کچھ Have nots دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو Apparently مالی لحاظ سے کچھ زیادہ Fortunate نہیں۔ انہیں دیکھ کر فیملی کو میں روزانہ کے بجائے ہفتے میں تین بار Restaurant لے جانے لگوں اور باقی چار دنوں میں خرچ ہونے والی متوقع رقم کے برابر جو ان Have nots یا مالی لحاظ سے کمزور لوگوں کو دینے لگوں، یقیناً میں ایسا نہیں کرتا۔ اگر میں چودہ سو سال پہلے والی سوچ رکھتا ہوتا تو میں فی الفور ایسا کرتا اور اپنا مال Share کر لیتا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ شخص بھوک سے بے حال ہو کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگتا ہے۔ حالانکہ

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بھیک مانگنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ بھوک سے بے حال ہو کر بھیک مانگنے والے شخص کو اگر 100 روپے مل جانے کے بعد وقت کی روٹی میسر آ رہی ہے تو اس کا بڑھا ہوا ہاتھ پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔ خواہ اسے ہزار روپے ہی کیوں نہ مل جائیں۔

اگر اس کی سوچ چودہ سو سال پہلے کی ہوتی تو وہ سوچتا کہ اگر بھیک مانگنا میری مجبوری بن ہی گیا ہے تو میں صرف اس وقت تک مانگوں گا جب تک میری بنیادی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔

وہ پیغام جو آپ ﷺ نے پھیلایا تھا، پہلے ہم نے اس کی جزئیات کو فراموش کر دیا پھر رفتہ رفتہ کل سے بھی آنکھیں چرانے لگے۔ ہم Selective ہو گئے۔ جو چیزیں ہمیں Suit کرتی ہیں اس پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی تاکید کرتے ہیں۔ جو چیزیں ہمیں Suit نہیں کرتیں ان سے پہلوتہی کرنے لگتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل میں امریکہ گیا تو ڈاکٹر حضرات کی قائم کردہ ایک نقشبندیہ فاؤنڈیشن میں مجھے مدعو کیا گیا کہ امریکی نوجوان اسلام کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت Vocal ہیں اور کوئی بھی سوال کرنے سے ہچکچاتے نہیں۔ ہم نے یہاں بہت سے اچھے صاحبان علم کو دعوت کلام دی لیکن وہ یہاں کی زبان اور طور طریقوں سے ناواقف تھے اس لیے ان کی کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ کچھ صاحبان علم امریکیوں کے تیکھے سوالوں سے بھڑک اٹھے۔ آپ بھی ایک کوشش کر دیکھیے۔ میں نے کہا کہ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ جس طرح وہ رو رہے ہیں ان کے گلے لگ کر میں بھی ویسے ہی رو دوں گا۔

نقشبندیہ فاؤنڈیشن کی انتظامیہ نے شکاگو میں ایک ہال بک کروایا۔ آرگنائزر نے Audience سے کہا کہ آپ اپنے سوالوں کو تہذیب کے دائرے میں رکھیے گا۔ تب میں نے مائیک سنبھالا اور ان سے کہا:

"I request you to put me any question, however vulgar it may be. Please feel free to ask me any type of question."

ایک امریکی نوجوان نے سوال کیا۔

"Why you people are fundamentalist?"

اب وہ سوچ رہے تھے کہ میں اپنے آپ کو Defend کروں گا لیکن میں نے ان سے کہا کہ کاش میں Fundamentalist ہوتا۔ یورپ اور امریکہ میں دو مسلمان شخصیات کی Virtual worship ہوتی ہے۔ مولانا روم اور صلاح الدین ایوبی۔ حال ہی میں انھوں نے ایک کتاب شائع کی "Personalities of the Millennium" جس میں صلاح الدین ایوبی دسویں یا گیارھویں نمبر پر ہے۔ اس نے غیر مسلموں کو سبق سکھایا ہے لیکن وہ اس کے کردار کی وجہ سے اسے سر پر بٹھاتے ہیں۔ میں نے انگریزوں کی اس بات کا فائدہ اٹھایا۔

"I wish I could spend a life like Salah-ud-Din Ayyubi. Yes, he was the fundamentalist."

اس کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ صلاح الدین ایوبی بنیاد پرست تھا۔ جب رچرڈ دی لائن ہارٹ سے وہ لڑ رہا تھا اور رچرڈ کی تلوار ٹوٹ گئی تھی تو صلاح الدین ایوبی نے لڑائی سے ہاتھ روک دیا تھا۔ اپنے اسلحہ خانے سے اُسے نئی تلوار منگوا کر دی اور کہا "اب مقابلہ کرو۔"

ہاں وہ بنیاد پرست تھا کیوں کہ جب وہ اپنی کمانڈ پوسٹ سے میدانِ جنگ کا نظارہ کر رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی فوج کا ایک افسر رچرڈ کے ساتھ مصروفِ جنگ ہے۔ اسی دوران ایک سپاہی نے آ کر رچرڈ کے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ یہ دیکھ کر صلاح الدین ایوبی نے فوراً اپنے شاہی اصطبل سے ذاتی استعمال کا گھوڑا منگوا کر اُسے بھیجا اور رچرڈ کو پیغام دیا کہ اس پر سوار ہو کر میرے افسر سے لڑو۔ جب رچرڈ بیمار ہوا اور اُس کا علاج انگلینڈ میں ممکن نہ رہا تو یہ خبر ملنے پر صلاح الدین ایوبی نے اپنے ذاتی معالج کو اُس کے پاس روانہ کیا جو تین مہینے سے زیادہ اُس کا علاج کرتا رہا۔ رچرڈ کے صحت یاب ہونے کے بعد وہ واپس آیا۔

ہاں! صلاح الدین ایوبی Fundamentalist تھا۔ اسی طرح وہ چیف جسٹس بھی Fundamentalist تھا جس نے یروشلم عیسائیوں کو واپس کرنے کا فیصلہ دیا تھا۔

"I wish! I would have been a fundamentalist."

بات یہ ہے کہ اگر ہماری چودہ سو سال پہلے والی سوچ ہو جائے تو ہمارے 99 فی صد مسائل حل ہو جائیں۔ اسلام کے معاشی نظام کو پرکھ کر دیکھیے۔ اس کی بنیاد خوفِ خدا اور احساسِ ذمہ داری پر ہے۔ زکوٰۃ فرض ہے۔ اسلام میں سود کی ممانعت ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے جہاں پر انسان اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ قرضِ حسنہ کی اسی لیے ترغیب دی گئی ہے۔

چودہ سو سال پہلے ہمارے قلوب بدل دیے گئے تھے۔ اگر ہماری آج بھی وہی سوچ ہو جائے تو پھر سائنسی ترقی، کمیونیکیشن اور دنیا کے Global Village بن جانے کے نتیجے میں جو Dynamics بن رہے ہیں اسلام کے Concepts اُن سے کہیں زیادہ Dynamic ہیں۔

اسلامی احکامات کا حُسن

سوال: کیا نماز تراویح تنہائی میں بغیر جماعت کے بھی ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب: مختصری بات یہ ہے کہ تراویح فرض نہیں۔ آپ ﷺ کا معمول رہا ہے کہ آپ ﷺ نے فرض نماز مسجد میں باجماعت ادا کی۔ سنتیں، واجب، نوافل گھر میں ادا کیے۔ اہل عرب پر ہمارے ہاں کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مکمل نماز نہیں پڑھتے۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ آپ ﷺ کی سنت کی پیروی میں صرف فرض نمازیں مسجد میں ادا کرتے ہیں اور باقی نماز گھر پر ادا کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بہت سے دیگر معاملات کی طرح عبادات میں بھی یہ روایت پڑ گئی کہ مبارک اور بابرکت راتوں جیسے لیلۃ القدر، شب معراج، شب برات وغیرہ میں شب بیداری کے لیے مساجد میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ میری Understanding تو یہ ہے کہ انسان اپنی نفلی عبادات کو جتنا چھپا کر کرے، اتنا ہی بہتر ہے کیوں کہ ایسی پوشیدہ عبادت زیادہ رنگ لاتی ہے۔ نفلی عبادت کے اظہار سے انسان میں تکبر کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔

تراویح نماز گھر میں ادا کرنے کی صورت میں یہ دقت پیش آئے گی کہ ہم چونکہ عجمی ہیں اور سارے لوگ ہم میں سے حافظ قرآن بھی نہیں حتیٰ کہ اہل عرب جن کی زبان ہی عربی ہے ان میں بھی حفاظ لوگوں کی تعداد کم ہے۔ قرآن پاک کا پڑھنا اور سننا باعث برکت و ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ قرآن پاک کی حفاظت کا ایک طریقہ نماز تراویح کا قیام ہے جس میں ہر ماہ رمضان میں حفاظ کرام قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ اقتدا کرنے والے نمازیوں میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو قرآن پاک پڑھنا تو جانتے ہیں لیکن انھیں یہ حفظ نہیں ہوتا۔ حفاظ صاحب کی قرات سن کر مقتدیوں کو قرآن پاک کی تلاوت کے دوران کی جانے والی اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا ہے اور یوں وہ ان غلطیوں کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ نماز تراویح کے دوران کی جانے والی تلاوت قرآن پاک کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں Additions اور Alterations کا خطرہ نہیں رہتا۔ حافظ قرآن نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں تنہائی میں نماز تراویح ادا کرنا شاید ہر ایک کے لیے ممکن نہ ہو اس لیے مساجد میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ البتہ ایک

حافظ قرآن تنہائی میں بغیر جماعت کے بھی تراویح ادا کر سکتا ہے۔

سوال: کیا خودکش بم دھماکے جائز ہیں؟ کیا ایسا شخص جنت میں جائے گا؟

جواب: میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ میں فتویٰ دینے کا مجاز نہیں کیوں کہ یہ مفتی کی ذمہ داری ہے اور مفتی ہونے کے لیے جو شرائط ہیں میں ان پر پورا نہیں اترتا۔

البتہ میری ذاتی رائے جب وہ ضرور دیں میں عرض کر دیتا ہوں۔ بم یا گولی چلتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی زد میں آنے والا انسان معصوم ہے یا گناہ گار۔ بم کی زد میں آنے والا شخص خواہ وہ بے گناہ ہے یا گناہ گار، مارا جائے گا۔ اسی طرح گولی مجرم، خطاکار یا گناہ گار کو Hit کرنے سے پہلے انھیں شناخت نہیں کرے گی بلکہ جو سامنے آئے گا، اس کو لگ جائے گی۔

رب تعالیٰ نے دین اسلام کے پیروکاروں کو جنگ کی صورت میں جو احکامات دیے ہیں وہ واضح ہیں۔ مسلمان صرف اس وقت ہتھیار اٹھاتا اور استعمال کرتا ہے جب دشمن اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ عین لڑائی کے عروج میں اگر دشمن ہتھیار ڈال دے اور صلح کی درخواست کر دے تو وہی مسلمان جو قہر بن کر دشمن پر ٹوٹ رہا تھا اپنے دشمن کی خدمت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ پوری طرح اُسے Look after کرے گا، اس کا خیال رکھے گا اور سب سے بڑھ کر دشمن کی عزت نفس کا خیال رکھے گا تاکہ وہ کسی بھی صورت Humiliation محسوس نہ کرے۔ یہی دشمن اگر دوبارہ ہتھیار اٹھائے تو مسلمان پھر اس کے لیے قہر بن جائے گا۔

حالت جنگ میں بھی دشمن کی خواتین، بچے اور بوڑھے جو جنگ کرنے کے قابل نہیں، مسلمان انھیں پناہ دے گا۔ ان کی عزت و احترام کا خیال رکھے گا اور ان پر ہتھیار نہیں اٹھائے گا۔ فتح کی صورت میں مسلمان دشمنوں کے گھر نہیں جلائے گا۔ پودوں اور درختوں کو دوران جنگ بھی کاٹنے اور نقصان پہنچانے کی ممانعت ہے۔

جس مذہب میں ایسے احکامات ہوں وہاں بے گناہوں کا قتل بھلا کیسے جائز ہو سکتا ہے! جنگ کے آداب کا خیال رکھنا مسلمان پر لازم ہے۔ اگر Bombing مسلمانوں کے درمیان ہو رہی ہے تو ہمیں وہ حدیث یاد کر لینی چاہیے "وہ شخص ہم میں سے نہیں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ نہیں۔" بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ خودکش بم دھماکے میں اپنی جان دے دیتے ہیں اور بہت سے بے گناہوں کی جان لیتے ہیں، اس حدیث کی روشنی میں جب وہ آپ ﷺ کی امت ہی سے باہر ہو گئے تو پھر جنت میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک خودکش بم دھماکے کرنا جائز نہیں ہے۔

سوال: جب موت کا وقت، طریقہ اور مقام متعین ہے تو پھر ایک قاتل کو قتل کی سزا کیوں؟

جواب: موت کا وقت، طریقہ اور مقام معین تو ہے لیکن یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حضرت علیؓ نے فرمایا تھا "جو رزق کسی کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے، وہ اُسے مل کر رہے گا لیکن یہ انسان کی اپنی Choice ہے کہ وہ اُسے حلال طریقے سے حاصل کرتا ہے یا حرام راستے سے۔" یعنی موت کا وقت، طریقہ اور مقام تو معین ہے وہ

تبدیل نہیں ہو سکتا لیکن یہ چیز انسان کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ حرام موت کا انتخاب کرے یا طبعی موت کا انتظام کرے۔ اس لیے خودکش Bombing خودکشی کے زمرے میں آتی ہے جو حرام ہے۔ اگر کوئی قاتل کسی شخص کو قتل کرنے کے بعد یہ کہہ دے "صاحب! اس کی موت کا طریقہ، وقت اور مقام اسی طرح معین تھا تو پھر میرے ہاتھوں اگر وہ قتل ہو گیا تو میرا کیا جرم ہے اور قتل پر سزا کیسی؟"

اس کا یہ جواز بے جا ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی کی موت کا طریقہ، وقت اور مقام معین ہے لیکن ہم اس کے ذمہ دار کیوں نہیں؟

سوال: عراق میں خودکش بم دھماکے عام ہیں۔ عراقیوں کے نزدیک دشمن کو زک پہنچانے کا واحد طریقہ یہی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: اسلام تو بہت آگے کی بات ہے غیر مسلموں اور دہریوں میں بھی یہ طریقہ رائج نہیں کہ کوئی سپاہی اپنی مرضی یا کمانڈر کے حکم سے سینہ پر بم باندھ کے ٹینک کے نیچے لیٹ جائے۔ دنیا کی کسی فوج میں یہ طریقہ رائج نہیں۔ ایسا صرف ایک موقع پر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں جب جاپانی فورسز کے Losses اتحادیوں کے Losses سے تقریباً دس گنا زیادہ تھے۔ جاپان ایئر فورس نے خودکش بمباروں کا طریقہ اپنایا تھا پھر بھی جاپانی فورسز بہت کم جہازوں کو Damage کر پائیں جس میں اتحادیوں کے بھی کچھ Life losses ہوئے لیکن اس کے برعکس جاپانی فورسز کے Losses بہت زیادہ ہوئے۔ جاپانیوں کے عقیدہ کے مطابق خودکشی بہت اعلیٰ و ارفع چیز ہے۔ یہ واحد مثال ہے۔

1965 کی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے بھی کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں کہ پاک فوج کے جوانوں نے سینوں پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کو روکا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ جب سپاہی مورچوں میں بیٹھ کر لڑ رہے ہوتے ہیں اور سامنے سے دشمن کا ٹینک آ جائے تو دشمن عموماً انہیں دیکھ نہیں پاتا اور ان کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ اگر Trenches میں موجود فوجیوں کو ٹینک کی سمت کا اندازہ ہو جائے تو وہ مورچے میں دبک جاتے ہیں اور محفوظ رہتے ہیں۔ یہ وہ وجہ تھی جس کی بنا پر اس غلط فہمی نے جنم لیا کہ شاید 1965ء کی جنگ میں پاکستانی فوجیوں نے سینہ پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینک تباہ کیے۔

جہاں تک عراق میں خودکش بم دھماکوں کے ذریعے دشمن کو زک پہنچانے کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ جب دشمن ہتھیار اٹھائے اور آمادہ جنگ ہو تو اس کا قتل مسلمان پر حلال ہے۔ عراق میں دشمن کی فوج ڈیرا ڈالے بیٹھی ہے۔ وہاں دشمن کو نقصان پہنچانے کا صرف یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے کہ عراقی فوج جسم سے بم باندھ کر دشمن کو تباہ کرے کیونکہ عام طریقے سے اسے نقصان پہنچانا ممکن نہیں رہا۔ یہ طریقہ وہاں جنگ ہی کا ایک حصہ ہے۔

رحمتوں اور نعمتوں سے مستفیض ہونے کا فارمولا

سوال: ہم دورانِ اعتکاف اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ کس طرح مستفیض ہو سکتے ہیں؟

جواب: جب تک ہم حقوق العباد صحیح طریقے سے ادا نہ کریں، حقوق اللہ ادا ہو ہی نہیں سکتے۔ ہمارے معاشرے میں حقوق اللہ پر زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے۔ یوں اسلام کے بارے میں ایک تصور یہ پیدا ہو گیا کہ اسلام عبادات کا مجموعہ ہے اور اگر عبادت کر لی جائے تو ہماری دنیا بھی سنور جائے گی اور آخرت بھی بہتر ہو جائے گی۔ یہی تاثر آہستہ آہستہ چلتے چلتے وقت اور حالات کی مجبوریوں کے تحت ہمیں وہاں لے آیا ہے جہاں ہم میں سے لوگوں کی اکثریت نے یہ سمجھا کہ ہماری تمام مشکلات اور مسائل کا حل اور آخرت میں مغفرت اور جنت کا حصول شاید ممکن ہے وظائف اور تسبیحات سے۔ جس طرح دنیاوی زندگی میں ہم Short cuts کی تلاش میں رہتے ہیں، ہم نے مذہب میں بھی ایک Short cut یہ ڈھونڈا کہ ایسی نمازوں کی تلاش کی جائے جس میں ایک نماز کا ثواب ہزار نمازوں کے برابر ہو۔ بجائے ہزار نمازیں پڑھنے کے ہم ایک ہی نماز پڑھ کر جنت حاصل کر لیں۔ لیکن ہمارے ذہن سے ایک چیز محو ہو گئی کہ اگر کہیں ہم نے اللہ کے بندوں کو ناراض کیا تو پھر ہماری عبادات، ہماری مغفرت اور جنت کے حصول میں کام نہیں آئیں گی۔

اچھی آخرت کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی دنیا اچھی کر لیں اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا کی زندگی بے وقعت اور بے قیمت نہیں ہے بلکہ یہ اس لحاظ سے آخرت کی زندگی سے زیادہ اہم ہے کہ جو کچھ ہم یہاں بو جائیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے۔ دنیا کی یہ زندگی آخرت کی زندگی کو بنیادی اہم کر دے گی۔ اگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آخرت میں مجھے جنت اور اللہ کی خوشنودی نصیب ہو جائے تو اس کے لیے مجھے یہیں محنت کرنا ہو گی۔

اب اگر میں اعتکاف میں بیٹھتا ہوں لیکن صورت حال یہ ہے کہ میں نے اپنے پڑوسی کو ناراض کر رکھا ہے۔ اس کی کسی بات یا خطا کو برداشت نہیں کرتا یا میری حرکتوں کی وجہ سے میرا پڑوسی مجھ سے خوش نہیں ہے تو

میں یہ توقع کیسے رکھوں گا کہ مجھے دوران اعتکاف نعمتوں اور رحمتوں سے واسطہ پڑ جائے گا؟ اگر میں خوشحال ہوں یا نہیں ہوں تب بھی کم از کم دو بار کھانا ضرور کھاتا ہوں۔ اگر میرا کوئی بھائی، کوئی دوست، کوئی بڑی مصیبت کا شکار ہے اور میں اس کی مدد کو رضاکارانہ طور پر نہیں پہنچتا تو دوران اعتکاف رحمتوں سے میرا واسطہ کیسے پڑے گا؟ میں رحمتوں کی بارش سے فائدہ کیسے حاصل کروں گا؟

میں ٹریننگ کی بات کر رہا ہوں اور آپ سب تو تصوف کے شیدائی ہیں اور ماشاءاللہ آپ سب کی منزل بھی ہے کہ ہم سب ولایت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو جائیں۔ حالاں کہ میرا تو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تصوف کے بارے میں میں تو جانتا نہیں کچھ بھی۔ اس کی جب ٹریننگ ہوتی ہے تو اس میں ہونے والا کوئی بھی نقصان درحقیقت نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہوتا ہے۔ فائدہ یوں کہ جب ہمارا نقصان ہوتا ہے تو ہم اسے بغیر اف کیے برداشت کرنا سیکھتے ہیں۔ اس نقصان کو من جانب اللہ سمجھ کر نہایت خندہ پیشانی سے جھیلتے ہیں تو اس کے جواب میں ہمارے اندر صبر کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور جب صبر کا مادہ ہمارے اندر پیدا ہو گیا تو ہم اجر کے مستحق ٹھہرے۔ پھر اللہ ہمارے ساتھ ہو گیا۔

یوں ہمارا ہر نقصان درحقیقت فائدہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا جائے اور جو فقیر نقصان خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کر سکتا، وہ فقیر نہیں بلکہ حریص ہے۔ ہم کسی شخص کے ساتھ کوئی بھلائی کا سلوک کرتے ہیں، اس کا خیال رکھتے ہیں اور وہ جواب میں ہمارے ساتھ دشمنی کا سلوک کرتا ہے تو ایسے میں ہم اپنے آپ کو سمجھا لیں کہ میں نے اچھا سلوک اس شخص کے لیے نہیں بلکہ رب کی رضا کے لیے کیا تھا کہ میرے رب کا حکم یہی ہے کہ اس کے کسی بندے کو تکلیف میں دیکھ کر اس کی مدد کو پہنچا جائے۔ میری اس نیکی کے جواب میں اگر اس شخص نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے تو میرے اچھے سلوک کا اس کی دشمنی سے کیا تعلق۔

فقیر یوں بھی سمجھتا ہے کہ اس آدمی کا کیا قصور ہے۔ اس آدمی کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے، وہ دشمنی کرے تو اس کا کیا قصور؟ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے کسی سانپ کو اٹھا کر کسی درویش نے اپنے کرتے میں رکھ کر سینے سے لگا لیا۔ سانپ کو گرمی پہنچی اور وہ ہوش میں آیا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے درویش کو ڈس لیا۔ ان درویش کے مریدوں نے کہا "حضور! یہ آپ کو ڈس رہا ہے اور آپ پھر اسے سینے سے لگا رہے ہیں۔" درویش نے کہا "سانپ کے شکریہ ادا کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ وہ اپنے انداز میں میرا شکریہ ادا کر رہا ہے۔"

اگر ہم نے دوسرے شخص کی دشمنی، اس کی منہ زوری اور الزام تراشی کو ہنس کر برداشت کر لیا، نہ ہمارے دل میں میل آیا کسی کے لیے نہ ہمارے نفس نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اس شخص کے ساتھ بھلائی کا سلوک نہ کریں کیوں کہ ہمارے ساتھ برا سلوک کر رہا ہے۔ یوں ہمیں اللہ کی رضا حاصل ہو گی اور اللہ کی رضا کے ساتھ ساتھ ہم نے اللہ کو اپنا مقروض بھی کر لیا کیوں کہ وہ قرض ہم نے اپنے رب کو دیا اور وہ اپنا قرض سب سے بہترین انداز میں لوٹانے والا ہے۔

ایک آدمی کے ساتھ اگر میں نے توقع وابستہ کی کہ میرے اور اس کے تعلقات ہیں وہ میرا کام کرے گا اور کسی وجہ سے وہ میرا کام نہیں کر سکا تو بجائے گلہ شکوہ کرنے کے اگر میں یوں سمجھ لیتا ہوں کہ اسے وقت نہیں ملا ہوگا یا میں یوں سمجھوں کہ میرا کام اس لائق نہیں ہے کہ اس پر وہ وقت ضائع کرے۔ یوں میں نے محسوس کر لیا اور گلے شکوے سے بچ گیا کیوں کہ گلے شکوے کرنے کی عادت نہ رب کو پسند ہے نہ اس کے رسول ﷺ کو۔ فقیر ہمیشہ گلے شکوؤں سے بچا رہتا ہے۔ فقیر کے کوڈ آف کنڈکٹ (Code of Conduct) میں یہ لکھا ہے کہ وہ کبھی مدعی نہیں بنتا۔

جب ہم شکایت کرتے ہیں تو ہم مدعی بن جاتے ہیں۔ یہ فقیر کے کوڈ آف کنڈکٹ کے خلاف ہے۔ اگر ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پابندی نہیں کرتے تو ہم نیکی کے اس مقام پر کیسے پہنچیں گے جہاں اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ ایک طرف تو ہم نے اللہ کی پسندیدہ چیزوں کی خلاف ورزی کی اور دوسری طرف یہ توقع رکھی کہ ہماری عبادات کا صلہ ہمیں اپنے رب سے بہت اچھا مل جائے گا تو ہمیں ثواب تو ان عبادات کا مل جائے گا لیکن رب کی رحمتیں حاصل نہیں ہوں گی کیوں کہ رحمتیں صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جو مال اور اولاد کے نقصان سے جب آزمائے جاتے ہیں تو وہ انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں۔ قرآن پاک کی ایک آیت کے ترجمے کے مفہوم کے مطابق انھیں اللہ کی خاص رحمتوں کی خوشخبری سنائی جاتی ہے۔

یوں جب ہم نقصان پر صبر کرتے ہیں تو درحقیقت وہ نقصان نقصان نہیں رہتا فائدہ میں بدل جاتا ہے۔ اگر مجھے مالی نقصان کے جواب میں اللہ کی رحمتیں عطا ہو جائیں تو یہ گھاٹے کا سودا ہے یا فائدے کا؟ اس کا فیصلہ انسان بآسانی کر سکتا ہے۔

سوال چونکہ یہ ہے کہ ہم دوران اعتکاف اللہ کی رحمتوں سے زیادہ سے زیادہ کس طرح مستفیض ہو سکتے ہیں؟ اس کا طریقہ تو میں نے بتا دیا آپ کو اور جہاں تک تعلق ہے اعتکاف کے حوالے سے خاص عمل کا تو اعتکاف میں بیٹھنے کی تیاری پورا سال کیجیے۔ عید کی شام سے لے کر آئندہ ایام اعتکاف کے آنے تک مذکورہ عمل کرتے جائیے۔ اللہ کے بندوں کے لیے بہت مہربان ہو جائیے۔ درگزر اور عفو کی خصوصیات پر عمل پیرا ہو جائیے۔ یہی خاص عمل ہے اعتکاف میں رحمتیں سمیٹنے کا۔

سوال: جہنم سے آزادی والے عشرہ سے زیادہ فائدہ کس طرح سمیٹا جا سکتا ہے؟

جواب: جہنم سے آزادی کا آسان نسخہ یہ ہے کہ اللہ کو راضی کر لیا جائے، اس کی خوشنودی حاصل کر لی جائے۔ اللہ کی رضا اور خوشنودی اس وقت حاصل ہوگی جب ہم اللہ کی سنت پر عمل کرنا شروع کر دیں۔ اب اللہ کی سنت کیا ہے؟ اللہ سب سے بڑا معاف کرنے والا ہے۔ سو ہم اپنے بھائیوں کے بڑے سے بڑے قصور کو معاف کر دیا کریں۔

اللہ سب سے بڑھ کر درگزر کرنے والا ہے۔ ہم بھی درگزر کرنا شروع کر دیں۔ اللہ کائنات میں سب سے

ذاتی ہے۔ اس کی جو صفت ہے رحمٰن یہ صرف اسی کی صفت ہو سکتی ہے۔ انسان کی تخلیق ہوئی اور اللہ نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ اس نسبت سے اللہ کے Attributes کا ہلکا سا عکس انسان میں آ گیا لیکن اللہ کے Attributes میں سے رحمٰن صرف اللہ تک محدود ہے۔ یہ انسان میں نہیں آیا اس لیے رحمٰن اور رحیم الگ استعمال ہوا۔ لغت کے لحاظ سے یہ دونوں ہم معنی ہیں لیکن اصطلاحی لحاظ سے دونوں مختلف ہیں۔ اللہ اس جہان میں رحمٰن ہے۔ وہ بغیر کسی تفریق کے اپنے تمام بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ اس کی رحمتیں اپنے تمام بندوں پر یکساں نازل ہوتی ہیں، ماننے والوں پر بھی اور نہ ماننے والوں پر بھی۔ وہ بغیر دیکھے دیتا ہے کہ کون مومن ہے کون مشرک ہے۔ وہ تمام لوگوں کی حاجت روائی فرماتا ہے۔ چونکہ وہ بغیر دیکھے اور بغیر تفریق کے عطا فرماتا ہے یوں وہ رحمٰن ہے اس جہان میں۔ رحمٰن ہونا اسی کو سزاوار ہے لیکن آخرت میں وہ رحیم ہوگا۔ وہاں وہ ہر آدمی کے نیک اعمال کو ناپ تول کر اس کے مطابق اپنی رحمتوں کی بارش کرے گا۔ اسی طرح سخاوت بھی اللہ کی صفت ہے۔ اگر ہم اپنے دوستوں اور دشمنوں۔۔۔ بالخصوص محتاجیں اور دشمنوں کے لیے اپنا ہاتھ کھلا رکھیں اور اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے ایک حصہ اللہ کے بندوں کے لیے کھول دیں تو یہ اللہ کی سنت پر عمل ہوگا۔

ہمارا نفس اکثر کہتا ہے کہ یہ شخص تو حق دار نہیں تو میں اس کی مدد کیوں کروں؟ یہاں ہم خود کو سمجھا لیں کہ میرا رب بھی تو مجھے دیتے وقت کبھی نہیں دیکھتا کہ میں اس کا حق دار ہوں بھی یا نہیں؟ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ صبح سے شام تک میں اس کے احکامات پر صحیح طریقے سے عمل پیرا ہوا یا نہیں۔ وہ میری نافرمانی اور فرماں برداری بھی نہیں دیکھتا مجھے عطا کرتے ہوئے۔ وہ میری تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، میری حاجت روائی کرتا ہے جب کہ سب کچھ اس کا ہے۔ وہ اس کا مالک ہے۔ وہ اپنی چیز اپنے خزانے سے مجھے عطا کرتا ہے لیکن میں، جس کے پاس سب کچھ دیا ہوا اسی رب تعالیٰ کا ہے، اس میں سے دیتے ہوئے ہزار بار سوچتا ہوں کہ یہ شخص حق دار ہے بھی یا نہیں تو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس کھوج میں پڑوں کہ یہ حق دار ہے بھی یا نہیں۔ حالاں کہ میرا تو کچھ ہے ہی نہیں، سب عطا کردہ ہے رب کا۔ ہماری ملکیت نہیں ہے وہ۔ پھر ہم اللہ کے دیے میں سے اللہ کے بندوں کو دیتے ہوئے سوچ میں کیوں پڑ جاتے ہیں کہ یہ حق دار ہے بھی یا نہیں۔ اللہ کی سنت پر اگر عمل کر لیا جائے، تو اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو جائے گی اور جہنم تو خود اس کے بعد ہم پر حرام ہو جائے گی۔

ماہِ رمضان کا جو عشرہ جہنم سے رہائی کا ہے اس میں ہم نے کسی صاحبِ علم سے جہنم کی آزادی کا کوئی وظیفہ پوچھ لیا اور سارا سال اعمال کی اصلاح پر توجہ نہ دی تو ہم بڑی اہم بات ایسے میں بھول گئے۔ شہید کا رتبہ بہت بلند ہے۔ جو لوگ رب کی راہ میں مارے جاتے ہیں رب نے انھیں زندہ قرار دیا اور یہ بھی فرمایا کہ وہ اپنے رب کا دیا ہوا رزق کھاتے ہیں اور حدیث یہ کہ شہید بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل کر دیا جائے گا لیکن ایک مقام ایسا ہے جہاں شہید بھی جنت میں جا نہیں سکتا تاوقتیکہ اگر اس نے کسی کا قرض ادا کرنا ہے تو وہ قرض ادا نہ کر دے۔

اگر ہم سوچ لیں کہ شہید جس کا مقام اتنا بلند ہے کہ قرآن میں اس کا ذکر آیا لیکن ایک چیز یعنی قرض کی عدم ادائیگی اس کے اور جنت کے درمیان رکاوٹ ہے۔ اس سے حقوق العباد کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ فرض عبادات کے ساتھ ساتھ ہم حقوق العباد کی ادائیگی کا بالخصوص اہتمام کریں اور دعا کریں کہ ان حقوق العباد کی ادائیگی کے صدقے میں اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمادے اور حقوق اللہ کی ادائیگی میں جو کوتاہی ہم سے ہوگی ہے وہ معاف فرمادے۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس بات میں کوئی سچائی ہے تو اس پر عمل کر دیکھیے۔ ہماری دنیاوی زندگی آسان ہو جائے گی فوری طور پر۔ آپ کو اس بات کی سچائی کی گواہی مل جائے گی۔

سوال: حقوق العباد کے حوالے سے یہ سوال ہے کہ اس مہنگائی کے دور میں حج پر رقم خرچ کرنے کے بجائے غربا پر خرچ کر دی جائے تو؟

جواب: حج فرض عبادت ہے ان تمام لوگوں پر جو استطاعت رکھتے ہیں۔ خیرات نفلی عبادت ہے۔ نفلی عبادت کے لیے ہم فرض عبادت کو قربان نہیں کر سکتے اس لیے فرض سب سے پہلے، پھر واجب اور نفلی عبادت سب سے آخر میں آئے گی۔

سوال: حج زندگی میں ایک بار صاحب استطاعت پر فرض ہے تو کیا دوسرا اور تیسرا حج فرض شمار ہوگا یا نفلی عبادت؟

جواب: ہم سب پر دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ جو آدمی تہجد پڑھتا ہے وہ اللہ کا بڑا قریبی آدمی ہوتا ہے۔ جو اشراق پڑھتا ہے وہ اور بھی قریبی اور جو ہر وقت اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اور بھی قریبی۔

حج بھی اگر توفیق کی صورت میں ایک سے زیادہ بار کیا جاتا ہے تو وہ شخص اللہ کو بہت پسند ہوگا۔

سوال: کیا حادثات اور دہشت گردی میں ہلاک ہونے والے لوگ بھی شہید ہیں؟

جواب: ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

''جو جل کر مرا اور جو ڈوب کر ہلاک ہوا وہ بھی شہید ہے۔''

(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 3113)

شہید کے مختلف درجات ہیں۔ اعلیٰ ترین درجہ اسی شہید کا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا شہید ہوا۔ قرآن پاک میں ذکر بھی اسی شہید کا ہے جو اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہوا شہید ہوا۔

سچی خوشی کا راز

ہم میں سے ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک ہمارے پاس خوشی کی کوئی وجہ نہ ہو۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں جب کسی کو خوش دیکھتے ہیں تو بے ساختہ پوچھتے ہیں ''کیا بات ہے، بہت خوش نظر آ رہے ہو؟''

ہمارے نزدیک خوش ہونے کی کوئی وجہ ضروری ہے حالاں کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ خوشی ہمارے اندر موجود ہوتی ہے لیکن ہم اسے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ہماری خوشی جو، اس چیز سے Generate ہوتی ہے جس کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ چھن جائے یا اس میں کمی واقع ہو جائے تو یہ بات ہمارے لیے صدمہ کا باعث ہوگی لہٰذا ہم اس چیز کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ سینے سے لگا کر رکھنے کے باوجود وہ چیز ہم سے چھن جاتی ہے۔ وہ چیز ہے مال و دولت۔

آپ زندگی میں اہل فقر سے تو ملے ہی ہوں گے۔ عموماً ان اہل فقر اور درویشوں کے پاس کھانے کو کچھ موجود نہیں ہوتا، رہنے کو کوئی مناسب رہائش نہیں ہوتی، پہننے کو ڈھنگ کا لباس نہیں ہوتا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ ہر وقت خوش نظر آتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ برے حالات میں رہنے کے باوجود یہ درویش خوش نظر آتے ہیں؟

اگر ہم اہل فقر کی زندگی کا بغور جائزہ لیں (ان کی کرامات میں نہ کھو جائیں) تو ہمیں پتا چلے گا کہ درویش کے پاس کوئی دنیاوی آسائشیں نہیں ہیں۔ کسی بھی دنیاوی پیمانے سے جب ہم اس کی دنیاوی زندگی ناپیں گے تو پتا چلے گا کہ فقیر لینے پر نہیں بلکہ دینے پر یقین رکھتا ہے۔ جب اس کے پاس کسی کو دینے کو کچھ نہ ہو تو وہ لوگوں کے دکھ درد سن کر انہیں تسلی دیتا ہے اور جب اس کے پاس کچھ میسر آ جائے تو وہ اسے لوگوں میں بانٹ دیتا ہے۔ یوں وہ دینے پر یقین رکھتا ہے۔ یہ تو پہلی بات ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ درویش یا فقیر لوگوں کے گلے شکوے نہیں کرتا۔ کوئی اسے کتنی ہی تکلیف اور نقصان کیوں نہ پہنچائے، کیسی ہی مخالفت اور دشمنی کیوں نہ کرے وہ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ آپ ﷺ نے گلہ شکوہ سے منع فرمایا ہے۔ فقیر اس پر عمل کرتا ہے اور یوں

خوشی اس کے اندر سے پھوٹنے لگتی ہے۔ وہ بھی اداس ہونے کے باوجود خوش رہتا ہے۔

ایک برطانوی مفکر اپنی کتاب میں لکھتا ہے: "مجھے سچی خوشی کی تلاش تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ دنیا میں حقیقی خوشی کسی کو حاصل ہے یا نہیں؟ میں نے دنیا کا دورہ شروع کیا۔ مملکت کے سربراہوں سے ملا۔ گورنمنٹ کے سینئر افسران، کاروباری افراد، سیاست دان غرض یہ کہ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملا لیکن مجھے ان میں سے کوئی بھی شخص حقیقی معنوں میں خوش نظر نہ آیا۔ اپنے اس دورے کے آخر میں جب میں تبت کے قریب جنگلات سے گزر رہا تھا تو وہاں مجھے ایک سادھو ملا جو لکڑی کا ایک تختہ بچھائے ہوئے تھا اور اس پر سیدھے رخ کیل گڑے تھے۔ اس سادھو نے جسم پر ملتانی مٹی مل رکھی تھی اور وہ ان کیلوں پر لیٹا ہوا تھا۔ کیل چبھنے کی وجہ سے اس کے جسم سے خون رس رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دنیا کا واحد آدمی تھا جو حقیقی معنوں میں خوش تھا لیکن جس مشقت کے بعد وہ خوش تھا اسے دیکھ کر میں نے سچی خوشی کے حصول سے توبہ کر لی۔"

خدا کے وجود سے منکر وہ برطانوی مفکر ایک بات نہ سمجھ پایا کہ انسان کو سچی خوشی ملتی ہی اس وقت ہے جب وہ دوسروں کے لیے دکھ اٹھاتا ہے۔ جب ہم قرب الٰہی کے لیے سفر کا آغاز کرتے ہیں تو اس سفر کی ابتدا میں رب تعالیٰ انسان کو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پیس کر اس کا سرمہ بنا دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ (معاذ اللہ) رب تعالیٰ کو اس میں کوئی لطف آتا ہے بلکہ اس کے پیچھے بہت سی حکمتیں ہیں۔ جیسے اسلام کی ابتدا نفی (Negation) سے ہوتی ہے۔ کوئی شخص اس Negation میں جائے بغیر مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ پڑھنا پڑتا ہے اور کلمہ کی ابتدا 'لا' یعنی نفی سے ہے۔ اسلام کا اصل مطلب سلامتی ہے اور سلامتی کی ابتدا Negation (نفی) سے ہے۔ قرآن پاک کے اسلوب پر غور کیجیے۔ رب تعالیٰ نے جس بات پر زور دیا ہے اس کی ابتدا نفی سے ہوتی ہے مثلاً

نہیں جا سکتا کوئی شخص جنت میں

نہیں ہو سکتا کوئی شخص مومن

روحانیت میں کوئی شخص اس وقت تک آگے نہ بڑھ پائے گا جب تک وہ اپنی ذات کی نفی نہیں کرے گا۔ اس کے تمام تصورات جو اس سفر کی ابتدا میں اس کے ساتھ تھے، جب وہ ان کی نفی کر دے، خود اپنی ذات کی نفی کر دے تب اس نفی میں سے مثبت ابھرے گا۔ نفی کے مرحلے کے دوران ہم دکھوں سے گزرتے ہیں۔ جب ہم دکھوں سے گزرتے ہیں تو ہماری انا نکل جاتی ہے۔ میں میں کی عادت ختم ہو جاتی ہے۔ یوں اپنے ارادوں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرنے کی روش ہم ترک کر دیتے ہیں۔ جب انسان یہ سب کرنے لگتا ہے تو پھر وہ روحانی طور پر ایک ایسی صاف سلیٹ ہو جاتا ہے جس پر کچھ بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔

روحانیت میں ہم اپنی خواہشات پر اور اپنے اوپر جتنا زیادہ جبر کریں گے اتنی زیادہ روحانیت حاصل ہو جائے گی۔ اس دکھ اور درد سے گزرتے گزرتے روحانیت کے ایک خاص مقام پر پہنچ کر بندے کو رب کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں انسان دکھ نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ اس کے

اندر خوشی بھری رہتی ہے۔ اسی لیے فقیروں کے چہرے دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ چمک ہوگی۔ یہ چمک خوشی کی ہوتی ہے۔

لیکن ایک بار پھر دہرا دوں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے ہمیں دوسروں کو دینے کی عادت خود میں ڈالنی ہوگی۔ اگر ہمارے پاس کچھ نہ ہو تو کم از کم دوسروں کو تسلی دیتا ہوگی۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ دوسروں کو دیتے رہیے۔ رب تعالیٰ آپ کو اندر سے بھر دے گا۔ وہ آپ کی ضروریات کا ذمہ دار ہو جائے گا۔ آپ کی حاجات غیب سے پوری ہونے لگیں گی۔ رب تعالیٰ ایسی جگہ سے آپ کو رزق فراہم کرنے لگے گا جہاں سے آپ نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بغیر کسی Conscious effort (ارادی کوشش) کے ہر وقت خوش رہیں تو ہمیں دینے والا ہاتھ بننا ہوگا۔ جب بھی کوئی شخص ہم سے ملے ہم اسے کچھ نہ کچھ ضرور دیں اور کچھ نہیں تو ایک مسکراہٹ ہی سہی۔ In short ہم زندگی میں فقیر کا وہ اصول اپنا لیں،

"میری خوشیاں سب کی خوشیاں ہیں...... لیکن میرے دُکھ صرف میرے ہیں۔"

یہ کبھی نہ کیجیے گا کہ آپ اپنے دُکھ کسی کے ساتھ Share کرنے لگیں۔ فقیر کے دُکھ اس کے اندر رہنے چاہییں۔ ان دُکھوں کا ایک ہلکا سا عکس بھی کبھی آپ کے چہرے پر نہ آنے پائے۔ آپ کے قریبی ترین عزیز مثلاً آپ کی والدہ صاحبہ، بیگم اور آپ کی اولاد تک کو بھی ذرا سا شبہ نہ ہونے پائے کہ آپ کے اندر کتنے دُکھ ہیں۔ یہی فقیر کی شان ہے کہ اس کے دُکھ کبھی دکھائی نہیں دیں گے...... نہ اس کی زبان سے نہ اس کی Body language سے اور نہ اس کی آنکھوں سے لیکن وہ اپنی خوشیاں کبھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ وہ اپنی ساری خوشیاں سب کے ساتھ Share کر لیتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ اپنی خوشیوں میں سب سے کم Share خود اس کا اپنا ہوتا ہے۔ اپنے پاس اپنی خوشیوں میں سب سے تھوڑا حصہ رکھے گا باقی سب دوسروں میں لٹا دے گا جس کے نتیجے میں رب تعالیٰ اسے دائمی خوشی عطا کر دیتا ہے۔ فقیر کے Motto کہ "میری خوشیاں سب کی خوشیاں...... لیکن میرے دُکھ صرف میرے" پر عمل کر لیجیے پھر دیکھیے کہ رب تعالیٰ کی رحمتیں کس طرح نازل ہوتی ہیں اور کیسے کیسے انعامات آپ کو عطا ہوتے ہیں۔

سوال: اگر کوئی شخص اندر سے بہت دُکھی ہو لیکن لوگوں سے ہنس کر ملے تو کیا یہ جھوٹ اور منافقت نہیں؟

جواب: یہ جھوٹ ہے نہ منافقت بلکہ بہت اعلیٰ درجے کی خوبی ہے۔ اس کے پیچھے فلسفہ یہی ہے کہ دُکھوں کا اظہار رب تعالیٰ کی ناشکر گزاری ہے۔ جب ہم اپنے دُکھوں پر واویلا کرتے ہیں تو ہم بھول جاتے ہیں کہ میرا رب مجھے ان دُکھوں سے نجات دے گا کیونکہ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔

جب ہمارا یقین ہے کہ اگر اچھے دن نہیں رہے تو برے دن بھی نہیں رہیں گے اور جب ہم جانتے ہیں کہ رات جتنی بھی گہری اور تاریک کیوں نہ ہو اس کا انجام اجالا ہی ہے۔ جتنا زیادہ گھپ اندھیرا ہو گا طلوع

ہونے والا سویرا اسی قدر اجلا ہوگا۔

جب یہ ایمان، یہ یقین اور یہ امید باقی ہے تو پھر واویلا کس چیز کا ہے؟ اگر ہم واویلا کرتے ہیں تو گویا رب کی رحمت سے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں جس پر شیطان خوش ہوتا ہے کیوں کہ مایوسی کی داغ بیل اسی نے تو ڈالی ہے۔

جو شخص اپنے رب کی رحمتوں پر یقین اور ایمان رکھتا ہے وہ سوچتا ہے کہ یہ مشکل وقت بھی گزر جائے گا۔ میرے رب نے کل تک مجھے خوشیاں دی تھیں، آج وقتی طور پر یہ دکھ آگئے ہیں تو میرا پروردگار اس قدر مہربان ہے کہ وہ ضرور ان غموں کو مسرتوں میں بدل دے گا۔ یہ ایمان ہو تو انسان کڑے وقت کو بھی خوشی خوشی جھیل لیتا ہے۔ پھر اس کی زبان سے اُف تک نہیں نکلتا۔ یاد رہے کہ جو چیز انسان خوشی خوشی برداشت کر رہا ہوتا ہے اس کا اظہار نہیں کرتا۔ اس لیے اگر کوئی شخص اندر سے بہت دکھی ہے لیکن اپنے آپ کو خوش ظاہر کر رہا ہے تو وہ درحقیقت Indirectly لوگوں کو بتا رہا ہے کہ وہ اپنے رب کا اس قدر شکر گزار بندہ ہے کہ دکھوں پر بھی خوش ہے۔ اس کا یہ رویہ اللہ پر توکل اور بھروسے کی نشاندہی کرتا ہے۔

سوال: انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے دکھ اور سکھ Share کرنا چاہتا ہے۔ اس Sharing کا مطلب گلہ شکوہ کرنا نہیں بلکہ محض دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہوتا ہے۔

جواب: ہم اس بند کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اگر باہر ایک شدت کی آواز پیدا ہو تو ہم ایک دم پلٹ کر یا کھڑے ہو کر دیکھیں گے۔ نفسیات کی زبان میں اسے Instinct اور ایک عام آدمی کی زبان میں اسے فطرت کہتے ہیں۔

ایک فوجی کا اسی آواز پر Reaction قدرے مختلف ہوگا۔ آواز سنتے ہی وہ فوراً لیٹ جائے گا، پلٹ کر یا کھڑے ہو کر نہیں دیکھے گا۔ یہ فوجی بھی تو ایک انسان ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس کی Training اور تعلیم نے اس کی فطرت یا جبلت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

اپنی فطرت یا جبلت کو کنٹرول کرنے اور اسے بدلنے کے لیے انسان کو اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ اپنی ٹریننگ کرنا پڑتی ہے۔ جیسے انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے دکھ اور سکھ بانٹنا چاہتا ہے لیکن اپنی تربیت کے بعد وہ اپنی فطرت کا آدھا حصہ تو قائم رہنے دیتا ہے جس کے تحت وہ اپنی خوشیاں دوسروں کے ساتھ Share کر رہا ہوتا ہے لیکن باقی آدھے حصے کو وہ کنٹرول کر لیتا ہے اور اپنے دکھوں کو اس قدر خوبصورتی سے چھپاتا ہے کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہ انسان اندر سے کتنا دکھی ہے۔

اپنی جبلت یا فطرت کو قابو میں لانے کے لیے انسان جس محنت اور مشقت سے گزرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کا بے پایاں انعام اور اجر عطا فرماتا ہے۔

سوال: مولائے کائنات اور مشکل کشا کا کیا مطلب ہے؟ یہ مقام کس کو حاصل ہے؟

جواب: اس پر مختلف مکاتب فکر میں طویل عرصے سے بحث چلی آرہی ہے۔ حاجات پوری کرنے والا اور مشکلوں کو آسان کرنے والا صرف اور صرف رب ہے لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے بندوں پر اس قدر مہربان ہو

جائے کہ اپنا مال و زر، جسمانی و ذہنی قوت دوسروں کے مفاد کے لیے وقف کر دے اور اس شخص کی بڑائی کو ظاہر کرنے کے لیے استعارہ کے طور پر اس کے لیے 'مشکل کشا' الفاظ استعمال کر لیے جائیں تو اس میں حرج نہیں جیسے غزلوں میں مختلف شعرا چہرے کی خوب صورتی کو کھلے قرآن سے تشبیہ دیتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت میں کوئی چہرہ کتنا ہی خوب صورت اور حسین کیوں نہ ہو وہ قرآن کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک بہت عظیم ہستی کو سیف اللہ اور اسد اللہ کہا جاتا ہے تو ذرا سوچیے کیا اللہ نے شیر پال رکھے ہیں یا اللہ تلوار سے لڑتا ہے؟ لیکن وہاں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ صاحب یہ 'سیف اللہ' یا 'اسد اللہ' القابات ہیں۔ اگر اسی sense میں کسی کو مشکل کشا کہا جا رہا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن کسی غیر اللہ کو خواہ وہ کسی بھی مقام پر کیوں نہ ہو، درحقیقت قاضی الحاجات اور مشکل کشا تصور کر لینا شرک ہے۔

جہاں تک 'مولائے کائنات' کی بات ہے تو مولائے کائنات صرف رب ہے لیکن اگر کسی شخص کی بڑائی اور عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی لفظ لقب کے طور پر استعمال ہو رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسے اتاترک یعنی ترکوں کا باپ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سارے ترک ان کی اولاد ہیں۔ لہٰذا محض لقب کی حد تک کسی عظیم ہستی کو 'مولائے کائنات' کہنے میں کوئی حرج نہیں لیکن واقعتاً کسی میں وہ خوبیاں تصور کر لینا درست نہیں۔

سوال: مرنے کے بعد جب انسانی روح عالم برزخ میں چلی جاتی ہے تو کیا قبر کا عذاب روح پر اثر انداز ہوتا ہے؟

جواب: دو چیزیں ہیں جن کو اللہ نے مخفی رکھا ہے ہم ان کی کرید میں نہ پڑیں تو بہتر ہے۔ اگر ان کا واضح کرنا انسان کے لیے بہتر ہوتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ انھیں واضح فرما دیتا۔ حیات بعد الموت، تقدیر اور روح کو اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا بلکہ تقدیر اور روح پر بحث سے منع فرمایا۔

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم ان موضوعات کو نہ چھیڑیں ورنہ ہم سب بھٹک جائیں گے۔ کیوں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کی مصلحتوں اور باریکیوں کے بیان پر قادر نہیں۔ جس طرح روح پر بہت بڑے علما اور محدثین نے قلم اٹھایا لیکن بالآخر وہ سب اس کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے اور اس کو واضح نہ کر پائے ماسوائے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے "حقیقت روح انسانی" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں وہ روح کو کچھ حد تک بیان کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

یہی حال تقدیر کا ہے جس کو کوئی پوری طرح واضح نہ کر سکا۔ اسی طرح حیات بعد الموت کو بھی مخفی رکھا گیا ہے۔ مجھے جس قدر معلوم ہے میں تو بیان کر دوں گا لیکن اس سے ہمارا ذہن اور بھی پراگندہ ہو جائے گا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ان تمام بحث میں پڑنے کے بجائے ہم اللہ سے دعا کریں "یا اللہ تعالیٰ تو ہمیں اپنی امان میں رکھ۔ ہمیں عذاب قبر سے محفوظ رکھ۔" کیوں کہ عذاب ہر حال میں ناقابل برداشت ہی ہوتا ہے۔

سوال: مسئلہ آواگون کیا ہے؟

جواب: ہندو Mythology کے مطابق جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کی روح دوبارہ کسی اور شخص میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ روح کس قسم کے شخص میں داخل ہوتی ہے اس کا انحصار اس روح کے گزشتہ اعمال پر ہے۔

اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں —— ہمارے یہاں حیات بعد الموت ایمان کا لازمی جزو ہے۔ ہم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے جب تک ہم یوم آخرت، یوم حساب اور سزا و جزا پر یقین نہ رکھیں۔ ہمارا عقیدہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ مرنے کے بعد ہماری روح کسی زندہ شخص کے جسم میں داخل ہو جائے گی بلکہ ہم بروز قیامت قبروں سے زندہ اٹھائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہمیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ تب ہمارا نامۂ اعمال ہمارے ہاتھوں میں دے دیا جائے گا اور اس کی بنیاد پر ہماری اخروی زندگی کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

سوال: کیا اس کائنات سے پہلے بھی رب تعالیٰ نے کوئی کائنات تخلیق کی؟

جواب: یہ کرۂ ارض جس پر ہم بستے ہیں اس سے متعلقہ کچھ اور Planets ہیں —— یہ کُل کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ کائنات وہ ہے جس میں تمام سیارے اور سیارچے بشمول یہ کرۂ ارض، یہ سورج، دیگر تمام سورج، آسمان اور کہکشائیں ہیں —— لیکن آپ کا اشارہ غالباً ہمارے اس کرۂ ارض کی طرف ہے۔

یہ تمام کائنات رب تعالیٰ نے چھ دنوں میں تخلیق کی اور سب کچھ ایک ہی وقت میں وجود میں آ گیا۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو اس زمین پر ہم سے پہلے بہت سی تہذیبیں آئیں جن میں سے کچھ اپنے کمال کو بھی پہنچیں جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہ تہذیبیں اپنے اعمال کی وجہ سے تباہ ہو گئیں۔ حال ہی میں ایک قدیم تہذیب دریافت ہوئی ہے جو مصری تہذیب سے پہلے کی ہے۔ ماہرین ارضیات و آثار قدیمہ کے مطابق آثار بتاتے ہیں کہ وہ قوم ہم سے کہیں زیادہ تہذیب یافتہ تھی۔ ٹیکنالوجی میں ہم سے کہیں زیادہ آگے تھی۔ سائنس کا علم بھی اس کے پاس ہم سے کہیں زیادہ تھا۔

قانون فطرت ہے کہ ہر کمال را زوال یعنی جو بھی عروج پر پہنچا اُسے زوال کا سامنا ضرور کرنا پڑا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں عرش پر موجود حجر نور سے ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ علوم کی تحریریں آتی ہیں۔ مصری تہذیب سے بھی قدیم یہ جو تہذیب حال ہی میں دریافت ہوئی ہے اُس کے پاس 50 ہزار علوم آ گئے تھے جب کہ ہمارے پاس تو ابھی محض 18 ہزار علوم ہیں۔

جیسے مارکیٹنگ میں کہا جاتا ہے کہ ہر Product کا ایک Life cycle ہوتا ہے اور وہ پراڈکٹ اپنا Life cycle مکمل کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تہذیبیں بھی اپنا Life cycle مکمل کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ ہم سے پہلے کئی تہذیبیں آئیں، اپنے کمال کو پہنچیں اور ختم ہو گئیں۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر موجود ہے۔

سوال: کیا یہ درست ہے کہ حج کے بعد انسان گناہوں سے پاک ہو کر ایک نوزائیدہ بچے کی مانند ہو جاتا ہے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں کا حج اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے وہ یوں گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ۔ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔ وہ ہر وقت اس انتظار میں رہتا ہے کہ میرا بندہ مجھ سے معافی مانگے اور میں اسے معاف کر دوں، وہ توبہ کرے اور میں اس کی توبہ قبول کر لوں۔

جو شخص اپنے گھر میں بیٹھ کر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اللہ کے حضور سچے دل سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے، اللہ اپنی رحمت کے صدقے اسے بھی معاف فرما دیتا ہے۔ حج تو پھر بہت اعلیٰ و ارفع عبادت ہے اس کے بعد یقیناً انسان شیر خوار بچے کی مانند گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

لیکن ہم اس اُمید پر گناہ کیوں کرتے رہیں کہ حج پر جا کر سارے گناہ بخشوا آئیں گے؟ اسی طرح ہم اس تلاش میں رہتے ہیں کہ ہمیں ایسی نماز کا پتا چل جائے جس کا ثواب ایک ہزار سال کی عبادت کے برابر ہو۔ یعنی ہم جدوجہد اور محنت کے بجائے دُعا پر زور دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ دُنیاوی معاملات میں دُنیاوی کوشش ہم پر فرض ہے۔ جب ہم کوشش کر چکیں تو پھر اللہ کے حضور دُعا کریں "یا باری تعالیٰ! ہم کمزور ہیں۔ Efforts نہیں کر سکے جو ہمیں کرنی چاہیے تھی لیکن ہم نے تیری عطا کردہ ذہنی و جسمانی قوتوں کو استعمال میں لا کر حتی المقدور محنت کی ہے۔ اب تو اس کا وہ نتیجہ ہمیں عطا فرما دے جو ہمارے مفاد میں بہترین ہے۔"

قرآن پاک کے نزول کا مقصد ہمیں سیدھا راستہ دکھانا تھا اور وہ صراطِ مستقیم یہ تھا کہ دُنیا کی محبت ہمارے دل سے نکل جائے لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ہم اسی قرآن کی مختلف آیات کو وظیفہ بنا کر دُنیا کمانے کے لیے استعمال کرنے لگے۔

یہی حال حج کا ہے۔ آپ اکثر لوگوں سے یہ شکایت سنیں گے کہ صاحب طواف کے دوران یا میدان عرفات میں میں نے جو دُعا مانگی وہ تو قبول نہیں ہوئی لیکن دوسری دُعائیں پوری ہو گئیں۔ اب ہوتا کیا ہے؟ جب ہم طواف کر رہے ہوتے ہیں یا دیگر مناسک حج ادا کر رہے ہوتے ہیں تو زبان سے تو ہم کوئی اور دُعا مانگ رہے ہوتے ہیں جب کہ دل میں خیال کوئی اور ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہے "یا اللہ تعالیٰ! میرے گناہ معاف فرما دے" اور دل میں خیال یہ ہے "گھر میں گندم کا جو ذخیرہ ہے اس کا ریٹ نہ جانے بڑھا ہے یا کم ہوا ہے؟ نہ جانے وہ فروخت ہو بھی جائے گا یا نہیں؟" نتیجہ یہ نکلے گا کہ گناہ تو معاف ہوں یا نہ ہوں لیکن گندم کا وہ ذخیرہ ضرور اچھے ریٹ پر فروخت ہو جائے گا۔

اگر ہم ذرا غور کریں تو ہماری دُعائیں قبول اور پوری ضرور ہو جاتی ہیں لیکن وہ دُعائیں جو ہمارے دل میں تھیں اور جن پر ہماری تمام توجہ مرکوز تھی۔

یہ تیرے پُراسرار بندے

سوال: اولیاء اللہ دُنیا میں موجود ہیں، اس کا کیا ثبوت ہے؟

جواب: سب سے پہلے یہ جان لیا جائے کہ اولیاء اللہ کہتے کسے ہیں۔ ہمارا عمومی تصور تو یہ ہے کہ ایسا شخص جو صاحبِ کرامات، صاحبِ کشف اور مستجاب الدعوات ہو وہ ولی اللہ ہے جب کہ درحقیقت ہر وہ شخص ولی اللہ ہے جسے اللہ اپنا دوست چن لیتا ہے اس لیے کہ ولی کا مطلب ہی دوست ہے۔ ویسے تو اللہ کو اپنی ساری مخلوق ہی عزیز ہے لیکن اس مخلوق میں سے وہ لوگ جو اُس کی اطاعت کرتے ہیں اور اُس کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرتے ہیں ان کو وہ بہت پسند کرتا ہے۔ جو لوگ ان حدود کی پابندی سے بھی ذرا زیادہ رضاکارانہ طور پر رب تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرتے ہیں ان کو رب اپنا دوست بنا لیتا ہے، اپنا قرب عطا کر دیتا ہے۔ جیسے ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں۔ یہ نمازیں ادا کر کے ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ بہت پسند ہیں جو نصف شب یا اس سے ذرا زیادہ اللہ کی یاد میں گزار دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے عائد کردہ فرائض سے بڑھ کر اسے یاد کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی دُنیا میں موجودگی ثابت کرنے کے لیے کسی Evidence کی ضرورت نہیں کیوں کہ ایک سادہ اصول ہے کہ ہر معاشرے میں اچھے بُرے لوگ موجود ہوتے ہیں اور ان میں سے بھی ایک Certain تعداد بہت اچھے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اگر ہم قانونِ فطرت کا جائزہ لیں تو ایک ہی مسلم معاشرے میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی۔ ایک مخصوص تعداد مومنین کی ہوگی اور چند فی صد لوگ وہ ہوں گے جو مومن کے درجے سے بھی بڑھ کر ہوں گے اور اللہ کے دوست کہلانے کے حق دار ہوں گے۔

ہمارا واسطہ اکثر بیشتر ایسے لوگوں سے پڑتا ہے جنھوں نے خود کو مخلوقِ خدا کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اللہ کے عطا کردہ وسائل میں سے اپنی ضروریات کے لیے تھوڑا سا رکھ کر باقی سب وہ اللہ کے بندوں پر خرچ کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کے ہاں بہت خاص درجہ رکھتے ہیں۔

ایک پیارا سا سوال جو امریکہ میں مجھ سے پوچھا گیا، مجھے یاد آ گیا "اللہ جب بندوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے میں Interested ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے تو پھر

کیا وجہ ہے کہ اللہ نے شیطان کو تخلیق کیا جو انسان کو بُرائی کی طرف راغب کرتا ہے؟" ایسے سوالات عموماً اُن غیر مسلموں کی طرف سے اُٹھائے جاتے ہیں جو اسلام سے خوف زدہ ہیں اور ایسے سوالوں کے ذریعے وہ نوخیز ذہنوں کو وسوسے اور اندیشے میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بہت سادہ سا ہے۔ شیطان کی تخلیق کی ضرورت یوں پیش آئی کہ انسان کو اس کی وجہ سے نیکی اور بدی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ فرض کریں اگر ہم ہر وقت میٹھی چیز کھاتے رہیں تو ہمیں نمک کے ذائقے کا اندازہ نہیں ہوگا اور اگر ہمیں نمک یا کڑوی چیز کا ذائقہ معلوم نہیں ہوتا تو ہم میٹھی چیز کی قدر بھی نہیں کر سکیں گے۔ نیکی اور بدی کا فرق واضح کرنے کے لیے شیطان کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ انسان کو بہکا سکتا اور بدی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔

شیطان جب فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا تو اس نے اللہ کا حکم نہ مانا اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا لیکن وہ راندۂ درگاہ غلطی کرنے پر نہیں ہوا کیوں کہ غلطیاں تو رب معاف فرما دیا کرتا ہے۔ شیطان راندۂ درگاہ اس لیے ٹھہرا کیوں کہ اس نے نہ صرف غلطی کی بلکہ اس پر تکبر بھی کیا ورنہ غلطی تو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی تھی کہ انھوں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ حکم سے سرتابی دونوں نے کی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اور شیطان نے بھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ شیطان نے غلطی کر کے اللہ کا حکم نہ مان کر تکبر کیا اور یوں مردود شیطان کہلایا جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا کر غلطی کی اور اللہ سے معافی مانگ لی۔ یوں وہ اشرف المخلوقات کہلائے۔

اس واقعہ میں ایک اور باریک رُوحانی نکتہ بھی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نور سے مختلف کرنیں پھوٹتی ہیں۔ یہ کرنیں اللہ کی رحمت کی ہیں۔ غلطی کا اعتراف کرنے اور آیندہ کے لیے توبہ کر لینے سے وہ رحمتیں حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئیں تو وہ معاف کر دیے گئے اور اُن کا نام ہمیشہ کے لیے بلند ہوا۔ اللہ کی صفات جمالی بھی ہیں اور جلالی بھی۔ شیطان کی سرکشی اور تکبر کے نتیجے میں اس پر قہر اور جلال نازل ہوا اور اسے سزا ملی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لعین ٹھہرا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ضرور ہوا کہ اللہ کے جلالی نام مخفی کر دیے گئے۔ یوں انسانی نفس اُس قہر سے محفوظ ہو گیا۔ یہ ایک باریک سا رُوحانی نکتہ ہے جو شاید آپ کو کچھ Confuse کر دے کیوں کہ رُوحانی باتیں شروع میں اسی طرح Confuse کرتی ہیں لیکن جب انسان کو خود علم عطا ہونے لگتا ہے تو یہ نکتے اس پر کھلنے لگتے ہیں۔

سوال: ایک ای میل موصول ہوئی ہے

"Do you believe in existence of Allah? If yes, provide evidence."

(کیا آپ اللہ کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے؟)

جواب: علامہ اقبال کا ایک واقعہ میں نے کہیں پڑھا تھا۔ ان سے بھی کسی نے ایسا ہی سوال کیا تھا کہ آپ تصوف پر مبنی اشعار کہتے ہیں۔ اللہ کی موجودگی اور وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ مجھے Convince کیجیے کہ اللہ واقعی موجود ہے۔ علامہ اقبال نے کہا کہ آپ آج جاؤ اور صبح 9 بجے فلاں ایڈریس پر میرے گھر تشریف لے

دیجیے گا آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔ حسبِ وعدہ اتوار کو صبح 9 بجے وہ صاحب مطلوبہ ایڈریس پر پہنچے۔ گیٹ پر موجود ملازم سے پوچھا ''کیا علامہ اقبال یہیں رہتے ہیں؟'' ملازم نے جواب دیا ''جی ہاں۔'' وہ صاحب بولے ''اُن سے جا کر کہیے کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔'' ملازم بولا ''وہ صاحب جو سامنے لان میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں وہی علامہ اقبال ہیں۔'' وہ شخص لان میں بیٹھے صاحب کے پاس جا کر بولا ''جناب میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' حقہ پیتے ان صاحب نے کہا ''مجھے تو نہیں یاد کہ آپ کو مجھ سے ملنا تھا۔'' وہ شخص بولا ''کیا آپ علامہ اقبال نہیں ہیں۔'' انھوں نے کہا ''نہیں۔'' وہ بولا ''کیا علامہ اقبال یہاں نہیں رہتے؟'' علامہ اقبال نے کہا ''نہیں۔'' وہ بولا ''گیٹ پر موجود ملازم تو یہی کہہ رہا ہے کہ آپ علامہ اقبال ہیں۔'' علامہ اقبال نے کہا ''میں تو نہیں۔'' وہ شخص باہر نکلا مزید دو چار لوگوں سے علامہ اقبال کے بارے میں پوچھا۔ سب نے یہی کہا ''وہ سامنے والے گھر کے لان میں بیٹھے صاحب ہی علامہ اقبال ہیں۔'' وہ شخص پھر آیا اور کہنے لگا ''لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ آپ ہی علامہ اقبال ہیں۔'' علامہ اقبال نے کہا ''صاحب! میں تو نہیں۔'' وہ شخص دوبارہ باہر نکلا۔ چند لوگوں سے مزید Confirm کیا۔ اُن سب نے بھی وہی جواب دیا کہ لان میں بیٹھا شخص ہی اقبال ہے۔ وہ شخص پھر واپس آ گیا اور کہا ''آپ ہی علامہ اقبال ہیں۔'' تب علامہ اقبال نے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا ''تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میں علامہ اقبال ہوں؟'' اُس نے کہا ''اس لیے کہ یہ سارے لوگ ایسا کہہ رہے ہیں۔'' علامہ اقبال بولے ''اس کرۂ ارض کی 75 فی صد آبادی کا یہ کہنا ہے کہ اللہ موجود ہے۔ اُن کے کہنے سے تم یقین نہیں کرتے کہ اللہ موجود ہے اور 10 آدمیوں کے کہنے سے تم نے یقین کر لیا کہ میں ہی علامہ اقبال ہوں۔''

یہ قصہ تو برسبیلِ تذکرہ مجھے یاد آ گیا۔ اللہ کی Existence کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اُس وقت سے یہ ایک خاص Delicate balance پر قائم ہے۔ یہ توازن کبھی خراب نہیں ہوتا۔ اگر ہم سائنس کے اصولوں کو دیکھیں تو ہر چیز کا ایک Life cycle ہوتا ہے۔ ایک معیاد کے بعد ہر چیز ختم ہو جاتی ہے لیکن کیسی حیرت کی بات ہے کہ وجود میں آنے کے بعد سے آج تک اس کائنات کے Balance میں کوئی فرق نہیں آیا جب کہ چیزیں بہت تیزی سے Rotate کر رہی ہیں ..... وہ ہر دم گردش میں ہیں ..... اپنے Axis پر بھی اور Orbit میں بھی۔ نہ تو یہ ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں نہ ہی اپنا راستہ کھوتی ہیں۔ ہر چیز اپنے وقت پر Clockwise دوڑ رہی ہے۔ اگر ہم ایک منٹ کے لیے تسلیم کر لیں کہ ایک Big Bang ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہ کائنات وجود میں آ گئی تو ہمیں اس کا جواب ڈھونڈنا ہو گا۔ مان لیا کہ Big Bang کے نتیجے میں یہ Planets وجود میں آئے لیکن ذرا غور کیجیے کہ ان Planets کو اپنے اپنے Orbit میں کس نے ڈالا؟ وہ کون سی طاقت ہے جو ان سیاروں کو آپس میں ٹکرانے نہیں دیتی؟ ان سیاروں کو اپنے Axis پر گردش میں کس نے ڈالا؟ یہ اپنے Axis میں Spin کرتے اور اپنے Orbit میں گھومتے ہیں اور اس میں کبھی ایک ملی میٹر کا بھی فرق نہیں آتا۔ کیا چیز ان کو یوں قائم رکھے ہوئے ہے؟ اگر ہم ان سیاروں کی کشش کا ذکر کریں تو تمام سیارے ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہیں۔ جب یہ ایک دوسرے کے بہت قریب

ہو جاتے ہیں تو اصولاً ان کی Gravitational Force ان کے سائز کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی چاہیے جس کے نتیجے میں انہیں ایک دوسرے سے قریب یا دور ہو جانا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ یہ اپنے مدار میں قائم رہتے ہیں۔ تو وہ کون سی طاقت ہے جو ان سیاروں کو اپنے اپنے مدار میں قائم رکھے ہوئے ہے؟

انسان تو یہ کام نہیں کر رہا۔ انسان تو ابھی اس پر بھی قادر نہیں ہوا کہ وہ تمام جہانوں ہی کو دریافت کر سکے کہ یہ جہان ہیں کہاں کہاں؟ انسان تو ابھی یہ تک Explore نہیں کر پایا کہ کائنات میں کل کتنے عالم ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ اسی طرح وہ تمام Galaxies کو بھی ابھی تک دریافت نہیں کر سکا۔ انسان سیاروں کو ان کے مدار میں کہاں قائم رکھ سکے گا؟ وہ ذات اور قوت جو اس کائنات کے Delicate Balance کو قائم رکھے ہوئے ہے، ہم اُسے رب کہتے ہیں۔ اگر ہم اس ایک مثال پر ہی غور کر لیں تو ثابت ہو جائے گا کہ رب موجود ہے۔ اب تو سائنس دان بھی یہ ماننے لگے ہیں۔ تقریباً دو ماہ قبل منظر عام پر آنے والی ایک رپورٹ میں سائنس دانوں نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمان جس طاقت کو اللہ کہتے ہیں وہ واقعی موجود ہے کیونکہ کائنات کے اس قدر نازک توازن کو برقرار رکھنا کسی اور کے لیے ممکن ہی نہیں۔

سوال: کیا فوت شدگان اولیاء اللہ کا اپنے مدفن کے ساتھ تعلق رہتا ہے؟ کیا ارواح بھی ایصال ثواب کرنے والے شخص کے لیے دعا کرتی ہیں؟

جواب: تمام لوگ جن کا انتقال ہو جاتا ہے اُن کی ارواح عالم برزخ میں چلی جاتی ہیں۔ عالم برزخ کے دو درجے ہیں ـــ علیین اور سجین۔ نیک ارواح علیین یعنی اعلیٰ درجہ میں جب کہ گناہ گاروں کی ارواح سجین یعنی نچلے درجہ میں چلی جاتی ہیں۔ نیک ارواح کا اپنے مدفن کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے مردوں کو قبرستان جانے کی تلقین فرمائی ہے۔ آپ ﷺ کے فرمان کی پیروی میں جب ہم قبرستان جا کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں، اللہ کا کلام پڑھتے ہیں اور اس کا ثواب اس قبر کی روح کو بخش دیتے ہیں۔ ہمارے اس عمل کے نتیجے میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ تلاوت کلام پاک سے وہاں رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور فرشتے اُترتے ہیں اور دوسرا ہمارا کیا گیا ایصال ثواب وصول کرنے کے بعد وہ روح خوش ہو کر ہمارے حق میں اللہ کے حضور دعا کرتی ہے۔

اگر کوئی ایسا مزار یا قبر ہو جہاں مخلوق خدا کا تانتا بندھا رہے۔ ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں لوگ وہاں تلاوت کلام پاک کریں تو وہاں اللہ کی رحمتوں اور فرشتوں کا نزول یقینی ہوگا۔ جس قدر زیادہ کسی مزار یا قبر پر تلاوت ہوگی اُسی قدر زیادہ صاحب قبر کی روح اپنے مدفن کے ساتھ تعلق اور رابطہ قائم رکھے گی کیونکہ روح بھی تو اللہ کے کلام کی شوقین ہے۔

آپ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق جب ہم قبرستان جائیں تو السلام علیکم یا اہل القبور کہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص اپنے بھائی کی قبر پر گزرتا ہے اور اسے سلام کرتا ہے۔ اگر وہ

اُسے دنیا میں پہچانتا تھا، اب بھی پہچانتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے۔" (جامع الاحادیث 20503، کنز العمال 42557، شرح الصدور)

حضرت عبداللہ بن عمیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احد سے واپسی میں حضرت مصعب بن عمیرؓ اور اُن کے ساتھیوں کی قبور پر ٹھہرے اور فرمایا "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم زندہ ہو۔ (لوگو!) ان کی زیارت کیا کرو اور انہیں سلام کہو۔ قسم اُس کی جس کے ہاتھ میری جان ہے قیامت تک جو ان پر سلام کرے گا جواب دیں گے۔"

(المعجم الاوسط 3700، المعجم الکبیر 850، حلیۃ الاولیاء جلد اصفحہ 108)

جب ہم تلاوت قرآن پاک کر کے اُس کا ثواب اہل مزار یا اہل قبر کی رُوح کو بخش دیتے ہیں تو جس قدر ثواب ہمارے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقہ اُسی قدر ثواب اُس رُوح کے نامۂ اعمال میں بھی لکھ دیتا ہے جس پر وہ رُوح خوش اور شکرگزار ہو کر اللہ کے حضور عرض کرتی ہے "یا باری تعالیٰ! جس شخص نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ میرے نامۂ اعمال میں ثواب کا اندراج کرایا جب کہ میں اپنے نامۂ اعمال میں ثواب کے اضافہ پر قادر نہیں۔ تو اس پر رحم فرما اور رحمتیں نازل فرما۔"

الغرض اولیائے کرام کا اپنے مدفن کے ساتھ تعلق رہتا بھی ہے اور بسا اوقات نہیں بھی ہوتا۔

موہے اپنے رنگ میں رنگ ڈالا

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حروف مقطعات، شب معراج روبرو گفتگو کے بعد عطا فرمائے۔ یہ حروف مقطعات دراصل Transcript (مسودہ) ہیں اس قانون کا جس کے تحت یہ نظام کائنات چل رہا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ حروف مقطعات اصل میں وہ حروف ہیں جو Law Book کا Jist ہیں۔ اگر ہم ان کو Translate کرنا شروع کریں تو وہ قانون ترجمہ ہوتا چلا جائے گا جس کی وجہ سے یہ کائنات چل رہی ہے۔ یہ کائنات ایک بہت نازک توازن پر قائم ہے اور رب تعالیٰ اپنی قدرت کے صدقے اس توازن کو ٹوٹنے نہیں ہونے دیتا۔ جس روز کائنات کا توازن بگڑے گا وہ روز قیامت ہوگا اسی لیے سورج سوا نیزے پر آ جائے گا۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند اڑنے لگیں گے لیکن یہ سب تب ہوگا جب رب تعالیٰ ایسا چاہے گا۔

یہ کائنات یقیناً ایک ٹھوس قانون یا اصول پر چل رہی ہے۔ وہ قانون یا اصول کیا ہے؟ وہ انہی حروف مقطعات میں پنہاں ہے۔ یہ جو ہم سورۂ بقرہ میں پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء سکھایا تھا۔ وہ علم الاسماء بھی انہی حروف مقطعات میں سمایا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں حروف مقطعات کی تعداد 14 ہے (ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ہ، ی) اور 29 سورتیں ان حروف سے شروع ہوتی ہیں۔ حروف مقطعات کی تعداد 14 کو اگر ہم جمع کریں تو یہ چار جمع ایک برابر پانچ (4+1=5) بنتا ہے۔ پانچ کا یہ عدد ظاہر کرتا ہے۔

1۔ مالکِ کل یعنی اللہ تعالیٰ

2۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

3۔ کتابِ کل یعنی قرآن مجید

4۔ علمِ کل یعنی علمِ قرآن

5۔ اس علم کو جاننے والے لوگ

حروف مقطعات میں تین حروف لکھنے والے ہیں۔ ان حروف سے جو الفاظ آگے بن کر آ رہے ہوتے ہیں اگر ہم

انھیں ابجد پر ڈالیں تو یہ حروف ابجد ٹوٹل ایک ارب ستاسی کروڑ اکسٹھ لاکھ بنیں گے۔ وہ سورتیں جو ان 14 حروف پر مشتمل ہیں اگر ان تمام حروف کے آگے الفاظ دیکھیں اور انھیں حروف ابجد میں تبدیل کریں تو یہ ستاسی ارب اکیاسی کروڑ اور اکانوے لاکھ سے کچھ زیادہ حروف ابجد بنیں گے۔

اسی طرح اگر ہم نقطے والے تینوں حروف مقطعات کو جمع کر دیں تو نفی میں چلے جائیں گے اور وہ لا کا مقام ہے۔ یاد رہے کہ اسلام کی ابتدا اسی نفی سے ہوتی ہے۔ ایک انسان جب اسلام قبول کرتا ہے تو اسلام میں داخل ہونے کے لیے جب وہ کلمہ پڑھتا ہے تو اس کلمہ کی ابتدا اسی لا سے ہوتی ہے۔ یوں وہ انسان اپنے ماضی اور تمام گزشتہ عقائد کی نفی کرتا ہے۔

قرآن پاک کے پہلے پارہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ (ان کا خلاصہ بیان کرنے کا میں مجاز نہیں لیکن یہ حروف کس کے لیے Stand کرتے ہیں وہ عرض کیے دیتا ہوں)

الم

ا=اللہ

ل=لا

م= آپ ﷺ کا اسم ذات "محمد ﷺ"

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ 29 سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے جس کا مجموعہ نو جمع دو برابر گیارہ (9+2=11) ہے اور گیارہ کا ٹوٹل علم جفر کے مطابق تو دو بنتا ہے لیکن روحانیت میں یہ ایک جمع ایک ہی رہتا ہے۔ دو نہیں ہوتا۔ اس ایک اور ایک سے مراد ہے:

- ایک بنانے والے یعنی اللہ تعالیٰ
- ایک بنے والا یعنی آپ ﷺ

پہلے پارہ کی سورۃ البقرہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہوا اور اس کی ابتدا الم سے کی گئی۔ اب آپ ان دونوں کو Link کر پائیں گے کہ ایک بنانے والا اور ایک بنے والا۔ ان دونوں کا ذکر پہلے پارہ کی ابتدا میں ہے۔ اب الم کو اگر میں Explain کروں گا تو بھید کھل جائے گا کہ الف اور میم کے درمیان لام کیوں آیا۔ یہ بھید کھولنے کا میں مجاز نہیں اس لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ ﷺ کے حوالے سے ایک اور بات عرض کر دوں۔ ہم روزمرہ زندگی میں مختلف حوالوں سے علم فلکیات کا ذکر کرتے ہیں۔

علم فلکیات کے لغوی معنی تو "آسمانوں کا علم" کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر اسے ہم Astrology سے منسوب کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ علم کائنات ہونا چاہیے۔ اس کائنات کے درمیان ایک غیر مرئی Link بنتا ہے۔ ذرا سوچیے! یہ جو چاند، سورج، ستارے ہیں ان کے اور زمین کے درمیان کیا ہے؟

چاند، سورج، ستارے اور اس کے Beyond جو کچھ ہے وہ فلکیات ہے لیکن اس کے بعد کیا ہے؟ وہ غیر مرئی تعلق (Invisible link) آپ ﷺ کا اسمِ ذات "محمد ﷺ" ہے۔ آپ کبھی عربی رسم الخط میں آپ ﷺ کا اسمِ ذات لکھا ہوا دیکھیے۔ اس میں 'م' کا دائرہ پھر ایک لمبا خط جو 'م' کو 'ح' سے ملاتا ہے۔ پھر 'ح' لمبا ہو کر اگلے 'م' سے مل جاتا ہے اور 'م' کو لمبا کھینچ کے 'د' لکھا جاتا ہے۔

مختصراً عرض کر دوں کہ آپ ﷺ کے اسمِ ذات کا 'م' کا جو گول Head ہے وہ کیا ہے؟" (کیوں کہ یہ نام اسی طرح لکھا ہوا کائنات کے درمیان Link بنتا ہے) اس 'م' کے دائرے کے اندر نور ہے جو جگمگاتا ہے۔ اس کے اندر اندھیرے ہیں جو چھپتے ہیں۔ اس کے اندر ایک تیسری چیز بھی ہے جو میں یہاں بیان نہیں کر پاؤں گا۔

اسی طرح 'میم' کو 'ح' سے ملانے کے لیے لمبا کر کے لکھا جاتا ہے۔ وہ اس نور کے نتیجے میں بڑھتے ہوئے سائے ہیں۔ آپ ﷺ کے اسمِ ذات کے آخری حرف 'د' کا جو آخری سرا ہے اس سے سمتیں نکلتی ہیں شمال، جنوب، مشرق، مغرب۔

آپ ﷺ کا اسمِ ذات اگر ہم لمبا کھینچ کر سیدھا لکھیں تو عرشِ معلی پر کھنچے ہوئے خطِ استوا کی شکل بنتی ہے۔

یہی تعلق ہے فلکیات اور آپ ﷺ کے اسمِ ذات میں۔

سوال: کیا حروفِ مقطعات کو کسی خاص ترتیب سے پڑھنا ضروری ہے؟

جواب: سچ تو یہ ہے کہ کسی زمانہ میں میں خود وظائف اور ورد اذکار کا بہت شوقین تھا اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان وظائف میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ یوں درجنوں وظائف کیا کرتا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب جو کچھ پڑھتا ہوں اس کی تعداد تو بے پناہ بڑھ گئی لیکن تسبیحات و وظائف کی Variety کم ہو کر ایک دو تک محدود ہو گئی۔ شروع میں جب مجھے کسی سے کوئی وظیفہ یا ورد پتا چلتا تو وہ شروع کر لیتا لیکن اس کے باوجود میں کہیں پہنچا نہیں تھا۔ جب مرشد صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے تمام اوراد و وظائف پڑھنے سے منع کر دیا اور ان کی جگہ ایک وظیفہ پڑھنے کو دے دیا۔ الحمدللہ! اس سے کچھ ہی عرصہ میں اللہ نے بہت نعمتیں عطا فرما دیں۔ اب آ کے ایک بات سمجھ آئی کہ اللہ نے قرآن اس لیے نازل کیا تاکہ ہم راہِ راست کو جان سکیں اور اس پر چل کر اللہ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہو جائیں۔ جس چیز کو اللہ نے سب سے زیادہ حقیر جانا اور ہمیں اس سے دور رہنے کی تلقین فرمائی وہ دنیا اور دنیا کی حرص ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس قرآن کو اللہ نے اس لیے اتارا تھا کہ ہمارے دل سے دنیا کی حرص نکل جائے اور ہم سیدھی راہ پر چلنے لگیں، ہم اسی قرآن کی منتخب آیات پڑھ کر دنیا کا حصول آسان بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ہم خود اپنی ذات پر ظلم کر رہے ہیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہے کہ ایک پولیس مین جو ٹریفک کنٹرول کرنے پر مامور ہے، ہم اس سے کہیں کہ ہم ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے ہیں تم ہمیں Escort کر کے دوسری طرف چھوڑ آؤ۔ اسی طرح اللہ کے عطا کردہ علوم کو دنیا کے حصول کے لیے استعمال کر کے ہم خود اپنی ذات پر ظلم کر رہے ہوتے

ہیں۔ حالاں کہ ان علوم کے ذریعے تو ہمیں اپنے دل کو دنیا کی محبت سے پاک کرنا تھا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اگر آپ حروف مقطعات یا دیگر روحانی علوم کو کسی مقصد کے تحت استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجیے لیکن یاد رہے کہ ان علوم کا حق وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

سوال: لوحِ قرآنی میں حروفِ مقطعات نظر نہیں ہے۔

جواب: لوحِ قرآنی کسی صاحب نے خود Devise کی ہے۔ ان کی Calculation میں نظر نہیں آ رہا ہوگا اس لیے انھوں نے اس کو شامل نہیں کیا۔ میں تو عرصہ ہوا ان چیزوں سے بہت دور ہو گیا اس لیے ان میں دلچسپی بھی نہیں رہی۔

سوال: بیعت کرنے کی صورت میں دوسرے شیخ سے اکتسابِ فیض پر پابندی کیوں؟

جواب: اچھے اسکولوں میں آپ نے ایک چیز نوٹ کی ہوگی کہ وہ آپ کو منع کرتے ہیں کہ آپ اپنے بچے کو نہ تو ٹیوشن پر بھیجیں اور نہ خود گھر پر پڑھائیں۔ ان کے لیے کلاس ورک (Class Work) ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ منع کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ٹیچر کا پڑھانے کا اپنا ایک انداز ہوگا جب کہ ٹیوٹر اس انداز کو Follow نہیں کر پائے گا اور بچہ Confuse ہو جائے گا۔

بعینہٖ جب آپ کسی شیخ کے پاس جاتے ہیں، اس سے علم سیکھتے ہیں تو اس شیخ کا اپنا ایک طریقہ، انداز اور اندازہ ہے جس سے وہ آپ کو تعلیم دے رہا ہے۔ چونکہ آپ ایک ایسے علم کی تعلیم لے رہے ہیں جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ شیخ اپنے انداز میں آپ کی تربیت کر کے آپ کو ایک مقام پر پہنچائیں گے لیکن اگر آپ اس دوران دوسرے شیخ کے پاس جانے لگے تو وہ اپنے انداز میں آپ کی تربیت کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ میں Confusion پیدا ہوگا اور آپ دو کشتیوں کے سوار ہو کر کہیں بھی نہ پہنچ پائیں گے۔

یہ معاملہ صرف زندہ شیخ تک ہی محدود نہیں بلکہ اگر آپ کے شیخ وفات پا گئے ہیں اور ان شیخ نے ایک طویل عرصہ تک آپ کی تعلیم و تربیت کی تھی جس کے نتیجہ میں آپ ایک سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اگر آپ کسی دوسرے شیخ کے پاس جاتے ہیں تو وہ سانچا ٹوٹنے لگتا ہے۔

اب یقیناً آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر شیخ کے پردہ کر جانے کے بعد کوئی Clarification یا رہنمائی چاہیے ہو تو وہ کیسے حاصل کی جائے گی؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ روحانی طور پر پوری طرح اپنے شیخ کی طرف متوجہ ہو جائیے۔ اسے تصورِ شیخ کہتے ہیں۔ شیخ کا تصور کر کے اس مسئلہ پر غور و فکر کیجیے، ان شاء اللہ وہ نکتہ حل ہو جائے گا۔ یہ شیخ کے علم کی برکت ہے جو اسے اللہ نے عطا کر رکھی ہے۔

سوال: یہ کیسے پتا چلے گا کہ ہم کتنا روحانی علم حاصل کر چکے اور ہماری تربیت کس قدر ہو چکی ہے؟

جواب: دنیاوی علوم میں مختلف Stages اور Grades ہونے کی وجہ سے ہم اندازہ لگا لیتے ہیں کہ بچہ پرائمری تک پڑھ گیا ہے یا اس نے میٹرک، گریجویشن اور ماسٹرز کر لیا ہے۔ یوں پتا چلتا رہتا ہے کہ وہ علم کے کس درجے تک پہنچ گیا ہے لیکن روحانی علم اور تربیت دونوں میں یہ Measurement ممکن نہیں کیوں کہ اس کی کوئی درجہ

بندی موجود نہیں۔ آپ کار میں سفر کر رہے ہوں تو چیڈو میٹر پر نظر نہ بھی کریں تب بھی گرد و پیش کے مناظر، درخت، پہاڑ اور عمارتیں آپ کو بتا دیں گی کہ آپ کس Speed پر جا رہے ہیں اور کتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ لیکن اگر آپ جہاز سے سفر کر رہے ہوں تو احساس یوں ہوتا ہے کہ جیسے جہاز اپنی جگہ پر ساکن ہے حالاں کہ وہ ساڑھے پانچ سو میل کی رفتار سے اُڑ رہا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جہاز میں سفر کرتے ہوئے آپ کے اردگرد Reference موجود نہیں جس سے آپ کو Speed کا احساس ہو سکے۔ ہاں البتہ اگر تھوڑے فاصلے سے ایک اور جہاز گزرتا ہے تو آپ کو اپنے جہاز کی Speed کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

رُوحانی علم اور تربیت کے معاملے میں ہمارے پاس کوئی Reference موجود نہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ ہماری تربیت کتنی ہو چکی اور کتنا علم مل چکا یا پھر علم ملا بھی یا نہیں؟

سوال: ہم آپ کے پاس آ کر بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ آپ کو اپنا مرشد سمجھتے ہیں اور تربیت کے خواہش مند ہیں۔ کیا بیعت شدہ لوگوں کو کسی دوسرے شیخ کے پاس نہیں جانا چاہیے؟

جواب: ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ کے واقعات میں کرامات پڑھ کر ہم انھیں مافوق الفطرت انسان سمجھنے لگتے ہیں اور تصور کر لیتے ہیں کہ شاید اُن کے پاس غیر مرئی قوتیں ہوتی ہیں۔ یوں رُوحانیت یا سلوک کی راہ پر چلنے کے بعد ہم فرض کر لیتے ہیں کہ رُوحانی علوم کے حصول کے بعد ہمارے سارے کام خود بخود ہو جایا کریں گے۔ کسی کی ہمت نہیں ہوگی کہ ہمیں ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ بھی جائے۔ بیماری تو ہمارے قریب نہیں پھٹکے گی۔ یہ سب Misconceptions ہیں۔ صاحب! اولیاء اللہ تو ایک طرف خود پیغمبروں پر کیا کیا مشکلات اور بیماریاں نہیں آئیں؟

ہم اکثر اس دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ مثلاً دفتر میں میرے باس نے مجھے جھاڑ دیا تو کہنے لگے: "یہ کیسا رُوحانی علم ہے کہ باس مجھ سے ڈرتا ہی نہیں۔" اس میں قصور رُوحانی علم کا نہیں بلکہ خود ہمارے تصورات کا ہے۔

آپ نے مرشد کی بیعت میں کچھ عرصہ گزارا اور غیر محسوس طور پر آپ کی تربیت ہوتی رہی۔ آپ کے والدین بھی اُن شیخ سے بیعت ہیں۔ وہ اپنے شیخ کے راستے پر چلتے رہے اور آپ غیر محسوس طریقے سے اپنے والدین کو نقل کرتے رہے یوں Indirectly آپ نے اپنے شیخ کے طریقے پر ہی عمل کیا۔ اس طرح تربیت تو آپ کی ہوگئی۔ اب آپ اگر دوسرے شیخ پاس جائیں گے تو Confuse ہو جائیں گے۔ کیوں کہ آپ پر اپنے شیخ کی تربیت کا اثر موجود ہے۔

جب ہمارے ذہن میں دو تربیتوں کا Clash ہوگا تو بہت سے سوالات Confuse کرنے لگیں گے۔ اس لیے رُوحانیت کا اصول ہے کہ جب آپ ایک شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تو پھر کسی اور شیخ کے پاس نہ جائیں تاکہ اُلجھن کا شکار نہ ہوں۔

آپ نے بدقسمتی سے میری مثال دے دی تو میں عرض کر دوں کہ میں کہاں کا شیخ۔ جو شخص ابھی گھٹنوں کے بل Crawl کرنا سیکھ رہا ہو اُس سے جوان آدمی کی طرح بھاگنے کی توقع کہاں سے کی جا سکتی ہے۔ میں

ابھی میں کہاں سے پیر بن جاؤں گا جب کہ مجھے ابھی چلنا بھی نہیں آتا۔ میں تو خود اپنی تربیت نہیں کر سکا۔ کسی کی تربیت کیا کروں گا۔ میرے پاس تو بیچنے کو کچھ ہے ہی نہیں تو کسی کو کیا دے پاؤں گا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میں دکان سجائے بیٹھا ہوں۔ سب ڈھونگ رچایا ہے میں نے۔ قرآن و حدیث کی یہ جو باتیں کرتا ہوں وہ بھی اسی ڈھونگ کا حصہ ہیں تاکہ لوگ مجھے نیک سمجھنے لگیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں بالکل خالی ہوں۔ گناہگار انسان ہوں۔ میرے اس Claim کا کہ میں کچھ نہیں ہوں سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو نہیں سنوار سکا۔ جو شخص اپنے آپ کو نہیں سنوار سکا وہ دوسروں کو کیا سنوارے گا۔

سوال: آپ کے پاس آنے کے بعد ہم اپنی ذات میں بہت سی مثبت تبدیلیاں محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہماری زندگی بدل گئی ہے۔ یہ سب آپ کی صحبت کا کمال اور اثر ہے۔

جواب: بہت بڑے دانشور اشفاق احمد اور آپا بانو قدسیہ دونوں خدا ترس اور خوفِ خدا رکھنے والے انسان ہیں۔ جب مجھے کچھ وجوہات کی بنا پر ایک طویل عرصہ کے لیے یو کے رہنا پڑا تو اکثر و بیشتر بانو آپا مجھے خط لکھتیں تاکہ اس کڑے وقت میں میری دل جوئی ہوتی رہے اور میرے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ مشکل وقت میں مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ بانو آپا اپنے ان خطوط میں دل چسپ اور خوش گوار باتیں لکھا کرتی تھیں۔ ایک بار انھوں نے لکھا "خان صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ یہ سب شرارت سرفراز کی ہے وہ تیلی لگا کر خود انگلینڈ بھاگ گیا۔ اسے یہ پتا نہیں کہ جعلی پیر اصلی پیروں سے زیادہ Popular ہو جاتے ہیں اور آج کل میں بہت Popular ہوں۔"

یہ اشفاق صاحب کا ایک انداز تھا دوسروں کو خوش کرنے کا، دوسروں کی دل جوئی کا۔ بظاہر تو انھوں نے یہ بات مجھے جتانے کے لیے کی لیکن عرض کر دوں کہ مجھ جیسے جعلی پیر ایسے Pose کرتے ہیں تاکہ لوگ متاثر ہو جائیں۔ آپ اس دھوکے میں مت آئیے۔ آپ سے سنجیدگی سے یہی گزارش کروں گا کہ کسی اصلی اور صحیح انسان کو بطور شیخ پکڑیے اور اس سے اکتسابِ فیض کیجیے۔ اللہ آپ کو اپنی منزل پر پہنچا دے۔

سوال: کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونے کے باوجود ہم نے اپنی ذات میں تبدیلی محسوس نہ کی لیکن دوسرے شیخ صاحب کے پاس جانے سے بیعت کیے بغیر ہی ہم میں مثبت تبدیلی آ جاتی ہے۔ کیا کوئی طریقہ ہے کہ پہلے شیخ کی بیعت سے آزادی حاصل کر لی جائے؟

جواب: آپ اپنے پہلے شیخ سے درخواست کریں کہ آپ مجھے بیعت سے آزاد کر دیں کیوں کہ کچھ وجوہات کی بنا پر میں کہیں اور بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ شیخ چونکہ بڑے اعلیٰ ظرف کا مالک ہوتا ہے اس لیے وہ کھلے دل سے آپ کو دوسرے شیخ کے پاس جانے کی اجازت دے دے گا۔ یوں آپ دوسرے شیخ سے بیعت کر سکتے ہیں۔

سوال: اگر وہ شیخ جن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، ان کا وصال ہو چکا ہو تو پھر اس بیعت سے کیوں کر آزاد ہو سکتے ہیں؟

جواب: اس صورت میں آپ ان شیخ کے خلیفہ سے عرض کر دیجیے یا روحانی طور پر اپنے شیخ کی طرف متوجہ ہو

کر اپنی درخواست پیش کر دیجیے۔ چونکہ شیخ صاحب متصرف ہوتے ہیں اس لیے اُمید ہے کہ خواب میں آپ کو اپنی درخواست کا جواب مل جائے گا۔

سوال: حضرت علیؑ امامِ طریقت ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ جو رُوحانی سلسلہ ہے یہ ایک طریق ہے۔ اسی سے لفظ طریقت نکلا ہے۔ آسان لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ رُوحانی سلسلوں کی جو راہ ہے، Way of education یا Way of life ہے اس کی امامت حضرت علیؑ کے پاس ہے۔ چونکہ رُوحانی سلسلے، رُوحانی تعلیم و تربیت، رُوحانی طریق زندگی کو طریقت کہا جاتا ہے۔ اس لیے حضرت علیؑ کو امامِ طریقت کہتے ہیں۔

سوال: آپ چاہے انکار کریں لیکن ہم یہاں آ کر بہت زیادہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ہم اپنی عاقبت سنورتی محسوس کرتے ہیں۔ آپ کے پاس آنے کے بعد ہم اللہ کو اپنے قریب محسوس کرتے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں ہم تو خود کو آپ کا مریدی سمجھتے ہیں کیوں کہ آپ کے پاس آنا ہمارے لیے باعثِ برکت ہے اور ہم آپ کے پاس آتے رہنا چاہتے ہیں۔

جواب: آپ کی بات کی ابتدا سن کر تو میں خوش ہو گیا کہ آپ یہ فرمائیں گے کہ ہم تو اپنی عاقبت سنورنے کی اُمید میں یہاں آتے تھے لیکن آپ کا بھید کھل گیا۔ بہر حال عرض کر دوں کہ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ آپ تشریف نہ لائیں۔ آپ ضرور آیئے اور یہ بھی مت سمجھیے کہ میں اپنی دُکان بڑھا رہا ہوں۔ اس لیے چلتے چلتے یہ سب عرض کر رہا ہوں۔ میں دُکان نہیں بڑھاؤں گا کیوں کہ بڑی مشکل سے تو میں چند لوگوں کو سلام کے لیے اپنے گرد اکٹھا کر پایا۔ اگر میری اُلٹی سیدھی باتوں سے آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے علم میں اضافہ ہو رہا ہے تو آپ کی آمد سر آنکھوں پر۔ یاد رکھیے! فقیر کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ خاص طور پر دشمنوں کے لیے۔ جب میں دشمنوں کو منع نہیں کر سکا تو دوستوں کو تشریف لانے سے کیوں کر منع کروں گا۔

حُسنِ دروں

بنیادی چیز سوچنے کی یہ ہے کہ اسلام کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ کہ ہم اپنے ظاہری طور طریقوں اور شکل وصورت سے بہت پارسا اور اعلیٰ درجے کے مسلمان دکھائی دیں یا یہ مطلب تھا کہ ہم اپنے اعمال کی بنیاد پر اچھے مسلمان دکھائی دیں؟ کیا اللہ روزِ محشر اس بات کی بنیاد پر سزا و جزا دے گا کہ ہم ظاہری شکل وصورت میں اعلیٰ درجے کے مسلمان تھے یا پھر وہ ہمارے اعمال کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرے گا؟

کوئی شخص سرسری مسلمان ہے یا دل کی گہرائیوں سے مسلمان ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شخص زندگی میں جو کچھ Deliver کر رہا ہے اور اس کے جو اعمال ہیں کیا وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہیں اور اس کے احکامات کے مطابق ہیں؟

قائداعظم کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔ قیامِ پاکستان سے قبل ایک سرکاری ملازم کچھ خفیہ کاغذات لے کر ان کے پاس آئے کہ ان سے پاکستان کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ قائداعظم نے وہ کاغذ یہ کہہ کر لوٹا دیے کہ یہ کاغذات میرے حوالے کر کے آپ سرکاری بددیانتی کے مرتکب ٹھہریں گے اور میں ایسا نہیں چاہتا۔ قائداعظم کے بارے میں کہیں سے پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے کبھی کسی کا حق مارا ہو، کسی کا قرض ادا نہ کیا ہو، کسی سے جھوٹ بولا ہو یا وعدہ وفا نہ کیا ہو۔ ایک اچھے مسلمان کی یہی علامت ہے کہ جب بولے سچ بولے، وعدہ کرے تو پورا کرے اور کسی کا حق نہ مارے۔ انہی باتوں سے فیصلہ ہو جائے گا کہ قائداعظم کس قسم کے مسلمان تھے۔ وہاں تک جانے کی تو نوبت ہی نہیں آئے گی کہ ان کا لباس کیسا تھا؟ اور وہ قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھا کرتے تھے یا نہیں؟

روزِ محشر بھی ظاہری حالت پر نہیں بلکہ اعمال کی بنیاد پر ہی فیصلہ کیا جائے گا۔ درویشوں اور اہلِ فقر کے ہاں بلند و بانگ دعوے ممنوع ہیں۔ اللہ کا حکم ہے کہ بدی کا جواب بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے دو۔ یہ آپ ﷺ کی سنت بھی ہے۔ ایک بچے نے بھوک سے مجبور ہو کر نان بائی کی دکان سے روٹی اٹھائی اور دوڑ لگا دی۔ نان بائی پیچھے بھاگا۔ اسے پکڑ لیا اور خوب مار پیٹ کے بعد چھوڑ دیا۔ اس مار پیٹ کا نقصان یہ ہوا کہ بچہ جائے

سو عمر نے کے آمادۂ بغاوت ہوا اور اس نے چوری کا پیشہ اپنا لیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ وہ اپنے اس پیشے میں اس قدر ماہر ہو گیا کہ جرائم پیشہ افراد میں اس کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ وہ کمال فن کاری سے چوریاں کرتا اور ڈاکے ڈالتا لیکن جب لوگ اس سے انتہائی عاجز آ گئے تو پولیس حرکت میں آئی۔ اسے گرفتار کیا اور حد نافذ کر کے نہ صرف ہاتھ کاٹا بلکہ جیل میں بھی بند کر دیا۔ سزا ختم ہونے کے بعد جب وہ جیل سے نکلا تو جرائم پیشہ زندگی سے توبہ کرنے کے بجائے بغاوت میں شدید تر ہو گیا۔ رات کا وقت تھا وہ بازار میں چلا جا رہا تھا کہ ایک حویلی میں اسے روشنی دکھائی دی۔ معلوم پڑتا تھا کہ یہاں کوئی امیر شخص رہائش پذیر ہے۔ کھلے دروازے نے اسے با آسانی حویلی میں داخل ہونے میں مدد دی۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوا تو وہاں اسے ایک چٹائی بچھی اور کپڑے کے بہت سے تھان پڑے دکھائی دیے۔ سوچا یہاں چرانے کے لیے کچھ اور تو ہے نہیں کیوں نہ کپڑے کے یہ تھان گٹھڑی میں باندھ کر ساتھ لے جاؤں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہاتھ کے ساتھ گٹھڑی باندھنے میں اسے دقت پیش آ رہی تھی۔ اسی اثنا میں ایک دبلے پتلے صاحب جن کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی، کمرے میں داخل ہوئے اور پوچھا "تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟" اچانک ان کی نظر گٹھڑیوں پر پڑی تو سارا معاملہ بھانپ گئے اور بولے "لاؤ یہ تھان میں تمہیں باندھ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ایک بڑی اور ایک چھوٹی گٹھڑی بنائی۔ بڑی اپنے سر پر رکھی، چھوٹی چور کے سر پر رکھی اور بولے "بتاؤ! کہاں چلنا ہے؟" چور نے سمجھا یہ بھی میری ہی مانند کوئی چور ہیں اور اب میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہتے ہیں۔ وہ بولا "شہر سے باہر کھنڈر تک چلو۔" اب راستے میں وہ چور تو اس خوف سے کہ کہیں اس سامان کا مالک نہ آ پکڑے، تیزی سے چلتا جا رہا تھا۔ دوسرے اس کے سر پر وزن بھی کم تھا جب کہ وہ دبلے پتلے صاحب بھاری گٹھڑی کے باعث سست رفتار تھے جس پر چور انھیں بار بار ڈانٹ ڈپٹ کرتا۔ آخرکار وہ کھنڈر پہنچ گئے۔ وہ صاحب چور کو مخاطب کر کے کہنے لگے "میرے بھائی! میں بہت شرمندہ ہوں کہ تمھاری ویسی خدمت نہیں کر سکا جو تمھارا حق تھا۔ راستہ بھر بھی میری وجہ سے تمھیں کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔" چور بے زاری سے بولا "زیادہ باتیں نہ بناؤ اور اپنا جو حصہ لینا ہے لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہ صاحب بولے "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں تو اس حویلی کا مالک ہوں جہاں سے آپ یہ سامان لے کر آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چور کو عالم حیرت میں چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد فجر کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔ چور نے بھیس بدلا اور دوبارہ حویلی کی طرف محو سفر ہوا۔ وہاں پہنچ کر لوگوں سے پوچھا "سامنے حویلی میں کون صاحب رہتے ہیں۔" انھوں نے کہا "تم نہیں جانتے اس حویلی میں تو بہت مشہور درویش شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ رہائش پذیر ہیں۔ اگر آپ ملاقات کے خواہش مند ہیں تو اندر تشریف لے جائیے۔" چور وہاں گیا تو دیکھا کہ وہ درس دے رہے ہیں۔ جب وہ درس سے فارغ ہوئے تو چور نے اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دیا اور سچے دل سے معافی مانگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس انداز میں رجوع کیا کہ آج تاریخ انھیں معروف ولی اللہ شیخ احمد بن ثابت کے نام سے جانتی ہے۔ آپ کا شمار حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے

انتہائی قریبی شاگردوں اور ان سے سب سے زیادہ اکتساب علم کرنے والی شخصیات میں ہوتا ہے۔

عفو و درگزر بہت اہم صفات ہیں۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ اللہ کے احکامات کے عین مطابق ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ میں عفو و درگزر کی صفات بے حد نمایاں ہیں۔ آپ ﷺ نے اسلام کا جو پیغام پھیلایا اس میں ان صفات نے بہت کردار ادا کیا۔ آپ ﷺ دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی مہربانی اور عفو و درگزر کا مظاہرہ فرماتے۔ شیخ احمد بن ثابت کا واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ہم بدی کا بدلہ نیکی سے دیں اور عفو و درگزر کو اپنائیں تو نہ صرف ہماری زندگی بلکہ معاشرہ بھی بہت بہتر ہو جائے گا۔

جیسا کہ گزشتہ نشستوں میں ذکر ہو چکا کہ جہاں نور ہوتا ہے وہاں سیاہی ہوتی ہے۔ جس طرح خانہ کعبہ کا غلاف سیاہ ہے، حجر اسود سیاہ ہے۔ خانہ کعبہ کے سیاہ غلاف اور حجر اسود کی سیاہی کی وجہ اب آپ کو سمجھ آ جائے گی کہ وہاں نور کیوں برستا ہے۔ جنت سے آنے والی چیز جو زمین پر آج بھی موجود ہے وہ حجر اسود ہے۔ حجر اسود کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ملائکہ میں سے ایک فرشتے کو پتھر کی صورت میں قیامت تک کے لیے تبدیل کر دیا گیا ہے اور یہ زمین پر خانہ کعبہ میں نصب شدہ ایک لوح ہے جس پر گواہی لکھی جا رہی ہے کہ کس کس نے یہاں حاضری دی۔ کس نیت اور کس انداز سے حاضری دی۔

اصل لوح محفوظ تو عرش پر ہے۔ یہ لوح محفوظ اصلی موتی کی رنگت کی ہے۔ یہ تختی کی شکل میں ہے۔ اس پر سب سے پہلے لکھا جانے والا جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے اور اس کے نیچے کلمہ طیبہ لکھا ہے۔ لوح محفوظ کے کنارے قیمتی پتھروں سے منقش ہیں اسی لیے قرآن پاک کا حاشیہ لگایا جاتا ہے۔ یہ حاشیہ لوح محفوظ کے حاشیہ کو Represent کرتا ہے۔

سوال: کیا عرش حدود ہے؟

جواب: عرش حدود ہے۔ عرش پر مقام نور العاء ہے جو انسانی آنکھ سے مشابہ ہے۔ اس کے بالکل پاس مقام محمود ہے جس پر آپ ﷺ شب معراج تشریف فرما ہے اور یہیں پر اللہ سے ہم کلام ہوئے۔ وہیں پر کرسی قائم ہے اور اس کرسی کے نیچے نور المعروالیہ ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ جہاں نور ہوتا ہے وہاں سیاہی اور اندھیرا ہوتا ہے۔ کرسی کے نیچے جہاں نور المعروالیہ ہے وہاں اندھیرا ہے۔ عرش معلیٰ کی جو دوسری شے ہے وہ چار پایوں پر قائم ہے۔ ان چاروں پایوں کو چار فرشتے تھامے ہوئے ہیں:

1۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام 2۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام

3۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام 4۔ حضرت میکائیل علیہ السلام

اللہ نے انھیں یہ قوت اور قدرت بخشی ہے کہ یہ بیک وقت کئی امور سر انجام دے سکتے ہیں۔

ان چار کے علاوہ مزید چار فرشتے ہیں:

1۔ حضرت رومائیل علیہ السلام 2۔ حضرت عزازیل علیہ السلام

3۔ حضرت میکن طائیل علیہ السلام 4۔ حضرت سرکن طائیل علیہ السلام

روزِ محشر جب لوحِ محفوظ واضح ہوگی تو یہ آٹھوں ملائکہ اس کو سنبھالیں گے۔ ان آٹھوں فرشتوں کے چار چار پَر ہیں جو ضرورت کے مطابق کم و بیش ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی شکلیں انسان سے مشابہ ہیں۔ عرش کی 172 محرابیں ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے نام "آدم" کے پیچھے ایک مقصد تھا۔ ان کے نام کے تینوں حروف کے جامع معنی ہیں۔

"ا" ...... ازل و ابد کو ظاہر کرتا ہے۔

"د" ...... دین اور دنیا

"م" ...... آپ ﷺ کے اسمِ ذات کو ظاہر کرتا ہے۔

یوں ان تینوں حروف کو اکٹھا کر کے حضرت آدم علیہ السلام کا نام رکھا گیا۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ میرے نام کے ساتھ ایک اور نام لکھ دیا جائے تو کائنات لرز اٹھی کہ اللہ کے نام کے ساتھ ایک اور نام کیسے تحریر ہوگا۔

اللہ نے پھر حکم دیا "میرے نام کے ساتھ ایک اور نام لکھ دیا جائے۔ ابھی تک کیوں نہیں لکھا گیا۔"

تب قلم نے عرض کیا "یا باری تعالیٰ! آپ کے نام کے ساتھ کوئی اور نام کیسے تخلیق کر دیا جائے۔" تب رب تعالیٰ نے فرمایا "یہ میری احسن ترین تخلیق ہے۔ یہ نام میرے حبیب ﷺ کا ہے۔" یوں اللہ کے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام تحریر ہوا۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ عشق خدا ہے، اس کی بھی ایک روحانی وجہ ہے۔ اللہ نے اپنے نور سے Further نور کے دو حصے کیے۔ ان میں سے نور کے ایک حصے کا نام نور الھدیٰ المتقین تھا جس سے تمام پیغمبروں کی ارواح تخلیق ہوئیں۔ نور کا دوسرا حصہ نور الھدیٰ المومنین تھا۔ نور الھدیٰ المتقین سے تمام پیغمبروں کی ارواح تخلیق ہوئیں جب کہ نور الھدیٰ المومنین سے باقی تمام انسانوں کی ارواح تخلیق ہوئیں لیکن اس سے بھی پہلے ایک عمل جاری ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ نور المرواحدہ وجود میں آیا۔ یہ نور الفناء کے عین درمیان سے برآمد ہوا۔ جب نور الفناء کے قلب سے نور المرواحدہ جاری ہوا تو نور الفناء پسینے سے شرابور ہو گیا جس کے نتیجے میں شرم و حیا وجود میں آئی اور اسی شرم و حیا سے محبت و عشق نے جنم لیا اور یہی محبت و عشق وجہ تخلیقِ کائنات بنا اور نور المرواحدہ سے آپ ﷺ کی روح تخلیق ہوئی۔ یہ تخلیق کا ابتدائی عمل ہے جو نور الھدیٰ اور نور المرواحدہ کے گرد گھومتا ہے۔

یہاں یہ ضرور گزارش کرنا چاہوں گا کہ آج جس کارخانۂ قدرت کی بات ہوئی یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں بھی شاید اس کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کر پاؤں۔ مکمل علم کوئی نہیں دے پائے گا۔ میں تو بہت عاجز اور اللہ کا حقیر بندہ ہوں لیکن علماء بھی شاید اس کو Explain نہ کر سکیں کیوں کہ یہ معاملہ کسی کی عقل میں آتا نہیں۔ اس

لیے اس میں بہت سے سوالات کے جوابات نہیں ملتے۔ یہ مت سمجھیے کہ جو کچھ میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں یہ کل علم ہے یا یہ Total picture ہے۔ یہ تو اس کارخانہ قدرت کی ایک نہایت ہلکی سی جھلک ہے اور یہ بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں کیوں کہ میں بھی ناقص، میری عقل اور میرا علم بھی ناقص ہے۔

سوال: ممتاز مفتی نے آپ کے حوالے سے کچھ پیش گوئیوں کا ذکر کیا جن میں شمالی علاقہ جات کے حوالے سے بھی ایک پیش گوئی تھی۔ پاک بھارت جنگ کے حوالے سے بھی آپ نے کچھ اشارہ دیا تھا۔ کیا حالات اسی طرف جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

جواب: قصہ یہ ہے کہ کسی صاحب نے مجھ سے جنگ کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے پُرزور انداز میں کہا تھا کہ ان شاء اللہ یہ جنگ ضرور ہوگی۔ انھوں نے کہا ''آپ جنگ کے لیے ان شاء اللہ کہہ رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''میں بقائمی ہوش و حواس ان شاء اللہ کا لفظ استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ ایک مسلمان کی سب سے بڑی خواہش شہادت ہے۔ اگر جنگ ہونے کی صورت میں شہادت مل جائے تو یہ دکھ کی بات ہے یا خوشی کی؟ اگر جنگ ہوتی ہے اور ہمیں شہادت کا رتبہ عطا ہوتا ہے تو اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہوگی؟''

یہ جنگ ضرور ہوگی۔ اس جنگ کا ہونا طے ٹھہرا ہے لیکن یہ کب ہوگی، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ وقت کا تعین علم غیب سے ہے اور عالم الغیب صرف اللہ ہے۔ وقت کا تعین کرنا گویا دعویٰ کرنے کے مترادف ہے اور دعویٰ صرف اللہ کو سزاوار ہے۔ اگر کوئی ولی اللہ دعویٰ کرے تو اللہ اس کے دعویٰ کو جھوٹا ثابت کر دیتا ہے اس لیے اولیاء اللہ دعویٰ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

جہاں تک ہمارے رویوں کا تعلق ہے کہ موجودہ حالات میں یہ کیا ہونے چاہییں، تو دشمن دو طرح سے وار کرتا ہے۔ Bombing دو طرح کی ہوتی ہے:

1- Technical Bombing

2- Strategical Bombing

Technical Bombing میں مختلف تنصیبات، عمارتوں اور ہوائی اڈوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن Strategical Bombing یہ ہے کہ وہ مقامات جہاں سے اسلحہ اور جنگ کو جاری رکھنے کے لیے ساز و سامان مہیا ہو رہا ہے، اُن پر حملہ کیا جائے۔ اس کا مقصد دشمن کی کمر توڑنا ہوتا ہے۔ جب ملک جنگی حالات سے دوچار ہو تو جنگ کو جاری و ساری رکھنے اور ملک کو فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے نہ صرف کامیابی سے لڑا جائے بلکہ ہم اپنے ملک کو Strategic effort کے ذریعے سپورٹ کریں۔ ہم اس War effort کو Facilitate کریں تاکہ ہم دشمن کے خلاف پوری تیاری کے ساتھ ڈٹے رہیں۔ اسلحہ، ہتھیار، غذا، Transportation اور Communication کے تمام ذرائع اور سہولتیں ہمیں میسر ہوں۔ یہ تمام War efforts ہیں۔

جب ملک میں جنگ کے حالات ہوں تو ہم اپنے اپنے مقام پر اپنی Duty ایمانداری اور بھرپور طریقے سے سرانجام دیتے رہیں تو گویا ہم بالواسطہ (Indirectly) جہاد میں شریک تصور ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ ہم میں سے ہر آدمی بندوق اٹھائے اور محاذ پر جائے کیونکہ ایک Untrained انسان محاذ پر جا کر مسائل ہی پیدا کرے گا۔ محاذ پر لڑنا فوجیوں، پیشہ ور سپاہیوں اور تربیت یافتہ افراد کا کام ہے۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر اگر دیانت داری سے اپنے فرائض سرانجام دیتے رہیں تو یہ War effort میں ہمارا Contribution (حصہ) ہو جائے گا۔

سوال: ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے مختلف لوگوں کو مختلف وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ہم Gym جاتے ہیں اور وہاں جا کر کہتے ہیں کہ ہم اپنی Body کو Trim کرنا اور Muscular shape دینا چاہتے ہیں۔ انسٹرکٹر آپ کو گائیڈ کرتا ہے کہ کس کس مشین پر کتنی کتنی دیر آپ کو Exercise کرنی ہے۔ اب Gym ایک ہی ہے، مشین بھی وہی ہے اور وہاں جانے والے بھی انسان ہی ہیں لیکن ہر انسان کا چارٹ دوسرے کی نسبت قدرے مختلف ہوگا۔

وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسٹرکٹر اپنے کام میں ماہر ہے۔ وہ آپ کو نظروں میں تولتا ہے کہ آپ کی Body کس Shape میں ہے اور اسے Proper shape دینے کے لیے کس Exercise کی ضرورت ہے۔

اسی طرح جب آپ قرب الٰہی کے حصول کے لیے کسی صوفی یا فقیر کے پاس جاتے ہیں تو وہ ایک نظر میں بھانپ لیتا ہے کہ اس کے پاس آنے والے شخص کی ذات کا کون سا Area کمزور ہے۔ اگر آپ انا پرست ہیں تو وہ آپ سے کہے گا کہ میرے پاس فلاں وقت روز آ جایا کرو۔ یہ وہ وقت ہوگا جب اس کے پاس بہت ہجوم ہوتا ہے۔ وہ آپ کو انتظار کے بعد بلائے گا اور سب لوگوں کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دے گا۔ اب بظاہر ڈانٹ ڈپٹ اور قرب الٰہی کا کیا تعلق؟ لیکن درحقیقت وہ آپ کی Ego کچل رہا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر انسان کو وہ ایک مختلف نسخہ دیتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ جو قرب الٰہی اور Spiritual gain کی بات ہے اس کے لیے بہت سوچ سمجھ کر کسی درویش یا فقیر کا انتخاب کیجیے گا ورنہ سارا معاملہ خراب ہو جائے گا۔

نورِ یزداں

اللہ کے نور سے نکلنے والا نور کرنوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ اللہ کا جو نور ہے وہ نور العقاء کہلاتا ہے۔ اس میں سے رب تعالیٰ نے نور کا ایک حصہ لیا اور کائنات کی تخلیق کا سوچا تو یہ نور المعروارید تھا۔ نور المعروارید کے بطن سے نور الھدیٰ نکلا۔

نور الھدیٰ سے جو کرنیں نکلتی ہیں وہ کرنیں یا نور کی بارش قطروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ وہ قطرے "روح" کہلاتے ہیں۔ ان کا رنگ ہلکا گلابی ہوتا ہے۔ اس میں سرخ اور سفید دونوں رنگوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ سفید رنگ نور کا حصہ ہے۔ یہ Overwhelming (غالب) ہے جب کہ سرخ قدرے کم ہے۔ یوں اس Combination کی وجہ سے قطروں کا رنگ ہلکا گلابی ہے۔ Pink Rose سے کچھ ہلکا گلابی رنگ ان قطروں کا ہوتا ہے۔

جہاں پر اس نور کے قطروں کی بارش ہوتی ہے اور یہ جمع ہوتے ہیں اُسے عالمِ روحہ کہا جاتا ہے۔ ان قطروں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ان کو جمع شدہ حالت میں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے Bunch of red droplets ہو۔

جب روح کی تخلیق کا ذکر ہوا تھا تو میں نے عرض کیا تھا کہ نور کے دو حصے تھے نور الھدیٰ المتقین اور نور الھدیٰ المومنین۔ یہ جو نور الھدیٰ کے قطرے نکلتے ہیں ان سے انسانی ارواح کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ قطرے عالمِ روحہ میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذمین پر بھی انسان کو Social Animal کہا جاتا ہے۔ وہ عموماً مل جل کر گروہوں اور خاندانوں کی شکل میں رہنا پسند کرتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر ہے۔

ایک حصہ تو وہ ہے جہاں ان قطروں سے انسانی ارواح کی تخلیق ہوئی اور وہ روحیں وہاں موجود ہیں۔ دوسرا حصہ وہ ہے جہاں وہ ارواح رہتی ہیں جو اس دنیا میں آ کر اپنا وقت پورا کرنے کے بعد واپس لوٹ جاتی ہیں۔ جب انسان انتقال کر جاتا ہے تو اس کی روح اس مقام کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ یہ

مقام علیٰ رفعت کہلاتا ہے۔

ایک سوال جو اکثر کیا جاتا ہے کہ جب آپ ﷺ مقام محمود پر فائز کر دیے گئے تو پھر ہم یہ دعا کیوں کرتے ہیں "اے اللہ! آپ ﷺ کو مقام محمود عطا فرما۔" اسی طرح ایک اور سوال یہ ہے۔

"آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی احسن ترین تخلیق ہیں اور اللہ کو بے حد محبوب ہیں تو پھر کیا ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو انسانی شکل میں ہی پیدا فرماتا اور ان تمام آزمائشوں سے گزارتا؟"

آپ ﷺ کو انسانی شکل میں پیدا کرنے کا ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ اللہ جو ہمارا خالق ہے اور ہماری تمام حجتوں اور حیلے بہانوں سے واقف ہے۔ ہماری اس حجت کو ختم کرنے کے لیے اللہ نے آپ ﷺ کو ایک انسان کی شکل میں پیدا فرمایا اور آپ ﷺ سے ایک پر آزمائش اور مشکل زندگی بسر کروائی تاکہ ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ بطور انسان ہمارے لیے آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ناممکن ہے۔

یہ جو ہم معراج کی بات کرتے ہیں یہ در حقیقت ایک جشن تھا جو اللہ نے منایا۔ جب تمام تخلیق مکمل ہوئی، System مکمل ہو گیا تو آپ ﷺ کو دعوت دی گئی کہ تشریف لائیں۔ براق کے ذریعے آپ ﷺ کو بلایا گیا پھر عرش پر آپ ﷺ کو مقام محمود پر اٹھایا گیا۔ آپ ﷺ کی تاج پوشی کی گئی اور آپ ﷺ کو اللہ کے نائب کا درجہ عطا فرمایا گیا۔ پھر 29 چیزیں آپ ﷺ کو عطا کی گئیں۔ اسی موقع پر آپ ﷺ کو علم الاسماء عطا ہوا جو آپ ﷺ کے اسمائے مبارکہ کا حصہ ہے۔ پھر آپ ﷺ کو 70 مقامات کی سیر کرائی گئی اور ہر مقام پر اللہ نے آپ ﷺ کو ایک نئے لقب سے مخاطب کیا۔ یہ 70 القابات آپ ﷺ کے اسمائے مبارکہ کا حصہ بنے۔ ان 70 القابات اور عطا ہونے والی 29 چیزوں سے متعلق ناموں کو اکٹھا کر دیا جائے تو آپ ﷺ کے کل ننانوے اسمائے مبارکہ بنتے ہیں۔

مقام محمود سے ذرا نیچے اتریے، وہاں مقام ابراہیم علیہ السلام ہے جس کے نگران دو فرشتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام اور حضرت اسرافیل علیہ السلام۔ ان دونوں کے ماتحت سات لاکھ فرشتے ہیں جو اپنے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام حاکم ہیں۔ یہیں پر بیت المعمور بھی ہے جو پہلے آسمان ہی سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی مقام پر اللہ کے جاری کردہ احکامات کی Implementation کی تیاری ہوتی ہے۔ یہاں ایک عجیب مماثلت کا ذکر کرتا چلوں۔ بیت المعمور سے عین نیچے زمین پر خانہ کعبہ ہے اور اس کے بالکل پاس مقام ابراہیم علیہ السلام ہے۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نشان ہے۔ بیت المعمور سے نیچے اتریں گے تو یہ چھٹا آسمان ہے۔ وہاں حاکم حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ نگران فرشتے کا نام روپائیل علیہ السلام ہے۔ جن کے ماتحت چھ لاکھ فرشتے ہیں۔

وہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک آواز سنائی دی تھی "کیا ستارہ تمہارا خدا نہیں ہے؟" وہ آواز نور الھدیٰ کی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب نمرود نے آگ میں ڈالا تو اس آگ کو ٹھنڈا کرنے والا نور بھی نور الھدیٰ ہی تھا ورنہ فرشتے میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس آگ کو ٹھنڈا کر پاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو

جو آپ کو حق دکھائی دی، وہ وہ نور المروارید کی تھی اور جو تجلی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر دکھائی گئی وہ خود رب کا نور اللقاء تھا۔ اسی لیے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور آج بھی وہاں سیاہی ہے کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ جہاں نور ہو گا وہاں اندھیرا اور سیاہی ہو گی۔ کوہِ طور پر بھی اب بھی سیاہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا پھینکنے کا جو حکم ہوا تھا وہ بھی نور الھدیٰ تھا اور جب وہ عصا بن گیا تو وہ نور المروارید تھا۔ یہ نور آپ کو ہر جگہ کارفرما نظر آئے گا۔ کوئی ولی اللہ ولایت کے قابل نہیں ہوتا جب تک اُسے نور الھدیٰ کا ادراک نہ ہو جائے۔

ایک راز کی بات عرض کر دوں۔ اللہ کے نور کے دو رنگ ہیں۔ آپ نور الھدیٰ کو دیکھیں گے تو وہ ٹیوب لائٹ کی روشنی کی طرح دودھیا نظر آئے گا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمک نہیں ہوتی لیکن نور الھدیٰ چمک دار ہوتا ہے۔ نور اللقاء بہت ہلکا نیلا ہے۔ آسمانی نیلے سے بھی ہلکا۔

آپ ﷺ کی روح کے بھی دو رنگ ہیں، سبز اور سفید۔ نور الھدیٰ کی اکثر زیارت ہو جایا کرتی ہے۔ جیسے کچھ لوگ کہتے ہیں ہم نے دیکھا کہ اللہ کا نور پھیلا تھا وہ دودھیا چمک دار..... وہ اصل میں نور الھدیٰ ہوتا ہے۔ لیکن نور اللقاء کی زیارت بہت کم کسی کو ہوتی ہے۔ چیدہ چیدہ اولیاء اللہ ہی اس کی زیارت کر پاتے ہیں۔

وہ جو اللہ فرماتا ہے کہ تم دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے اور میرے سامنے پیش کیے جاؤ گے تو وہ عالمِ ارواح سے ہی سب ارواح اٹھیں گی اور اپنے جسم کو پہچان کر اس میں داخل ہو جائیں گی۔

جب میں کہتا ہوں کہ آپ ﷺ کی سنت پر ہم عمل کر لیں تو وہ اس لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ بھائی صاحب ہمارا تو قبلہ اور ٹھکانا ہی وہی ہے اس لیے میں تو اسی ٹھکانے پر جاتا ہوں۔ ایک ہی تو دہلیز ہے میری..... رب کے یہاں تو جاتے ہوئے بہت شرم آتی ہے کہ ساری زندگی نافرمانیوں اور گناہوں میں گزار دی تو کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ لیکن مدینہ منورہ چونکہ رحمت ہی رحمت ہے۔ آپ ﷺ سینہ سے لگا لیتے ہیں کہ یہ کتنا ہی گناہ گار سہی، ہے تو میرا ہی اُمتی..... تو بس یہ حوصلہ ہی اس دہلیز پر لے جاتا ہے۔

روحانیت کی بنیادیں

کوئی عمارت خواہ اس پر کتنی ہی محنت اور Investment (سرمایہ کاری) کیوں نہ کر لی جائے، وہ بہترین عمارت نہیں کہلا سکتی جب تک اس کی بنیادیں ہم ٹھیک طرح سے نہ رکھیں۔ کسی بھی عمارت کو اگر ہم مضبوط اور خوب صورت بنانا چاہتے ہیں تو اس کی بنیادوں پر سب سے زیادہ محنت کرنا ہوگی۔ آپ کو تجربہ ہوا ہو گا کہ ہمارا Maximum وقت اور پیسہ عمارت کی بنیادوں کی تعمیر پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر بنیادوں میں کوئی خامی یا کمی رہ جائے تو اس کا خمیازہ ساری عمر بھگتنا پڑتا ہے اس لیے عقل مند لوگ بنیادوں پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر انسان اپنے اندر علم کی عمارت تعمیر کرنے کا خواہش مند ہو تو وہ پہلے بنیادوں کی ضرورت و اہمیت کو سمجھے گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم بنیادی چیزوں کو نظر انداز کر دیں اور ایڈوانس چیزوں پر عمل کر لیں۔ کل دعا کے دوران یہ خیال آیا کہ اگر ہماری بنیادیں ٹھیک ہوں تو ہمیں بہت سی دعاؤں کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ بے نیاز ہے۔ وہ کسی کی تعریف اور حمد و ثنا کا محتاج نہیں۔ اس نے ہمیں جو کچھ بھی کرنے کو کہا وہ صرف اور صرف ہماری بھلائی کے لیے کہا۔ اللہ نے ہمیں عبادات کا حکم دیا۔ اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ عبادات سے ہم میں پارسائی آتی ہے۔ آخر یہ عبادات ہمیں نیکی کی طرف لے جاتی ہیں اور نیکی سے رب ملتا ہے۔

نیکی کی مختصر تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی خواہشات، آرام اور ضروریات پر دوسروں کی خواہشات، آرام اور ضروریات کو ترجیح دیں۔ اب اس جذبے کو اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی پر پھیلاتے جائیں تو واضح ہو جائے گا کہ نیکی اسی میں پوشیدہ ہے۔

ہم اکثر دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ یاد رکھیے! فقیر کی زندگی کا بنیادی Motto یہ ہوتا ہے کہ میرا کسی پر کوئی حق نہیں لیکن دوسروں کے حقوق کی ادائیگی مجھ پر لازم ہے۔ وہ کسی سے کسی بھلائی اور اچھائی کی توقع نہیں رکھتا لیکن وہ اس بارے میں بہت محتاط ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے کسی بدترین دشمن کے لیے بھی کبھی ایسا کام نہ ہو جائے جو اللہ کے ہاں ناپسندیدہ ہے۔ وہ سب کے حقوق ادا کرتا ہے کسی سے توقع نہیں رکھتا کہ وہ بھی اس کے حقوق ادا کریں۔ چونکہ وہ کسی سے توقع نہیں رکھتا اس لیے اس کی زندگی آسان ہو جاتی

ہے۔ وہ ہر شخص سے خوش رہتا ہے اور اسے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنے دل کی تسلی کے لیے حضرت عمرؓ اور مولانا روم کا ایک قول کبھی فراموش نہیں کرتا کہ جس سے نیکی کرو اس کے شر سے بچو۔ لہٰذا وہ سوچتا ہے کہ اگر میں کسی سے اچھائی یا بھلائی کرتا ہوں تو بدلے میں مجھے تکلیف ہی ملے گی۔ جس کو میں جھک کر سلام کرتا ہوں وہ مجھے جوتے ہی مارے گا۔ چونکہ وہ ذہنی طور پر اس صورت حال کے لیے تیار رہتا ہے اس لیے اسے کسی سے کوئی گلہ اور شکایت نہیں ہوتی اور جب اسے کسی سے شکوہ نہیں ہوگا تو وہ کسی کو برا بھی نہیں کہے گا۔

اگر ہم روحانیت کی طرف جانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی بنیادوں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہو۔ اس کے لیے ہم اپنے ذہن سے نکال دیں کہ دوسروں پر ہمارا کوئی حق بھی ہے۔ ہم عموماً اپنی اولاد سے Hurt ہوتے ہیں۔ وجہ بھی ہوتی ہے کہ ہم نے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی ہوتی ہیں۔ ہم جب بھی کسی سے Hurt ہوتے ہیں تو اس کا سبب یہ توقعات ہی ہوتی ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھیے کہ روحانیت میں گلہ شکوہ اور شکایت زہر ہیں۔ فقیر کو کبھی کسی سے گلہ ہوتا ہے نہ شکوہ شکایات۔

ہم میں سے اکثر صاحبان لائف پارٹنر سے بہت بددل رہتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی توقعات کی زیادتی کارفرما ہوتی ہے۔ لائف پارٹنر (Life partner) کے سلسلے میں ہمیں یہ بات تو یاد رہتی ہے کہ شوہر کو بیوی پر فوقیت حاصل ہے لیکن جو بات اکثر ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ کا اپنی ازواج کے ساتھ کیسا سلوک تھا؟

کوئی بھی پیغمبر، نبی یا رسول خواہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں یا امام الانبیاء ﷺ ان کی زبان سے ادا ہوا ہر لفظ اور سرزد ہونے والا ہر فعل من جانب اللہ ہوتا ہے۔ دین یا مذہب کیا ہے؟ کسی بھی نبی یا رسول کی زبان سے ادا ہونے والا لفظ یا سرزد ہونے والا فعل۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ Practical version ہے قرآن کا۔ آپ ﷺ کی گھریلو زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا اپنی ازواج کے ساتھ عفو و درگزر کا سلوک رہا۔ آپ ﷺ نے ہمیں بھی یہی رویہ اپنانے کی تلقین فرمائی لیکن ہم عموماً اس پر عمل نہیں کر پاتے۔ بیوی کی تند خوئی اور ترش روئی کے جواب میں ہم مسکرا کر جواب نہیں دیتے۔ ہم اپنی ضروریات پر بیوی کی ضروریات کو ترجیح نہیں دیتے۔ ہم اس کے احساسات کا خیال نہیں کرتے حالانکہ بیوی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اور اس کے احساسات و جذبات اور ضروریات کا خیال رکھنا عین سنت ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنے حق پر نظر رکھیں کہ ہماری لائف پارٹنر ہماری ملکیت ہیں ہم جیسے چاہیں اسے استعمال کریں ہم اس پر نظر رکھیں کہ آپ ﷺ کا اپنی ازواج کے ساتھ کیا سلوک تھا۔

یاد رکھیے! جو شخص رضاکارانہ طور پر اپنے حقوق چھوڑ دیتا ہے اور دوسروں کے حقوق کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے وہ اللہ کے ہاں سرخرو ٹھہرتا ہے۔ بلاشبہ روزِ حساب ہم سے سب سے پہلے نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا لیکن سب سے زیادہ مشکل مرحلہ وہ ہوگا جب ہم سے ہمارے فرائض کی ادائیگی کے بارے میں

دریافت کیا جائے گا کہ ہم نے اپنے پڑوسی، اپنے والدین، اپنے لائف پارٹنر اور باقی تمام لوگوں کے حقوق ادا کیے یا نہیں؟ اللہ کے ہاں Arguments شاید کام نہ کر پائیں۔ وہاں سرخرو ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے حقوق جو دوسروں کے ذمہ ہیں، وہ معاف کر دیں لیکن لوگوں کے جو حقوق ہم پر لازم ہیں وہ ادا کر دیں۔ یوں ہمارا یہ پہلو محفوظ ہو جائے گا۔

کسی نے ہمارے حقوق ادا کیے یا نہیں اس کے لیے وہ خود جواب دہ ہے ہمیں اس پر نہیں سوچنا۔ ہمیں تو بس اپنا فرض ادا کرتے جانا ہے۔ اگر ہم رُوحانیت کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنا یہ پہلو محفوظ کر لیں، اپنے ذمہ تمام حقوق ادا کرتے رہیں اور دل میں یہ دعا کرتے رہیں کہ بہتر ہے کہ لوگ ہمارے حقوق ادا نہ کریں تاکہ بروزِ قیامت کوئی چیز تو ہماری Due رہ جائے۔

حصولِ رُوحانیت کے لیے اپنی ذات کی نفی کرنا بہت ضروری ہے۔ رُوحانیت پر گفتگو ہمیں صرف اس وقت فائدہ دے گی جب ہم اپنی ذات کی نفی کرنا سیکھ لیں گے۔ جس طرح بھرا ہوا گلاس کسی بھی مائع کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بالکل اسی طرح ہماری ذات رُوحانیت کو اس وقت تک قبول نہیں کر سکتی جب تک ہم اپنی ذات کی نفی نہ کر دیں۔ خود اسلام کی ابتدا نفی سے ہے۔ جب کوئی شخص اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ طیبہ پڑھتا ہے تو اس کی ابتدا لا سے ہوتی ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ اگر ہمارے اندر ہماری انا کے بت اسی طرح قائم ہیں اور ہم انہیں دن بدن پالتے چلے جا رہے ہیں تو رُوحانیت کا حصول ممکن نہیں۔ رُوحانیت کا علم اپنے اندر کی سلیٹ پر لکھنے کے لیے ہمیں اپنے تمام Pre-conceived ideas کی Negation کرنا ہوگی۔ جب یہ ideas ہم Negate کر دیں گے تب اس سلیٹ پر رُوحانیت کی Prerequisites لکھی جائیں گی۔

لوحِ محفوظ پر سب سے پہلے لکھی جانے والی چیز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے پھر اس کے بعد کلمہ طیبہ لکھا ہے۔ اس کے بعد دیگر چیزیں تحریر ہیں۔ جب کہ رُوحانیت کی Clean slate پر جب ہم لکھنا شروع کریں گے تو اس پر سب سے پہلے یہ جملہ تحریر کریں گے:

''میں کچھ نہیں دوسرے سبھی کچھ ہیں۔''

''میں سب سے چھوٹا ہوں۔ دوسرے سب مجھ سے بڑے ہیں۔ میرا دوسروں پر کوئی حق نہیں۔ سب کا مجھ پر حق ہے''۔

جب تک ہم یہ جملے تحریر نہیں کرتے تب تک ہمارے قدم رُوحانیت کی طرف نہیں بڑھیں گے۔ انوار اسی صورت میں حاصل ہوں گے جب ہم ان بنیادی باتوں پر عمل کرنا سیکھ لیں گے۔ جس طرح اللہ کے تمام پیغمبر کسی سے دنیاوی تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ دنیاوی لحاظ سے وہ امی ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ اللہ کو ان پڑھ بندوں سے پیار ہے اس لیے وہ اپنے پیغمبروں کو امی رکھتا ہے۔ اللہ کو تو علم سے بہت پیار ہے لیکن وجہ یہ ہے کہ اگر پیغمبر کسی شخص سے علم حاصل کرتا ہے تو وہ شخص چونکہ ناقص علم رکھتا ہے، خطا کا پتلا ہے، محدود عقل کا

مالک ہے اس لیے جو علم وہ سکھائے گا، وہ بھی ناقص ہوگا اور کوئی پیغمبر جب ایسا ناقص علم اپنی اُمت کو پہنچائے گا تو اُمت کے لیے وہ غلطیاں دلیل بن جائیں گی۔ اس لیے رب تعالیٰ اپنے کسی رسول یا نبی کو دنیاوی تعلیم حاصل نہیں کرنے دیتا بلکہ انھیں اپنے فرشتے جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے خود علم سکھاتا ہے۔ اس لیے نبی یا رسول کا علم ہر قسم کی خامی اور نقص سے پاک ہوتا ہے۔ پیغمبر کا ہر لفظ اور فعل من جانب اللہ ہوتا ہے اور وہ لفظ اور فعل اُمت کے لیے دلیل بنتا ہے۔ وہاں بھی ذات کی Negation ہے کہ کسی بھی پیغمبر کا کوئی ارادہ، فعل اور خواہشات اُس کی اپنی نہیں بلکہ رب کے ارادوں کے ماتحت ہوتی ہیں۔

یہ ذات کی Negation ہی ہے کہ انسان اپنے تمام ارادوں، خواہشات اور ضروریات کو اللہ کے ارادوں کے تابع کر دے۔ جو کچھ قدرت کی طرف سے عطا ہو جائے اُسے ہنسی خوشی قبول کرلے۔ قبول تو ہمیں کرنا ہی ہے کیوں کہ ہم محتاج ہیں اللہ کے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم اُسے ہنسی خوشی قبول کرلیں۔

ہماری بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہم اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے رب کی حمد وثنا میں لگے رہتے ہیں اور کہتے ہیں "یا اللہ! تو قادرِ مطلق ہے، مرضی کا مالک ہے، جو چاہے کرتا ہے۔ کوئی تجھے مجبور کرنے والا نہیں ہے۔ تو بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا بہترین ہے لیکن تو بس ہماری مرضی پوری کر دے ہمیں شیخوپورہ ٹرانسفر کر دے۔"

ذرا سوچیے کہ اگر ہم واقعتاً رب تعالیٰ کو قادرِ مطلق جانتے اور مانتے ہیں، یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری بہتری زیادہ جانتا ہے۔ وہ ہماری والدہ سے 70 گنا زیادہ ہمیں چاہتا ہے اور اس کی طرف سے ہمیں صرف بھلائی آتی ہے تو بھر کوشش اور محنت کے بعد اللہ کی طرف سے جو نتیجہ ہمیں ملے ہم اُسے ہنسی خوشی قبول کرلیا کریں یہ سوچ کر کہ میرے رب نے میرے حق میں یقیناً بہتری کیا ہوگا۔ یقین جانیے وہ نتیجہ یقیناً ہمارے حق میں اچھا ہی ہوگا۔ چند سال گزر جانے کے بعد جب ہم تجزیہ کریں گے تو بے اختیار کہیں گے کہ ہاں اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ ہمارے بہترین مفاد میں تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے لیکن عجیب بات ہے کہ ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی کسی عامل اور کبھی صاحب دُعا کے پاس کہ ہماری فلاں مشکل حل ہو جائے اور کام ہو جائے۔ اگر ہمارا ایمان ہے کہ رب سب بہتر کرتا ہے۔ وہ ہماری والدہ کی نسبت 70 گنا زیادہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہر کام کا ایک وقت اس نے مقرر کر رکھا ہے تو پھر ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی طرف سے بھرپور طریقے سے محنت اور عملی کوشش کریں اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں سکھاتی ہوں گی کہ یہی روحانیت کی بنیاد ہیں۔

سوال: علامہ اقبال کا فلسفہ خودی کیا ہے؟

جواب: Self-esteem ہے خودی۔ جب ہم اپنی کسی ضرورت کے تحت یا مصلحت کی بنا پر کسی کے سامنے جھک جاتے ہیں یا ہاتھ پھیلاتے ہیں تو ہم اپنی Self-esteem کو مجروح کرتے ہیں۔ جب ہم کسی مصلحت یا مقصد کی خاطر اعلیٰ ترین اصولوں پر سمجھوتہ کرتے ہیں تو خودی کی نفی کرتے ہیں۔ اپنی ذات کی Negation

کر کے ہم خودی کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ ایک خوددار انسان کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ سفارش کے لیے نہیں جاتا۔ دوسروں کے سامنے اپنی کسی حاجت یا ضرورت کا اظہار نہیں کرتا۔ اپنی ذات کی نفی کر کے ہم خودی کا سبق سیکھ جاتے ہیں پھر ہمیں کسی کے سامنے جھکنا نہیں پڑتا۔ واقعہ کربلا کیا ہے؟

حضرت امام حسینؓ نے اپنے اُصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا، مصلحت سے کام نہیں لیا، باطل کو حق نہ کہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی بھی جان دے دی اور اہل خانہ کو بھی قربان کر دیا...... یہ ہے خودی۔

اگر وہاں خودی نہ ہوتی تو پھر اپنی ذات اور اہل خانہ کی محبت آڑے آتی لیکن وہاں تو اللہ کے قوانین مدنظر تھے۔

جب ہم اپنی ذات کی نفی کر دیتے ہیں تو خودی کو پا لیتے ہیں۔ وہاں ہماری Self-esteem بہت High ہوتی ہے اور فقیر خود بہت خوددار ہوا کرتے ہیں۔

نہریں علم کی

عرش کے اوپر کے حصہ میں بحر نور القاء ہے جس کا ایک کنارہ لوح محفوظ کے ساتھ ملتا ہے اور دوسرا کنارہ مقام محمود سے ملتا ہے۔ بنیادی طور پر نور کے اس سمندر میں سے 118 نہریں نکلتی ہیں جن میں سے چار کا تعلق علم الغیب والشہادۃ سے ہے جو کلیتاً رب تعالیٰ کے پاس ہے۔ ایک سو چودہ وہ علوم ہیں جو اللہ نے بندوں کو بھی عطا کیے ہیں۔ ان میں سے مزید ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ علوم کی نہریں نکلتی ہیں جن میں سے اٹھارہ ہزار علوم آج کے انسان پر وا ہوئے ہیں۔ ریسرچ اور غور و فکر کے ذریعے وہ مزید علوم پر دسترس حاصل کر رہا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ نشستوں میں ذکر ہو چکا کہ حال ہی میں دریافت ہونے والی کئی سال قدیم مصری تہذیب سائنس میں ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ انھوں نے پچاس ہزار علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی اور اس کے بعد وہ لوگ اتنے منہ زور ہو گئے کہ رب تعالیٰ نے انھیں ختم کر دیا۔

جب آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو مقام محمود پر بیٹھ کر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کیا تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو نور القاء جو رب تعالیٰ کا نور ہے، سے غسل دیا گیا تھا اور ملاقات کے بعد آپ ﷺ پر جو کچھ منکشف کیا گیا تھا اس کا سکرپٹ حروف مقطعات کی شکل میں آپ ﷺ کو عطا کر دیا گیا تھا۔ یہ حروف مقطعات دراصل وہ مخفی اسرار ہیں جنھیں اسرار باطنی میں بھی مخفی رکھا جاتا ہے کیوں کہ علوم کی وہ شاخیں جو بحر نور القاء سے نکلتی ہیں ان میں سے چار علم الغیب والشہادۃ سے تعلق رکھتی ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں جب کہ باقی 114 علوم کی جو شاخیں ہیں۔ وہ علوم اتنے طاقت ور ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طاقت کا بھرم رکھتے ہوئے بڑے سے بڑے کام اور بڑی سے بڑی مشکل کو سیکنڈز میں حل فرما دیتا ہے۔ روحانیت میں اس دورانیہ کا تعین 70 سیکنڈز کیا گیا ہے۔ (لیکن بہتر ہے کہ دورانیہ کا تعین نہ کیا جائے کیوں کہ بعض اوقات یہ بات دعویٰ میں چلی جاتی ہے اور اللہ دعویٰ دار کو جھوٹا کر دیتا ہے۔)

اسم اعظم بھی علم الغیب والشہادۃ کا حصہ ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ اسم اعظم کی کرید میں پڑے رہتے ہیں۔ علم الغیب والشہادۃ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اسم اعظم کا کبھی اظہار نہیں ہوتا اور جن لوگوں

کے علم میں یہ آیا بھی ہے وہ بھی الفاظ میں لپٹا ہوا اسم ہے۔ (محض مثال کے طور پر یہ عرض کر رہا ہوں ورنہ اس میں اسم اعظم ہرگز نہیں ہے) فرض کریں اگر آیت کریمہ میں اسم اعظم ہوتا تو صاحب علم اُسے پوری آیت کے طور پر جانتا ہوتا اور وہ کہتا کہ آپ یہ آیت کریمہ پڑھ لیا کیجیے۔

یاد رکھیے اسم اعظم ہمیشہ الفاظ میں لپٹا ہوا علم میں آتا ہے۔ اکیلے لفظ کی صورت میں کسی کے علم میں بھی نہیں آتا اور اس قدر چھپا ہونے کے باوجود اس کے اظہار کی اجازت نہیں ہوتی۔ آپ حضرات کو چونکہ اکثر اسم اعظم کی کرید رہتی ہے اس لیے یہ سب عرض کر رہا ہوں کہ آپ بلاوجہ اپنا وقت ضائع نہ کیجیے۔ کوئی آدمی اسم اعظم کا آپ کے سامنے اظہار نہیں کرے گا۔ یوں یہ ہمیشہ الفاظ میں لپٹا ہوا ہی علم میں آتا ہے۔ خود وہ لفظ Directly کسی کے علم میں نہیں آتا۔ عموماً یہ تین الفاظ میں ملفوف ہوتا ہے اور بتا دیا جاتا ہے کہ یہ اسم اعظم ہے۔ علم الغیب والشہادۃ کا حصہ ہونے کی وجہ سے اسم اعظم اتنا چھپا ہوا ہے اور ظاہر نہیں ہوتا۔

یہ ذکر بھی گزشتہ نشستوں میں ہو چکا کہ حروف مقطعات کی کل تعداد 14 ہے اور 29 سورتیں ان حروف سے شروع ہوتی ہیں۔ یہ ایسی خاص چیز ہے جس کی ترتیب خود رب تعالیٰ نے بنائی ہے۔ اسم اعظم کی طرح حروف مقطعات کا مفہوم بھی واضح نہیں کیا جاتا۔ اب یہ جو ایک سو اٹھارہ علوم نکلے بحر نور القضاء سے جن میں سے چار علم الغیب والشہادۃ کا حصہ ہوئے اور ایک سو چودہ باقی رہ گئے۔ 29 سورتوں میں استعمال ہونے والے 14 حروف مقطعات بلاوجہ نہیں ہیں۔ بحر نور القضاء سے نکلنے والے 118 علوم کو اگر واحد ہندسہ میں لے جائیں تو یہ ایک بنتا ہے۔ یہ اللہ کی وحدانیت کو ظاہر کرتا ہے۔ باقی علوم کی 114 شاخوں کو جمع کر کے واحد ہندسہ (Single Digit) میں لے جائیں تو 6 کا عدد سامنے آئے گا۔ چھ کا ہندسہ روحانیت میں اُن چھ دنوں کو ظاہر کرتا ہے جن میں کائنات وجود میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ 114 علوم کائنات پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ حروف مقطعات سے شروع ہونے والی 29 سورتوں کے ہندسوں کو جب ہم جمع کرتے ہیں تو دو جمع نو برابر گیارہ (2+9=11) آئے گا۔ علم جفر میں تو یہ ایک جمع ایک برابر دو (1+1=2) بن جائے گا لیکن روحانیت میں ایک جمع ایک برابر دو نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ہی رہتا ہے کیوں کہ ایک (1) کا تعلق اللہ کی وحدانیت سے ہے۔ یہ یکتائی کو ظاہر کرتا ہے۔ دو سے دوئی آ جائے گی۔ یوں 29 کا جمع 11 بنے گا جن میں سے ایک (1) کا مطلب بنانے والا یعنی اللہ تعالیٰ اور دوسرے ہندسہ ایک (1) کا مطلب بننے والا یعنی آپ ﷺ ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ چاہا کہ وہ کوئی ایسی تخلیق کرے جس سے اُس کی ذات کا اظہار ہو تو اللہ تعالیٰ نے جو روح سب سے پہلے تخلیق کی وہ آپ ﷺ کی تھی۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا گیا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک بننے والا اور ایک بنانے والا تو بننے والے سے مراد آپ ﷺ ہیں کیوں کہ سب سے پہلے آپ ﷺ کی روح کی تخلیق ہوئی یہی اس میں سب سے بنیادی نکتہ ہے۔

CD کیسے سنیں

نشست نمبر		لیکچرز نمبر اور تاریخ
1	رہنا ہے ہر حال میں راضی	33 (31.12.06)
2	مقام بندگی و شکر گزاری	34 (07-01-07)
3	نماز اور میڈیکل سائنس	35 (21.01.07)
4	معرفتِ حقیقت	36 (28.01.07)
5	فقر کے آداب اور اسم اعظم	37 (04.02.07)
6	تصوف کے بنیادی پروٹوکولز	38 (11.02.07)
7	راہِ سلوک میں گائیڈ کی اہمیت	39 (25.02.07)
8	باادب.....بانصیب	40 (04.03.07)
9	تسمیہ	41 (11.03.07)
10	تقدیر یا تدبیر	42 (18.03.07)
11	روحانیت اور رویے	43 (25.03.07)
12	رزقِ حلال اور سودی معاملات	44 (08.04.07)
13	ولی اللہ کون!	45 (15.04.07)
14	دنیا اور روحانیت	46 (22.04.07)
15	وظیفہ تسمیہ کی مزید وضاحت	47 (06.05.07)
16	عالم روحہ	48 (20.05.07)

نوٹ: نشست نمبر 38 اور 41 کے لیکچرز ریکارڈ شدہ DVD میں موجود نہیں ہیں۔

کچھ صاحب کتاب بارے



جناب سرفراز اے شاہ صاحب 12 جون 1944ء کو جالندھر کے ایک نجیب الطرفین سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل ہیں اور مختلف سرکاری اداروں میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ آپ کچھ عرصہ ہمدرد یونیورسٹی میں Management کے موضوع پر بطور Visiting Faculty لیکچرز بھی دے چکے ہیں۔ مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن میں وسیع تجربہ کے حامل شاہ صاحب ان دنوں پاکستان کے ایک معروف صنعتی وتجارتی گروپ سے وابستہ ہیں۔ آپ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں 65 سے زائد ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔

آپ دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی وروحانی تعلیمات میں بھی دیرینہ دلچسپی رکھتے ہیں اس کے علاوہ قدیم اور جدید علوم پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔ پروفیشنل لائف کے ساتھ ساتھ آپ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کی صحبت سے لاکھوں لوگ مستفیض ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو توکل، اطمینان اور یقین کی دولت سے بے حساب نوازا ہے جسے آپ اپنے دوستوں میں کھلے دل سے بانٹتے رہتے ہیں۔ خوش کلام اتنے کہ دھیمے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں جب گفتگو کرتے ہیں تو گویا وقت کی گردش تھم جاتی ہے۔ اُس ذات اقدس کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ کے لہجے میں ایسی محبت، جذبہ اور ایمان ہوتا ہے جو سامعین کے دلوں میں رب تعالیٰ کی محبت، قرب اور دوستی کے حصول کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔